مقالاتِ اصلاحی

جلد دوم

مقالاتِ اصلاحی

جلد دوم

المورد
لائبریری
داخلہ نمبر 18817

تالیف:

امین احسن اصلاحی

ترتیب:

خالد مسعود

فاران فاؤنڈیشن
لاہور — پاکستان

سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۰

جملہ حقوق محفوظ

ناشر: ——— حسن خاور
مطبع: ——— مکتبہ جدید پریس
اشاعت: ——— طبع اوّل - پانچ سو
تاریخ اشاعت: ——— مارچ 2004 محرم الحرام 1424ھ
ادارہ: ——— **فاران فاؤنڈیشن**
122 فیروز پور روڈ۔ اچھرہ۔ لاہور۔
فون: 042-7595200
ای میل: faran@wol.net.pk
قیمت: ——— =/250 روپے

فہرس

دیباچہ ۱۱

حصہ اوّل: **مضامین**

مقالہ ۱ اسلامی معاشرہ کا سب سے بڑا آدمی ۱۷
پاکیزگیٔ فطرت ۱۹
صالحین پر اثر ۲۰
اخلاقی جرأت ۲۰
مظلوموں کی حمایت کے لیے انفاق ۲۱
آنحضرت ﷺ کے لیے جاں نثاریاں ۲۲
نرمی اور سختی کا بہترین امتزاج ۲۳
دوررَسی ۲۴
اللہ، رسول ﷺ اور مسلمانوں کی نظر میں یکساں محبوبیت ۲۵
ضبط و تمکین ۲۶
سیاست و تدبر ۲۸
پیغمبر ﷺ کی جانشینی کی اہلیت ۳۱
حکمرانی کی قابلیت ۳۳
حضرت ابوبکرؓ کی داخلی اور خارجی پالیسی ۳۹

مقالہ ۲ نظم قرآن ۵۳

فہرس

دیباچہ ۱۱

حصہ اول: اسوۂ حسنہ ۱۵

نبی صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ایک مدبر اور ماہر سیاست ۱۷
نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں ۲۶
اہل بیت کے مشاغل ۲۸
آزادانہ انتخاب ۳۰
محبت' اعتماد اور خودداری ۳۳
محاسبہ ۳۷
عہد صحابہؓ کے سب سے کم سن مفسر قرآن ۴۰
قوم کی طرف سے اعزاز ۴۷
جلاوطنی اور وفات ۴۹

حصہ دوم: جماعت اسلامی سے علیٰحدگی کی بنیادیں ۵۱

جائزہ کمیٹی سے استعفا طلبی ۵۳

دنیا میں انسان کی حیثیت ۲۹۴

ابنِ آدم کا شاطر دشمن ۲۹۶

فطرت کے تازیانے ۲۹۹

مقالہ ۲۸ پاکستان میں دینی تعلیم کا حال و مستقبل
اور ہماری ذمہ داری ۳۰۲

مقالہ ۲۹ علم اور ذرائع علم ۳۱۴

مقالہ ۳۰ آزادی کے اسلامی تقاضے ۳۱۹

آزادی اور غلامی کا اسلامی اور غیر اسلامی مفہوم ۳۲۰

پاکستان کا مفہوم اور اس کے تقاضے ۳۲۳

پاکستان کے لیے عظیم قربانی کا مقصد ۳۲۶

مستقبل کا نظامِ زندگی ۳۲۹

پہلی بنیادی بات ۳۳۱

اسلام زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے ۳۳۴

حکومت کیسے مسلمان بنتی ہے ۳۳۶

بعض عذرات اور ان کا جواب ۳۳۸

خطرات کے عذر کا جواب ۳۳۹

اصل قوت اسلام ہے ۳۴۱

امامتِ اقوام کا منصب ۳۴۲

ہندوؤں کی مذہبی حکومت کا ہوّا ۳۴۳

غیر مسلموں کے حقوق ۳۴۴

علماء اور مشائخ سے گذارش ۳۴۵

گروہی تعصبات کو خیر باد کہیے ۳۴۶

صوفیاء و مشائخ کے کارنامے ۳۴۷

یہ فیصلہ کن وقت ہے ۳۴۸

مقالہ ۳۱ تنظیمِ اسلامی کی قرارداد ۳۴۹

مقالہ ۳۲ تنظیمِ اسلامی کے لیے ہدایات ۳۶۱

مقالہ ۳۳ مسلمان نوجوانوں کے فرائض ۳۶۵

صحتِ جسمانی ۳۶۹

صحتِ عقلی ۳۷۳

ایمانی و اخلاقی صحت ۳۷۵

حصہ ششم: شخصیات

مقالہ ۳۴ ابو صالح اصلاحیؒ -۱ ۳۸۱

مقالہ ۳۵ ابو صالح اصلاحیؒ -۲ ۳۸۹

مقالہ ۳۶ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ ۳۹۴

مقالہ ۳۷ مولانا محمد علی جوہرؒ ۳۹۷

مقالہ ۳۸ علامہ اقبالؒ ۴۰۲

مقالہ ۳۹ مولانا ابوالکلام آزادؒ ۴۰۸

مقالہ ۴۰ حاجی رشید الدین انصاریؒ ۴۱۱

مقالہ ۴۱ مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ۴۱۴

مقالہ ۴۲ مولانا محمد یوسفؒ ۴۱۶

مقالہ ۴۳ مولانا احمد علی لاہوریؒ، حمید نظامیؒ ۴۱۹

مقالہ ۴۴ مولوی تمیز الدین خانؒ ۴۲۲

مقالہ ۴۵ علامہ عنایت اللہ مشرقیؒ ۴۲۴

مقالہ ۴۶ حسین شہید سہروردیؒ، مولانا داؤد غزنویؒ ۴۲۶

مقالہ ۴۷ پنڈت جواہر لال نہرو ۴۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

گلہائے رنگارنگ کا یہ دوسرا مجموعہ جید عالم دین اور نامور مفسرِ قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے قدردانوں کے ہاتھوں میں دیا جارہا ہے۔ قبل ازیں مقالات اصلاحی کے عنوان سے پہلا مجموعہ 1991ء میں پیش کیا گیا تھا اب یہ دوسرا حصہ پیش کیا جارہا ہے۔ مولانا کے یہ مضامین اور مقالات مختلف رسائل و جرائد خاص طور پر ماہنامہ 'الاصلاح' اعظم گڑھ، ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ اور ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں شائع ہو چکے ہیں ان کے علاوہ مولانا کی بعض تقاریر اور خطبات بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان مضامین کو زمانی ترتیب کی بجائے چھ عنوانات مضامین، انٹرویو، آئین و قانون، سیاسیات، خطبات اور شخصیات کے تحت درج کیا گیا ہے تاکہ تفہیم میں آسانی ہو اور مولانا کا نقطہ نظر آسانی سے سمجھ میں آسکے۔

ان تحریروں میں مولانا کی علمی وجاہت، ان کے قلم کی سطوت وجلالت، ان کی مومنانہ بصیرت، ملک وملت کے سیاسی، تمدنی اور قانونی معاملات میں ان کے موعظت کے پیچھے گہری حکمت پائی جاتی ہے۔ ان مضامین کو لکھے ہوئے اگرچہ نصف صدی سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن اب بھی یہ ہماری زندگیوں سے غیر متعلق نہیں ہوئے ایسا کیونکر ہو سکتا تھا جبکہ ان کا منہاج ایک ہی ہے کہ انسان نہ تو ارسطو کے بقول حیوان ناطق ہے اور نہ ہی ڈارون کی تحقیق کے مطابق ترقی یافتہ حیوان ہے بلکہ وہ اپنے اندر نور یزدانی رکھتا ہے جو اسکے خالق نے اس کے اندر پھونک دیا ہے۔ انسان کو کچھ قوتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں جن کا وہ مالک نہیں بلکہ امین ہے اس لیے وہ ان کا مسئول ہے۔ مولانا کے نزدیک جو انسان اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کی

نعتوں کو عقل کے بجائے بطن وفرج کی خدمت میں لگا دیتے ہیں وہ شمشیر جوہر دار سے گھاس کاٹنے کا کام لیتے ہیں۔ مولانا نے خدا کے وجود کو محض اس لیے قبول نہیں کیا کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے بلکہ وہ گہرے غور وفکر اور قرآن کے گہرے مطالعہ کے بعد، خدا کے وجود کے قائل ہوئے۔ اس مسئلہ پر مولانا اصلاحیؒ نے اپنے مقالہ معرفت حق اور اس کے تقاضے میں بحث کی ہے۔

ان تحریروں میں آپ کو گہرا طنز بھی ملے گا لیکن اسکے پیچھے جھانک کر دیکھیے تو گہری حکمت نظر آئے گی۔ کہیں کہیں تیغ وسناں کی تیزی نظر آئے گی جو جھوٹے حقائق پر خوشنما ملمع کو اتارنے کے لیے ہے۔ ان مضامین میں آپ کو شبنم کی ٹھنڈک اور بجلی کی کڑک بھی محسوس ہوگی۔ ان تمام تحریروں میں زبان وبیان کی چاشنی اور دلائل کی قوت وحرارت بھی محسوس ہوگی جو مولانا کی تحریر کا منفرد اسلوب ہے۔

اس مجموعہ کا پہلا مضمون حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سیرت پر ہے مولانا نے بتایا ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ کے سب سے بڑے آدمی ہیں جس پر کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ مولانا نے اس کی وجوہ پر روشنی ڈالی ہے۔ سیرت صدیق اکبرؓ پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں مشکل ہی سے اس سوال کا جواب ملے گا کہ وہ کیوں سب سے بڑے آدمی ہیں۔ مولانا اصلاحیؒ کا ایک انٹرویو بھی اس میں شامل ہے جس میں انھوں نے جماعت اسلامی سے وصل وفصل کی داستان بیان کی ہے انھوں نے بتایا کہ دعوت دین کسی قسم کی تحریک نہیں ہوتی اور حضور ﷺ تحریک اسلامی کے لیڈر نہیں بلکہ خاتم الانبیاء ہیں۔ عرب ممالک میں آئے دن کے خونیں انقلاب کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا نے اس کی تین وجوہ بیان کی ہیں۔ اول عوام میں حقوق کی شدت سے بیداری دوم جمہوریت کی طلب سوم بیرونی مداخلت۔ انہوں نے کہا کہ اگر عوام میں جمہوریت چلانے کی صلاحیت نہیں ہے تو انہیں آمریت کی تلخیاں گوارا کرنا پڑیں گی۔ اگر آپ غور کریں تو پاکستان کے حالات اس سے مختلف نہیں ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ اب حقوق کا معاشرہ بن چکا ہے اس میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا قطعاً احساس نہیں ہے حالانکہ بنیادی حقوق کو چھوڑ کر دوسرے تمام حقوق فرائض کی ادائیگی کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ عوام جمہوریت چلانے کی جتنی صلاحیت رکھتے ہیں ان کا کئی مرتبہ تجربہ ہو چکا ہے اس لیے آمریت کی

تلخیاں برداشت کرنا پڑ رہی ہیں اور بیرونی مداخلت تو اب کھلی حقیقت ہے۔

صدر ایوب خاں اور محترمہ فاطمہ جناح کے درمیان صدارتی انتخاب میں مقابلہ کے موقع پر مولانا نے ماہنامہ 'میثاق' میں ارکان بنیادی جمہوریت سے گزارش، کے عنوان سے جو اداریہ لکھا تھا اس کی سارے ملک میں دھوم مچ گئی تھی اور بہت سے اپنے بھی خفا ہو گئے تھے اس میں مولانا نے بتایا ہے کہ اسلام کیوں عورت کی حکمرانی کے خلاف ہے۔ انہوں نے بتایا کہ زنانہ حکومت کا مزاج منفعلانہ (Passive) ہوتا ہے جبکہ حکومت کا مزاج فاعلانہ (Active) ہونا چاہیے۔ اس لیے حکومت کا سربراہ مرد ہونا چاہیے۔ 1965ء میں بھارت نے پاکستان پر اچانک حملہ کر دیا تھا اس موقع پر مولانا نے ہندو پاک جنگ کے سبق کے عنوان سے جو اداریہ تحریر کیا جس میں انھوں نے بتایا کہ اچھی حکومت کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک قوت اور دوسرا عدل، قوت کا منبع سچا، اور پکا ایمان ہے اور عدل کا منبع خدا کی شریعت ہے۔ مولانا نے مختلف مواقع پر طلباء سے خطاب کیا انہیں تلقین کی کہ وہ اپنے آپ کو جسمانی، عقلی اور ایمانی واخلاقی اعتبار سے صحت مند اور تندرست بنائیں۔ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں بلکہ عملی اور نظری سیاست کا مطالعہ کریں اور اپنے آپ کو ملک کی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے تیار کریں۔ انھوں نے بھوک ہڑتال کو غیر اسلامی قرار دیا اور سیاسی جماعتوں کو مشورہ دیا کہ وہ طلبا کو آلہ کار بنانے سے اجتناب کریں۔

اس مجموعہ میں مولانا کی شام ہمدرد میں ایک تقریر پاکستان میں دینی تعلیم کا حال، مستقبل، اور ہماری ذمہ داریوں کے عنوان سے شامل ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ جدید نظام تعلیم انگریزوں کا تحفہ ہے جس کا مقصد خود شناسی نہیں بلکہ انگریز شناسی ہے۔ انہوں نے کہا کہ دینی مدارس جمود کا شکار ہیں اور کئی سو سال پہلے کے نصاب کو تقدیس کا درجہ دے دیا گیا ہے اس نصاب کو آسان، مختصر اور زمانہ حال کی ضروریات کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے۔

آخری حصہ میں مختلف سیاسی اور دینی شخصیات پر مقالے شامل ہیں۔ بیشتر مقالے ان کے انتقال پر 'میثاق' میں لکھے گئے ان میں مولانا محمد علی جوہرؒ، پنڈت جواہر لال نہرو، کی شخصیات پر بھی شامل ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ پر جو گھٹیا اعتراضات کیے گئے تھے ان کا مولانا نے مسکت جواب دیا ہے۔ ایک انتہائی پردرد مقالہ مولانا نے اپنے بڑے بیٹے اور نامور صحافی ابوصالح اصلاحی

کی 1963ء میں پی آئی اے کی قاہرہ کی افتتاحی پرواز کے حادثہ میں موت پر لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اپنے نوجوان بیٹے کی ناموری اور زندگی کی جدوجہد میں کامیابی پر بہت خوش تھے لیکن انہیں اس بات پر بڑی تشویش تھی کہ ان کامیابیوں کا نشہ کہیں اسے آخرت سے غافل نہ کردے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو اپنی اولاد کو صرف دنیاوی کامیابی کے لیے ہی تیار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے اندر آخرت کی فکر بھی پیدا کرنی چاہیے۔

علامہ اقبالؒ کی وفات پر مئی 1938ء کے ماہنامہ 'الاصلاح' میں شذرہ میں انہیں نہایت ہی شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال نے ہمارے ادبار اور بدبختی کے دور میں مسلمانوں کی رہنمائی اور قیادت کے فرائض انجام دیے "وہ پہاڑی کا چراغ بن کر آئے" ابتدا میں ان کے افکار اور خیالات بے گانہ تھے لیکن وہ وقت کی فاتحیت کا تاج پہن کر آئے تھے اس لیے جلد ہی ان کی باتیں اتنی محبوب اور مانوس ہوگئیں کہ ہر بزم و انجمن کا افسانہ بن گئیں۔ اقبال کی سطوت اور جلالت کا کون اندازہ کرسکتا ہے وہ زمانہ سے جنگ کرتے آئے تھے۔ مولانا نے لکھا کہ اقبال کی دنیا ہی الگ تھی جب سب شفاخانہ حجاز میں زندگی ڈھونڈ رہے تھے تو وہ ریگستان حجاز میں موت ڈھونڈ رہا تھا۔ مولانا نے کہا کہ اقبال جب بات کہہ دیتے تو کوئی نہیں جوان سے دلیل مانگے۔ یہ بات طے ہے کہ سچائی اگر سچے کی زبان سے نکلے تو وہ اپنی حمایت کے لیے منطق کی محتاج نہیں ہوتی۔

والسلام	لاہور
محبوب سبحانی	6 فروری 2004ء

۱

مضامین

اسلامی معاشرہ کا سب سے بڑا آدمی

یہ بات ہم مسلمانوں میں کچھ متفق علیہ سی چلی آرہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت وتبلیغ اور اصلاحی کوششوں سے جو اسلامی معاشرہ وجود میں آیا اس کے سب سے بڑے آدمی، آنحضرت ﷺ کے بعد، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوئے۔ ان کی یہ بڑائی آنحضرت ﷺ کی زندگی میں بھی تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلم رہی اور آپ کی وفات کے بعد بھی مسلم رہی۔ اس چیز میں نہ کبھی کسی نے اختلاف کیا اور نہ اس میں کسی اختلاف ہی کی گنجائش تھی۔ لیکن ان کی بڑائی پر پوری امت کے اس اتفاق عام کے باوجود شاید بہت تھوڑے ہی لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑے آدمی کیوں قرار پائے اور ان کے وہ کیا اوصاف وفضائل ہیں جن کی وجہ سے تمام مسلمانوں کی نگاہیں آنحضرت ﷺ کی زندگی میں بھی ان کی طرف اٹھتی رہیں اور آنحضرت ﷺ کے بعد بھی انہی کی طرف اٹھیں۔ یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ عرب میں اسلام سے پہلے جو چیزیں بڑائی کا معیار سمجھی جاتی تھیں ان میں سے کسی چیز میں بھی حضرت ابوبکرؓ کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں تھا۔ وہ قریش کے معزز قبیلہ سے ضرور تھے، لیکن جاہلیت میں قریش کی دوسری شاخوں کو جو جلیل القدر عہدے اور مناصب حاصل رہے اس طرح کے جلیل القدر عہدے حضرت ابوبکرؓ کے قبیلہ تیم کو حاصل نہیں ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک کامیاب تاجر ہونے کی وجہ سے مالی اعتبار سے بالکل مطمئن تھے،

لیکن قریش میں —— اور مسلمانوں میں بھی —— ان سے کہیں زیادہ مالدار اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ ان کی قوم کے اندر ان کو اعتماد اور عزت کی جگہ ضرور حاصل تھی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قریش کے نظام جاہلی میں عزت و سرفرازی کی جو جگہ دوسروں کو حاصل تھی وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ یا ان کے خاندان اور قبیلہ کو حاصل نہیں تھی۔ خطابت، شاعری، کہانت، اور لیڈرانہ جوڑ توڑ کے بھی وہ مرد میدان نہیں تھے کہ ان چیزوں کے لیے ان کی قوم کے دلوں میں جو احترام تھا اس کے سہارے ہی وہ لوگوں کی نگاہوں میں عزت و احترام حاصل کر سکتے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کی وہ کیا خدمات اور خوبیاں تھیں جن کے سبب سے تاریخ انسانی کے سب سے زیادہ پاکیزہ معاشرے نے ان کو اپنا لیڈر بنایا اور اپنے دین اور دنیا کے ہر معاملہ میں ان کی رہنمائی پر پورا پورا بھروسا کیا؟ اس سوال کا جواب یوں تو ہر مسلمان کے لیے اہمیت رکھتا ہے، لیکن خاص طور پر ان لوگوں کے لیے اس سوال کے جواب کی بڑی ضرورت ہے جو آج مسلمانوں کی قوم کو اسلامی معاشرے کی اصلی خصوصیات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں اور اس بات کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں کہ مسلمان اپنے لیڈروں کی جانچ پرکھ میں انھی معیارات اور کسوٹیوں سے کام لیں جو اسلام نے ان کو دی ہیں۔ اور جن سے کام لینے کا نتیجہ ایک زمانے میں یہ نکل چکا ہے کہ مسلمانوں کو ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسے لیڈر نصیب ہوئے ہیں۔

میں آگے کی سطور میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا اور بالاجمال یہ بتاؤں گا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وہ کیا خوبیاں اور کیا خدمات ہیں جن کے سبب سے ایک صحیح اسلامی معاشرے میں ان کو قیادت کا اتنا اونچا مقام حاصل ہوا کہ حضرت عمر فاروقؓ بھی اس کی بلندی سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے نہایت حسرت کے ساتھ یہ فرمایا کہ 'لقد اتعبت الخلفاء بعدک.' اگر معیار یہ ہے جو آپ نے اپنی خدمات اور اپنی خوبیوں سے قائم کر دیا ہے تو آپ کے جانشینوں میں سے کون آپ کی ہمسری کی ہمت کر سکے گا!

پاکیزگیٔ فطرت

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو حضرت ابوبکرؓ کی سیرت پر غور کرنے والے کے سامنے آتی ہے وہ ان کے قلب کی صفائی اور فطرت کی پاکیزگی ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ اُدھر آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے اپنی نبوت کا اظہار کیا اِدھر انہوں نے فوراً بغیر کسی تردد اور بغیر کسی جھجک کے اس کی تصدیق کی۔ وہ قوم کے ایک معزز آدمی تھے، اور ایک معزز آدمی کے لیے جو اپنی قوم کا لیڈر بھی ہو کسی دوسرے کی لیڈری تسلیم کرنے میں بڑی زحمتیں پیش آیا کرتی ہیں، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس طرح کی کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیڈر ہونے کے باوجود لیڈری کے پندار سے ان کا دل بالکل پاک تھا۔ یہ معلوم ہے کہ وہ ایک نکتہ چیں آدمی تھے۔ ان کی جاہلیت کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ وہ کسی بات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ماننے والے نہ تھے اس وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ انہوں نے اسلام کو اور آنحضرت ﷺ کو یونہی مقلدانہ مان لیا ہو۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اپنی غیر معمولی صفائیٔ قلب اور سلامتیٔ فطرت کے سبب سے ان کا دل پہلے سے آنحضرت ﷺ کی سچائی اور ان باتوں کی حقانیت پر گواہ تھا جن کی آنحضرت ﷺ دعوت دے رہے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے اسلام کو بالکل اپنے دل کی آواز سمجھ کر قبول کیا۔ جس شخص کی جاہلیت کی زندگی کے متعلق ابن الدغنہ کی یہ شہادت ہو کہ 'تم اعزہ پروری کرتے ہو، سچ بولتے ہو، حاجت مند کی حاجت برآری کرتے ہو، گردشِ روزگار کے مارے ہوؤں کی مدد کرتے ہو۔' آخر اس شخص کے دل پر کیا زنگ ہو سکتا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی تصدیق اور اسلام کو قبول کرنے میں دیر لگاتا۔ اس طرح کے پاکیزہ اور صاف قلوب کے لیے پیغمبر کی آواز اور اس کا چہرہ معجزہ ہوتا ہے اور وہ حق کو سنتے ہی اس کو قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی اس خصوصیت کی ان الفاظ میں شہادت دی: 'میں نے جس کسی کو بھی اسلام کی دعوت دی اس کو

اس میں کچھ نہ کچھ جھجک اور فکر و تردد کی حالت ضرور پیش آئی، بجز ابوبکر بن ابی قحافہ کے میں نے ان کے سامنے جس وقت اس بات کا ذکر کیا تو نہ اس کے قبول کرنے میں ان کو کوئی رکاوٹ پیش آئی اور نہ وہ اس معاملہ میں ذرا متردد ہوئے۔"

صالحین پر اثر

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی اس پاکیزگیٔ فطرت کی وجہ سے بہت سے پاکیزہ فطرت اور صالح لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر رکھا تھا، جو ان کی طبیعت کی خوبیوں کی وجہ سے ان کے گرویدہ تھے اور زندگی کے معاملات میں ان کے فیصلوں پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ ان لوگوں نے جب دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کر لیا تو اپنے ایسے صائب الرائے ساتھی اور رہنما کے فیصلے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس گروہ کے اندر عثمان بن عفان، عبدالرحمان بن عوف، طلحہ بن عبیداللہ، سعد بن ابی وقاص، اور ابوعبیدہ بن جراح (رضی اللہ عنہم) جیسے بڑے بڑے لوگ تھے، جن کے ہاتھوں اسلام کی بڑی خدمتیں انجام پائیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسلام نے ان سب لوگوں کے لیے اسلام کا راستہ کھول دیا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان لوگوں کا اسلام لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ان میں سے ایک ایک شخص، اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کے لحاظ سے، اسلام کی دولت تھا۔ اور اس شخص کی عظمت اور بڑائی میں بھی شک نہیں کیا جا سکتا جو اس قسم کے لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کا سبب تھا۔

اخلاقی جرأت

اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور دین حق کا بول بالا کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اخلاقی جرأت بھی ایک بے مثال چیز ہے۔ یہ معلوم ہے کہ وہ اپنی قوم کے ایک معزز لیڈر بھی تھے اور ایک کامیاب تاجر بھی۔ ایک لیڈر کے لیے اول تو یہی مشکل ہے کہ وہ کسی دوسرے لیڈر کی لیڈری تسلیم کر کے اپنی لیڈری خطرے میں ڈالے۔ ثانیاً اگر وہ ایک کامیاب تاجر بھی

ہو تب تو اس کے لیے تقریباً یہ محال ہے کہ وہ کسی ایسی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جو ان تمام حلقوں میں اس کو مطعون بنا دے جن سے اس کا تجارتی مفاد وابستہ ہو۔ کوئی عام تاجر تو کبھی اس طرح کی جرأت کر ہی نہیں سکتا۔ اور اگر کوئی تاجر اپنے اخلاقی اوصاف میں عام سطح سے بہت زیادہ بلند ہو گا تو اس سے بھی زیادہ سے زیادہ جس اخلاقی جرأت کی توقع کی جا سکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ اگر وہ کسی تحریک کو حق سمجھتا ہے تو اس کو دل سے قبول کر لے اور خاموشی کے ساتھ جس حد تک اس کے امکان میں ہو اس کی مالی مدد کرتا رہے۔ رہی یہ بات کہ وہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا سارا زور و اثر اور اپنی ساری تجارت قربان کر دے تو یہ ایک بہت بڑا مرتبہ ہے، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی جیسے شخص کو حاصل ہو سکتا تھا اور کمال [illegible] یہ مرتبہ انہی کو حاصل ہوا۔ ان کے بعد جن بلند ہمت لوگوں کو بھی اس راہ میں کوئی قدم بڑھانے کی توفیق حاصل ہوئی ہے صدیق اکبرؓ کے عملی نمونہ ہی نے درحقیقت ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

مظلوموں کی حمایت کے لیے انفاق

اسلام کے ابتدائی دور کی صبر آزما آزمائشوں میں راہِ حق کے مظلوموں کو دعوتِ حق کے دشمنوں کے چنگل سے چھڑانے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مال نے جو کام کیا ہے اس کی مثال بھی مشکل سے مل سکے گی۔ بلالؓ اور ابن فہیرہؓ جیسے لوگ جو غلاموں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ہر قسم کی حمایت سے محروم ہونے کی وجہ سے اسلام لانے کے جرم میں اپنے آقاؤں کے ہاتھوں نہایت درد انگیز مظالم کے شکار ہو رہے تھے، صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان مظلوموں کو ان کے ظالم آقاؤں کے پنجے سے بھاری بھاری قیمتوں، بلکہ منہ مانگے داموں، پر خرید کر آزاد کیا اور اس کام میں جس فیاضی کے ساتھ انہوں نے اپنی دولت خرچ کی اس کا اندازہ صرف ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام لائے ان کے پاس چالیس ہزار درہم نقد موجود تھے، لیکن دس سال کے بعد جب انہوں نے مدینہ کو ہجرت کی ہے تو ان کے پاس صرف پانچ ہزار درہم بچ رہے تھے

درآنحالیکہ اس دوران میں ان کا تجارتی کاروبار جاری رہا اور وہ اس کاروبار سے برابر نفع بھی اٹھاتے رہے۔

آنحضرت ﷺ کے لیے جاں نثاریاں

آنحضرت ﷺ کی دعوت کے بالکل ابتدائی دور سے لے کر مصائب اور شدائد کے اخیر دور تک جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت ﷺ کے لیے جاں نثاریاں کی ہیں اس کی مثال ملنی بھی مشکل ہے۔ جب کبھی قریش آپؐ کی ایذا دہی کے درپے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی جان اور اپنی عزت، دونوں چیزیں خطرے میں ڈال کر آپؐ کی حمایت کی اور آنے والے خطرے کا خود آگے بڑھ کر مقابلہ کیا تاکہ آنحضرت ﷺ ہر قسم کے گزند سے محفوظ رہیں۔ ایک روز قریش کے بڑے بڑے لیڈر حجر میں جمع ہوئے کہ اسلامی دعوت کی مقبولیت کی وجہ سے ان کی لیڈری کو جو خطرہ درپیش آگیا ہے اس کے مقابلہ کی کچھ تدبیریں سوچیں۔ اس اثناء میں آنحضرت ﷺ ادھر آنکلے۔ یہ لوگ غصہ میں بھرے بیٹھے تھے۔ آپؐ کے اوپر پل پڑے اور کہنے لگے کہ تم ہی ہو جو ہمارے دین اور ہمارے بتوں کو برا بھلا کہتے ہو؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: 'ہاں، میں ہی ہوں۔' اتنے میں ایک شخص نے جھپٹ کر آپؐ کی چادر پکڑ لی۔ اور آپؐ سے دست و گریبان ہونا چاہا کہ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ آگئے۔ انہوں نے فوراً تاڑ لیا کہ ان لوگوں کی نیت بد ہے۔ چنانچہ انہوں نے سارا خطرہ اپنے سر پر لے لیا اور آگے بڑھ کر روتے ہوئے یہ فرمایا: 'کیا تم لوگ ایک شخص کو محض اس جرم میں قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ صرف اللہ ہی کو اپنا رب کہتا ہے!'

ہجرت کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے اپنی رفاقت کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو منتخب فرمایا اور باوجودیکہ وہ اس امر سے اچھی طرح واقف تھے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ سفر جان کی بازی ہے اور یہ سفر جس قدر آپؐ کے لیے

خطرناک ہوگا اسی طرح اس شخص کے لیے بھی خطرناک ہوگا جو اس سفر میں آپؐ کا ساتھ دینے کی جرأت کرے گا۔ لیکن اس خطرہ سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود انہوں نے نہ صرف آپؐ کی رفاقت قبول فرمائی، بلکہ آنحضرت ﷺ کے اس انتخاب کو سب سے بڑا شرف سمجھا اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوئے کہ اس نے اپنے نبی پر جان نثار کرنے کا ان کو ایک موقع عنایت فرمایا۔

اپنی اس جاں نثاری کا ایک بہترین ثبوت انہوں نے اس وقت دیا جب غار ثور میں پناہ لینے کا موقع آیا ہے۔ وہ غار کے اندر آنحضرت ﷺ کے داخل ہونے سے پہلے داخل ہوئے تاکہ اس کے اندر اگر کوئی درندہ یا موذی جانور ہو تو اس کی آفت سے وہ خود دوچار ہوں اور آنحضرت ﷺ اس کے گزند سے محفوظ رہیں۔

نرمی اور سختی کا بہترین امتزاج

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خصوصیات میں سے ایک بڑی نمایاں خصوصیت ان کے مزاج کے اندر نرمی اور سختی کا حیرت انگیز امتزاج ہے۔ اس اعتبار سے وہ مزاج نبوت سے قریب ترین انسان تھے جو موقعے سختی کے ہوتے تھے ان موقعوں پر وہ اتنے سخت ہو جاتے تھے جتنا اس موقع کا تقاضا ہوتا تھا اور جہاں نرمی کا موقع ہوتا تھا وہاں وہ کبھی غصہ یا بے جا حمیت سے مغلوب نہیں ہوتے تھے۔ ایک یہودی فخاص نامی نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو حضرت ابوبکرؓ کو طیش آگیا اور اس کو تھپڑ کھینچ مارا اور فرمایا کہ اگر ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تمہارا سر قلم کر دیتا۔ اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر قریش کے نمائندے نے جب آنحضرت ﷺ کو اس بات کا طعنہ دیا کہ کسی بڑے خطرے کا موقع پیش آئے گا تو آپ کے ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو اس کے اس طعنہ کو سن کر حضرت ابوبکرؓ کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے ایسے سخت الفاظ میں اس کو جواب دیا کہ ان کے جیسے حلیم الطبع آدمی کی زبان سے وہ جواب حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے،

لیکن غیرت حق نے ان کی زبان سے وہ الفاظ نکلوا دیے اور مخاطب چونکہ زمانہ جاہلیت میں حضرت ابوبکرؓ کے زیر احسان رہ چکا تھا اس وجہ سے وہ بات کو پی گیا۔

دوسری طرف بدر کے معرکے کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جب فتح عطا فرمائی اور کفار کے بہت سے سردار گرفتار ہو کر آئے تو باوجودیکہ ان لوگوں نے مسلمانوں پر سخت مظالم توڑے تھے اور پیغمبر ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کو نہایت مظلومیت کی حالت میں ان کے گھروں سے نکالا تھا، جن میں خود حضرت ابوبکرؓ بھی شامل تھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ ان قابو میں آئے ہوئے دشمنوں سے انتقام لینے کے بجائے ان کے لیے سراپا رحم وشفقت بن گئے اور ان کے قتل کا مشورہ دینے کی جگہ آنحضرت ﷺ سے نہایت پرزور سفارش ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی فرمائی کہ ممکن ہے یہ لوگ اس احسان سے متاثر ہو کر اسلام لائیں اور خدا کی رضا حاصل کریں۔

دوررسی

حدیبیہ کی صلح اسلامی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ یہ صلح جن حالات میں اور جن شرائط کے ساتھ ہوئی تھی وہ حالات اور شرائط اول اول مسلمانوں کے لیے نہایت مایوس کن اور دل شکن تھے، لیکن اس صلح سے آخرکار جو نتائج نکلے وہ مسلمانوں اور اسلام کے لیے نہ صرف حوصلہ افزا ثابت ہوئے، بلکہ وہ فی الواقعہ ایک 'فتح مبین' کی صورت میں نمودار ہوئے۔ اس صلح میں حضرت ابوبکرؓ نے جو پارٹ ادا کیا وہ ان کے تدبر، معاملہ فہمی اور دوراندیشی کی ایک نہایت ناقابل انکار دلیل ہے۔ یہ صلح جن شرائط پر طے پائی ان کو قبول کرنے کے لیے صحابہؓ میں سے ایک شخص بھی تیار نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو ان شرائط کے اس قدر سخت مخالف تھے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے رُو دررُو اس کی مخالفت میں نہایت تیز لب ولہجہ میں گفتگو کی — جس کا ان کو زندگی بھر پچھتاوا رہا — صرف اکیلے حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو اس معاملے میں برابر آنحضرت ﷺ کے

ساتھ رہے۔ انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اس صلح نامہ کی تائید فرمائی اور اپنے زور واثر سے کام لے کر مسلمانوں کو اس پر راضی اور مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ حضرت عمرؓ کا غصہ بھی انہی کی کوششوں سے فرو ہوا۔

حیرت ہوتی ہے کہ جو معاہدہ ظاہر میں مسلمانوں کے مصالح کے اس قدر خلاف تھا کہ مسلمانوں کی پوری جماعت میں سے ایک شخص بھی اس پر مطمئن نہ ہو سکا اس کی مخفی مصلحتوں کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کے ظاہر ہونے سے کئی سال پہلے کس طرح دیکھ لیا! آنحضرت ﷺ کی نسبت تو کہا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے ان مصلحتوں کو وحی اور الہام کی روشنی میں دیکھ لیا ہوگا، لیکن ابوبکر صدیقؓ نے کس روشنی سے دیکھا؟ اگر یہ ایمان کی روشنی تھی تو بلاشبہ یہ ایمان کا ایسا بلند درجہ ہے جو صدیق اکبرؓ کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا، اور اگر انہوں نے اس معاہدے کے مضمرات اور مخفی مصلحتوں کو محض اپنی سیاسی بصیرت اور اپنے تدبر کی روشنی میں پڑھ لیا تھا تو اس سیاسی بصیرت اور اس دوررسی کی مثال بھی سیاست اور تدبر کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔

اللہ، رسول ﷺ اور مسلمانوں کی نظر میں یکساں محبوبیت

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی مخلصانہ دینی خدمات کے ذریعہ سے اللہ، اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کی نظر میں یکساں محبوبیت کا وہ بلند درجہ حاصل کر لیا تھا جو صرف انہی کے لیے مخصوص تھا۔ اس محبوبیت کی ایک سے زیادہ شہادتیں ہماری اسلامی تاریخ میں موجود ہیں جن میں سے بعض کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

آنحضرت ﷺ نے مرض الموت میں اپنی جگہ پر نماز پڑھانے کی خدمت حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سپرد فرمائی اور اس کے خلاف آپؐ کو جو مشورے دیے گئے آپ نے نہایت شدت کے ساتھ وہ مشورے رد فرما دیے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نماز پڑھانی شروع کر دی تو ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ وہ وقت پر نہ پہنچ سکے۔ حضرت بلالؓ نے حضرت

عمرؓ سے نماز پڑھانے کے لیے درخواست کی اور وہ نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ حضرت عمرؓ بلند آواز آدمی تھے جب انہوں نے تکبیر کہی تو ان کی تکبیر کی آواز حضرت عائشہؓ کے کمرے میں آنحضرت ﷺ کے کانوں میں پڑی۔ آپؐ نے ان کی آواز سن کر فرمایا: 'ابوبکر کہاں ہیں؟ اس چیز کو نہ تو اللہ پسند کرے گا اور نہ مسلمان!'

اللہ اور مسلمانوں کی نظر میں محبوبیت کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پیغمبر ﷺ کی نظر میں محبوبیت اور اعتماد کی جو جگہ حاصل تھی اس کی شہادت خود نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں دی ہے: 'تمام صحابہ میں کوئی نہیں ہے جس کے ان سے زیادہ احسان ہوں۔ اگر میں انسانوں میں کسی کو دوست بنانا پسند کرتا تو ابوبکرؓ کو اپنا دوست بناتا۔ البتہ ہمارے درمیان رفاقت، اخوت اور ایمان کا رشتہ ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے پاس ہم کو جمع کرلے۔'

ضبط و تمکین

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں سب سے زیادہ آزمائش کا موقع وہ آیا ہے جب آنحضرت ﷺ نے وفات پائی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو آنحضرت ﷺ سے جو محبت تھی اگر سوءِ ادب نہ ہو تو اس کو عشق کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن اس عشق کے باوجود آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر سن کر جس صبر و ضبط کا ثبوت انہوں نے دیا ہے اس صبر و ضبط کا ثبوت کوئی اور نہ دے سکا۔ بلکہ یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ اگر اس نازک موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہوش گوش نے مسلمانوں کو سنبھالا نہ ہوتا تو تمام امت ایک نہایت خوفناک فتنہ میں مبتلا ہو جاتی۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر سن کر اکثر مسلمانوں کے اوسان قائم نہ رہے۔ حضرت عمرؓ جیسے دل و دماغ کے آدمی کا یہ حال ہوا کہ مسجد نبوی میں لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے یہ تقریر کرنی شروع کر دی کہ آنحضرت ﷺ نے وفات نہیں پائی ہے، بلکہ جس طرح حضرت موسیٰؑ چالیس دن کے

لیے اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے تھے اور پھر لوٹ آئے اسی طرح آنحضرت ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے ہیں اور کچھ مدت کے بعد لوٹ آئیں گے اور اگر کوئی شخص اس بات پر اصرار کرتا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہو چکی ہے تو اس کو قتل کی دھمکی دیتے اور کہتے کہ جب آنحضرت ﷺ دوبارہ تشریف لائیں گے تو اس قسم کی باتیں کرنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دیں گے۔

جس حادثہ نے حضرت عمرؓ جیسے شخص کے دماغی توازن کو اس درجہ درہم برہم کر دیا ہو اس کا اثر دوسروں پر کیا کچھ ہوا ہوگا۔ اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا مشکل ہے اور اس سے قیاس کرنا چاہیے کہ اس خبر کا کیا اثر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دل پر ہوا ہوگا۔ جن کا حال یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی کسی معمولی سی تکلیف کے تصور سے بھی بے چین ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن آیئے اور دیکھیے کہ اس سب سے بڑے حادثے کا وہ کس صبر جمیل سے مقابلہ کرتے ہیں اور کس طرح قرآن کی روشنی کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک بڑی تاریکی میں گھر جانے سے بچا لیتے ہیں۔ جس وقت آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی حضرت ابوبکرؓ مدینہ میں موجود نہیں تھے۔ بلکہ مدینہ سے کچھ فاصلے پر سخ میں تھے۔ حادثہ کی اطلاع پا کر شہر میں آئے تو لوگوں کو سراسیمہ اور حضرت عمرؓ کو مسجد میں تقریر کرتے ہوئے پایا۔ لیکن وہ بغیر ذرا بھی رکے ہوئے سیدھے حضرت عائشہؓ کے مکان میں داخل ہوئے۔ آنحضرت ﷺ کے چہرۂ مبارک سے چادر ہٹائی اور بوسہ دیتے ہوئے فرمایا: 'کتنے پاکیزہ تھے زندگی میں اور کتنے پاکیزہ ہیں مرنے کے بعد۔' اس کے بعد لوگوں کے پاس گئے اور فرمایا:

'اے لوگو! جو لوگ محمدؐ کی پرستش کر رہے تھے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ محمد (ﷺ) مر گئے اور جو لوگ اللہ کی پرستش کر رہے تھے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا۔' اس کے بعد قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَمَامُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَوْقُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ

الشّٰکِرِیْنَ ٥ (ال عمران ۳: ۱۴۴)

محمد تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے۔ جو پیٹھ پیچھے پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر گزاروں کو صلہ عطا فرمائے گا۔

حضرت عمرؓ نے یہ آیت سنی تو ان کو یقین آیا کہ آنحضرت ﷺ فی الواقع انتقال فرما چکے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہوئے شدتِ غم سے زمین پر گر پڑے۔ اس کے بعد انہوں نے اور دوسرے مسلمانوں نے معاملہ کی اہمیت پر اس کے صحیح پہلو سے غور کرنا شروع کیا۔ ورنہ اس سے پہلے تو ان کے ذہن ایک بالکل دوسری راہ پر چل پڑے تھے۔ جس سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بصیرتِ ایمانی نے اگر ان کو بالکل وقت پر نہ موڑا ہوتا تو نہیں معلوم وہ اس غلط راہ پر کتنی دور تک نکل جاتے۔

سیاست و تدبر

سیاست و تدبر کے لحاظ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو مقام حاصل تھا اس کے ثبوت کے لیے ان کا صرف ایک کارنامہ کافی ہے جو انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انجام دیا۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر پھیلتے ہی ابھی آپ کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی کہ انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر اس سوال پر غور کرنا شروع کر دیا کہ آپؐ کے بعد آپؐ کی خلافت کا حق کن کو پہنچتا ہے: انصار کو یا مہاجرین کو؟ خزرج کے لیڈر سعدؓ بن عبادہؓ کی رہنمائی میں انصار کی عام رائے یہ تھی کہ یہ حق انصار کو حاصل ہے نہ کہ مہاجرین کو۔ وہ اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لیے اس قدر سرگرم اور پرجوش تھے کہ ان کے بعض لیڈروں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ان کے اس حق کو تسلیم نہ کیا گیا تو اس کے لیے تلواریں نیام سے نکلیں گی۔ انصار کے حلقہ میں ہلکی سے ہلکی رائے اس معاملہ میں ان لوگوں کی تھی جو 'منا امیر و منکم امیر' (خلیفہ انصار و مہاجرین دونوں میں سے باری

باری مقرر ہو) کے فارمولے پر سمجھوتے کے لیے راضی تھے۔

ادھر سقیفہ بنی ساعدہ میں یہ ہنگامہ گرم تھا اور ادھر مہاجرین کے بڑے بڑے لیڈروں کا یہ حال تھا کہ حضرت عمرؓ، حضرت ابوعبیدہؓ وغیرہ کے ساتھ مسجدِ نبوی میں آنحضرت ﷺ کی وفات کے مسئلہ پر غور کر رہے تھے، اور حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؓ کے ساتھ تجہیز و تکفین کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ اتنے میں ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع اور انصار کے لیڈروں کی تقریروں کی اطلاع دی، انہوں نے یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کو بلایا۔ پہلے تو انہوں نے اپنی مشغولیت کی بنا پر معذرت کی، لیکن حضرت عمرؓ نے معاملے کی اہمیت سمجھائی تو مجبوراً وہ باہر آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حالات سنتے ہی فوراً محسوس کر لیا کہ اگر جلد سے جلد صورتِ معاملہ پر قابو پانے کی کوشش نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ امت کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے۔ چنانچہ اسلام اور مسلمانوں کی محبت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی تجہیز و تکفین کے اہم ترین کام کو ملتوی کر کے پہلے مسلمانوں کو ایک ہولناک فتنہ سے بچانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ وہ فوراً حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کو لے کر سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچے۔

وہاں پہنچ کر انہوں نے پہلے ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ انصار کے بعض لیڈروں کی زہر آلود تقریروں نے لوگوں کے ذہن بری طرح خراب کر دیے ہیں اور اکثریت کے تیور اچھے نہیں رہے ہیں۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے بلکہ حالات کو درست کرنے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ پہلے حضرت عمرؓ نے تقریر کے لیے اٹھنا چاہا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کی طبیعت کی تیزی کا خیال کر کے اس موقع پر ان کا تقریر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خود اٹھ کر ایک تقریر فرمائی۔ یہ تقریر ایسی فصیح و بلیغ، ایسی مدلل، ایسی منصفانہ اور ایسی حکیمانہ تھی کہ تمام سلیم طبیعتوں کے اندر گھر کر گئی۔ انصار کے بعض لیڈروں نے اس تقریر کا جواب دینے کی کوشش کی، لیکن اس کا جواب دینا ممکن نہ تھا۔ انصار کی تعریف میں جتنا کچھ کہا جا سکتا تھا حضرت ابوبکرؓ نے خود بہتر سے بہتر

لفظوں میں کہہ دیا تھا اور ساتھ ہی اپنے نقطہ نظر کو ایسے مدلل طریقے پر اور ایسے غیر متزلزل لب ولہجہ میں پیش کر دیا تھا کہ کسی غلط امید کے لیے کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی تقریر سے اکثریت کا ذہن صاف ہو چکا ہے اور اب لوگ ان کی رہنمائی قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں تو انہوں نے ایک بہترین سیاسی لیڈر کی طرح صحیح موقع سے صحیح فائدہ اٹھایا، اور حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دونوں تمہارے بہترین آدمیوں میں سے ہیں۔ ان میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو۔ حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو قبل اس کے کہ ان کا یا حضرت ابوعبیدہؓ کا نام زیر بحث آئے فوراً سبقت کر کے حضرت ابوبکرؓ سے درخواست کی کہ 'ہاتھ لائیے' ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ آپ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی جگہ مسلمانوں کو نماز پڑھانے کے لیے منتخب کیا۔ اس وجہ سے آپ ہی سزاوار ہیں کہ مسلمانوں کے خلیفہ بنیں۔ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے درحقیقت اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کریں گے جو ان تمام لوگوں میں بہترین ہیں، جس سے رسول اللہ ﷺ نے محبت کی۔' اسی طرح حضرت ابوعبیدہؓ بھی آگے بڑھے اور حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کر کے بولے: 'آپ تمام مہاجرین میں سب سے افضل ہیں۔ آپ غار میں رسول اللہ ﷺ کے تنہا ساتھی تھے۔ مسلمانوں کے سب سے بڑے فریضہ دینی نماز کے قیام واہتمام میں آپ رسول اللہ ﷺ کے جانشین ہیں، تو آپ کے ہوتے ہوئے بھلا اس منصب کا سزاوار آپ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟' مہاجرین کے دو چوٹی کے لیڈروں نے جن پر اس منصب کے لیے نگاہ پڑ سکتی تھی، مذکورہ بالا الفاظ میں صرف اپنے ہی جذبات کا اظہار نہیں کیا، بلکہ پوری قوم کے جذبات کی ترجمانی کر دی اور اس شخص کی طرف انگلی اٹھا کے اشارہ کر دیا جو پوری قوم کے اندر منصب خلافت کی ذمہ داریوں کے لیے بہترین شخص تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب محسوس کر لیا کہ لوگ یہ ذمہ داری انہی کے کندھوں پر ڈالنے کے لیے مصر ہیں تو باوجودیکہ ان سے زیادہ اس قسم کے عہدوں سے بھاگنے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا، لیکن انہوں نے قبول کر لیا۔ ان کی آمادگی کے ظاہر ہوتے ہی تمام انصار، بجز سعدؓ بن عبادہ کے، حضرت

ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کے لیے اس جوش وخروش کے ساتھ بڑھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی ریل پیل میں سعدؓ بن عبادہ روندے جائیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ کے موقع پر اپنے سیاسی عزم وحزم کا جو ثبوت دیا اس کے بیان کے لیے مصر کے مشہور مورخ محمد حسنین ہیکل کے مندرجہ ذیل الفاظ مستعار لے لیتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں: 'اس میں شبہ نہیں کہ یہ اجتماع اسلام کی زندگی میں ایک نہایت اہم اجتماع تھا اور اگر حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر غیر معمولی عزم وحزم کا ثبوت نہ دیا ہوتا تو اندیشہ تھا کہ اس نئے دین کے خلاف خود اس کے گہوارہ کے اندر بھی اس طرح کی بغاوت پھوٹ پڑے جس طرح کی بغاوت عرب کے دوسرے مقامات سے پھوٹ پڑی تھی اور یہ بغاوت ایسے وقت میں پھوٹتی جبکہ پیغمبر اسلام کی نعش مبارک ابھی پردہ خاک بھی نہ ہوئی ہوتی۔'

پیغمبر ﷺ کی جانشینی کی اہلیت

حضرت ابوبکرؓ کو جس شخص کی جانشینی ملی تھی وہ کوئی عام انسان نہ تھا، بلکہ خدا کا ایک جلیل القدر پیغمبر تھا۔ اللہ تعالیٰ براہ راست، وحی کے ذریعے سے، اس کی رہنمائی کرتا تھا، فرشتوں کے ذریعہ سے اس کی مدد فرماتا اور معجزات کے ذریعہ سے اس کی ڈھارس بندھاتا تھا۔ اس کے اخلاق واوصاف تمام تر براہ راست اللہ تعالیٰ کی تربیت میں نشوونما پاتے تھے۔ اس وجہ سے کسی پہلو سے ان میں کوئی نقص نہ تھا بلکہ وہ کمال کے آخری درجہ پر تھے۔ جہاں پیشرو اتنا شاندار اور عظیم الشان ہو قدرتی بات ہے کہ وہاں اس کے جانشین کے لیے اپنے منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ جن لوگوں کی نظروں میں نبی کا جمال سمایا ہوا ہو وہ اس کے جانشین کو کتنی ہی فیاضانہ رعایت دے کر جانچیں تاہم ان کی جانچ کا معیار اتنا اونچا ہوگا کہ اس معیار پر پورا اترنا بڑے دل وجگر کا کام ہے، بالخصوص جبکہ جانچنے والے خود بھی بلند سے بلند معیار پر پورے اترنے کی قابلیت

رکھتے ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک ایسے ہی بلند مرتبہ اور عالی مقام پیشرو کی جگہ سنبھالی تھی اور اپنے پہلے خطبے میں برملا لوگوں کو بتا دیا تھا کہ میں کس کا جانشین ہوں اور مجھے اپنے آپ کو کس کسوٹی پر پرکھوانا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ یہ تھے: 'اے لوگو! میں تمہارا خلیفہ بنایا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ پس اگر میں ٹھیک کام کروں تو آپ میری مدد کیجیے اور اگر غلط کروں تو مجھے درست کر دیجیے .... آپ کے اندر بے اثر لوگ میرے نزدیک باثر ہیں یہاں تک کہ میں ان کے حق کو غاصبوں سے وصول کر لوں اور باثر لوگ میرے نزدیک بے اثر ہیں یہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا ہڑپ کیا ہوا حق وصول کر لوں .... میں جب تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کروں اس وقت تک آپ میری اطاعت کریں۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو پھر آپ پر میری اطاعت کی ذمہ داری نہیں!'

حضرت ابوبکرؓ نے اس خطبہ میں اپنی حکومت کا مقصد بھی بیان کر دیا تھا، اپنے حدود عمل بھی مقرر کر دیے تھے اور اس امر کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ اگر وہ اپنے حدود عمل سے ذرا بھی تجاوز کریں تو لوگوں کو ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے نہایت صفائی کے ساتھ خود یہ حقیقت لوگوں کے سامنے رکھ دی تھی کہ وہ ایک اسلامی حکومت کے امیر کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلنے کے لیے ذمہ دار ہیں اور ان کی اطاعت مسلمانوں پر صرف اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے طریقہ پر چلتے رہیں۔ جہاں وہ اس سے ذرا بھی منحرف ہوں لوگوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ان کو اٹھا کر پھینک دیں۔ دنیا کے ایک عظیم ترین پیغمبر کی جانشینی کی ذمہ داری اٹھانا اور لوگوں کو یہ حق دے دینا کہ لوگ پیغمبر ﷺ کے قول و عمل کی روشنی میں ان کے قول و عمل کا محاسبہ کرتے رہیں کوئی معمولی بات نہیں ہے، بالخصوص ایسے لوگوں کو یہ حق دینا جو رسول کے علم و عمل سے اچھی طرح واقف بھی ہوں اور کسی بڑے سے بڑے شخص کا محاسبہ کرنے کی ہمت اور قابلیت بھی رکھتے ہوں! لیکن حضرت ابوبکرؓ نے یہ

ہمت کر کے دکھا دی اور تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے پیغمبر کی جانشینی کا حق اسی طرح ادا کیا جس طرح اس کے ادا کرنے کا حق تھا۔ یہاں تک کہ ان کے عہد کے ایک دوسرے بڑے آدمی نے — جس سے بڑا حضرت ابوبکرؓ کے سوا کوئی اور نہ تھا — ان کی بعض عظیم خدمات سے متاثر ہو کر نہایت حسرت کے انداز میں یہ کہا کہ اگر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا معیار یہ ہے جو آپ نے قائم کر دیا ہے تو آپ کے جانشینوں میں سے کون ہے جو آپ کی ہم سری کا حوصلہ کر سکے گا!

حکمرانی کی قابلیت

حضرت ابوبکرؓ جس وقت خلیفہ ہوئے ہیں کسی بنی بنائی حکومت کے خلیفہ نہیں ہوئے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نبوت کے دور کے بعد اسلامی حکومت کا آغاز ان کی ذات سے ہوا ہے۔ اس وجہ سے ان کے سامنے وہ ساری مشکلیں موجود تھیں جو ایک نئی حکومت کے آغاز کار میں موجود ہوا کرتی ہیں اور جن سے عہدہ برآ ہونا ہر تخت نشین کا کام نہیں ہے، بلکہ صرف وہ ہستیاں ان مشکلات پر قابو پاتی ہیں جو خدا کے ہاں سے حکمرانی کی خاص قابلیت لے کر آتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے اندر اسی طرح کی قابلیت رکھتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنی حکومت کی داخلی اور خارجی مشکلات پر جس خوبی کے ساتھ قابو پایا اس کی مثال حکمرانی کی تاریخ میں مشکل سے مل سکے گی۔ اس مختصر مضمون میں اس عنوان پر زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے، البتہ ہم بعض باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔ آپ سے امید ہے کہ آپ ان اشارات کی روشنی میں اصل حقیقت کو اس کے تفصیلی رنگ میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کا انصار پر جو ردِ عمل ہوا اور حضرت ابوبکرؓ نے جس تدبر اور حزم کے ساتھ حالات پر قابو پایا اس کی طرف ہم اوپر مختصراً اشارہ کر چکے ہیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہو جانے کے بعد اگرچہ انصار کے لیڈر، سعدؓ

بن عبادہؓ نے نہ تو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور نہ جمعہ و جماعت اور حج اور دوسرے اجتماعی امور میں ان کی امارت تسلیم کرتے تھے بلکہ ان کے رویہ سے اس بات کا نہایت قوی اندیشہ تھا کہ اگر کچھ لوگ ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے تو وہ ملک میں بغاوت برپا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہونے سے پہلے تک انصار پر سعدؓ بن عبادہؓ کا جو زور و اثر تھا حضرت ابوبکرؓ اس سے ناواقف نہیں تھے اور وہ اپنی قوم کی اس افتادِ مزاج سے بھی بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ اس کے اندر کسی معمولی سی تحریک سے پرانے خوابیدہ فتنے بڑی آسانی سے جاگ اٹھتے ہیں۔ بعض لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو سعدؓ کو چھوڑے رکھنے کے خطروں سے آگاہ بھی کیا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ اگر سعدؓ سے تعرض کیا گیا تو انصار کے اندر ان کی حمایت کے لیے عصبیت پیدا ہو گی جس کے نتائج حکومت کے لیے مضر ہو سکتے ہیں اور اگر ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو ان کے سایہ کے سوا کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہیں نکلے گا اور کچھ دنوں کے بعد یا تو حکومت کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر وہ خود بدل جائیں گے اور اگر خدانخواستہ وہ نہ بدلے تو حالات میں اتنی تبدیلی ہو جائے گی کہ وہ حکومت کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلا سکیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جس وقت یہ اندازہ لگایا تھا اس وقت مختلف وجوہ کی بنا پر اس اندازہ کو غلط ٹھہرایا جا سکتا تھا لیکن پیش آنے والے حالات نے ثابت کر دیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو رائے قائم کی تھی وہ بالکل صحیح تھی اور اگر وہ اس کے خلاف کوئی اور پالیسی اختیار کرتے تو شاید اس کے نتائج اچھے نہ نکلتے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد نبی ﷺ کے خاندان کے لوگوں کے ذہن میں بھی حضرت ابوبکرؓ اور ان کی حکومت کے خلاف بعض فہمیاں پیدا ہوئیں اور ان غلط فہمیوں نے نہایت سخت سیاسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ خانوادۂ رسول کے ساتھ مسلمانوں کو ایک جذباتی تعلق تھا، اور یہ تعلق جتنا عام مسلمانوں کو تھا اس سے کہیں زیادہ

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو تھا۔ لیکن ان تمام واقعات سے بالاتر وہ حق تھا جس کی حفاظت و نگرانی کی ذمہ داری ان کے سر ڈالی گئی تھی اور جس کے لیے وہ عند الناس اور عند اللہ، دونوں جگہ جوابدہ تھے۔ اس دوگونہ کشمکش کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کو خانوادۂ رسول کے معاملہ کی وجہ سے ذہنی و قلبی پریشانی لاحق ہوئی۔ ان کے لیے نہ یہ ممکن تھا کہ وہ حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ جیسے لوگوں کے ساتھ دوٹوک معاملہ کریں، جو سیاست کا تقاضا ہے، کیونکہ ایسا کرنا مسلمانوں کے جذبات کے بھی خلاف تھا، اور خود ان کے جذبات کے بھی خلاف تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ خلافت وغیرہ کے معاملہ میں ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق کریں۔ کیونکہ اس معاملہ میں وہ ان لوگوں کی رائے کو شریعت کے خلاف سمجھتے تھے، اس معاملہ کا ایک خطرناک پہلو یہ تھا کہ خانوادۂ رسول کے بعض ممتاز ارکان کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں تاخیر ہو رہی تھی جس کے سبب سے حکومت کی ساکھ بھی خطرہ میں تھی اور اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ مبادا چھپے ہوئے اہل غرض اس چنگاری کو ہوا دے کر کوئی فتنہ کھڑا کریں۔ یہ سارے اندیشے اور خطرات موجود تھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے نہ تو کوئی بات جذبات کے خلاف کی اور نہ بال برابر اس رائے سے ہٹنے پر راضی ہوئے جس کو از روئے شرع صحیح سمجھتے تھے۔ اس معاملہ کا اگر کوئی پہلو قابل اطمینان تھا تو یہ تھا کہ اس نزاع میں بھی بنو ہاشم کے لیڈر حضرت علی کرم اللہ وجہ تھے۔ جن کی نسبت یہ اعتماد تھا کہ وہ کسی معاملہ میں اختلاف تو کر سکتے ہیں، لیکن کسی اختلاف کو فتنہ بنانے کی کوشش کرنا ان کی شان اور مرتبہ کے خلاف ہے۔ غالباً اس اعتماد پر حضرت ابوبکرؓ نے اس معاملہ میں انتہائی رواداری پالیسی اختیار کی اور ان کی یہ پالیسی سو فی صد کامیاب رہی۔

حضرت ابوبکرؓ نے جب خلافت کی ذمہ داری سنبھالی ہے تو ملک کے اندر کے حالات بھی انتہائی حد تک گڑبڑ تھے اور باہر سے رومیوں کے حملے کا اندیشہ بھی ہر وقت موجود تھا۔ اندرون ملک کی حالت یہ تھی کہ ان قبائل کے سوا جو مکہ، مدینہ اور طائف کے درمیان تھے، باقی تقریباً سارا عرب ارتداد کے فتنہ میں مبتلا ہو گیا۔ مدینہ کے قریب کے بہت سے

قبائل مثلاً ذبیان، بنی کنانہ، غطفان اور فزارہ وغیرہ نے اگرچہ اپنے ارتداد کا اعلان نہیں کیا، لیکن مدینہ کی مرکزی حکومت سے بے تعلقی اور زکوٰۃ نہ ادا کرنے کا اعلان کر دیا۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ نبوت کے مدعی اور ملک و مال کے طالب اٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے بہتوں کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ بنی اسد میں طلیحہ، بنی تمیم میں سجاح، یمامہ کے مسیلمہ وغیرہ نے نبوت کے دعوے کر دیے۔ یمن میں اسود عنسی نے علم بغاوت بلند کیا اور ایک خلق کثیر نے اس کا ساتھ دیا۔

دوسری طرف غزوۂ تبوک اور غزوہ موتہ کی وجہ سے مسلمانوں اور رومیوں میں ایک مسلسل جنگ کی حالت قائم ہو چکی تھی۔ رومیوں کی طرف سے حملہ کا خطرہ یوں تو پہلے ہی سے موجود تھا، لیکن غزوہ موتہ کے موقع پر مسلمانوں نے جو پسپائی اختیار کی تھی اس کے سبب سے ان کے حوصلے بہت زیادہ بڑھ گئے تھے اور اندیشہ تھا کہ اگر ان کو یہ پتا چل گیا کہ مدینہ کی حکومت داخلی مشکلات میں گھر گئی ہے اور ملک کے بڑے حصہ میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے تو وہ فوراً مدینہ پر حملہ کر دیں گے۔ یہ دونوں خطرے پہلے سے موجود تھے اور حضرت ابوبکرؓ کو خلافت کی زمام سنبھالتے ہی ان دونوں خطروں سے نمٹنا تھا۔ اب دیکھیے کہ انہوں نے ان خطروں کا بیک وقت کس عزم و ہمت اور کس غیر معمولی تدبیر و تدبر کے ساتھ مقابلہ کیا اور کس طرح دونوں خطروں پر فتح پائی۔

سب سے پہلے تو انہوں نے خلیفہ ہوتے ہی اس لشکر کو رومیوں پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا جو آنحضرت ﷺ کی حیات مبارک ہی میں حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں رومیوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو چکا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ کی بیماری اور پھر آپؐ کی وفات کے سبب سے اس کی روانگی میں تاخیر ہو گئی تھی۔ آپ کے اس حکم کو اکابر صحابہؓ نے مناسب نہ سمجھا اور آپ کو لشکر بھیجنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ بعض لوگوں نے تو اس دلیل کی بنا پر آپ کو روکا کہ ملک کے اندرونی حالات اچھے نہیں ہیں۔ ایسے حالات کے اندر تمام بڑے بڑے صحابہؓ کا لشکر کے ساتھ ملک سے باہر چلے جانا خلاف مصلحت ہے۔

اور کچھ لوگوں نے اس سبب سے کہ ان کو حضرت اسامہؓ کی قیادت پر اعتراض تھا۔ ان لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ جس فوج کے اندر نہایت جلیل القدر اور معمر صحابہؓ موجود ہیں اس فوج کی قیادت ایک نوخیز اور ناتجربہ کار کے ہاتھ میں نہیں ہونی چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں اعتراضوں میں سے کوئی ایک اعتراض بھی تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ جس جھنڈے کو رسول اللہ ﷺ نے باندھا ہے میں اس کو نہیں کھولوں گا۔ بالآخر لوگوں نے حضرت عمرؓ کو ذریعہ بنایا اور ان کے واسطے سے حضرت ابوبکرؓ سے درخواست کی کہ اول تو ملک کے حالات کو پیش نظر رکھ کر فوج کی روانگی فی الحال ملتوی کر دی جائے اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم اسامہؓ کو قیادت سے ہٹا کر کسی بڑے صحابی کو امیر عسکر بنایا جائے۔ حضرت عمرؓ نے جس وقت حضرت ابوبکرؓ کے سامنے لوگوں کی یہ درخواست رکھی تو انہوں نے اس کے پہلے حصہ کا جواب تو یہ دیا کہ اگر مجھے کتے اور بھیڑیے بھی اچک لے جائیں تو بھی رسول اللہ ﷺ کی بنائی ہوئی سکیم کو مسترد نہیں کروں گا! اور دوسرے حصے کا جواب دیتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی اور فرمایا: 'ابن خطاب! تمہاری ماں تم کو روئے۔ جس کو نبی نے مقرر کیا تم مشورہ دیتے ہو کہ میں اس کو معزول کر دوں؟'

الغرض ان تمام مخالفتوں اور حالات کی گڑبڑی کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہؓ کے لشکر کو بھیج دیا اور یہ ان کے عزم کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس فوج کو نہایت شاندار فتح نصیب کی اور اس فتح نے اندر کے دشمنوں کو بھی مرعوب کر دیا اور بیرونی دشمنوں کے حوصلوں کی بھی کمر توڑ دی۔ عرب کے جو قبائل بغاوت کے لیے پر تول رہے تھے جب ان کو پتا چلا کہ لشکر گراں رومیوں سے لڑنے کے لیے روانہ ہو رہا ہے ان میں یہ چرچا پھیلنے لگا کہ مدینہ کی حکومت کے پاس کافی طاقت موجود نہ ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اتنے دور دراز ملک پر فوج کشی کا ارادہ کرتی اور اس چیز نے ان کے بغاوت کے حوصلہ کو اور بھی سرد کر دیا۔ دوسری طرف ہرقل کو خود اپنی سرحدوں کی حفاظت کی پڑ گئی چہ جائیکہ وہ عرب پر حملہ آور ہونے کی جرأت کرتا۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ نے ایک پتھر سے دو شکار کرنے

چاہے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی سکیم میں کامیاب رہے۔

بیرونی خطرہ کے سدِ باب کے لیے مذکورہ بالا انتظام کر دینے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بچی کچی طاقت کے ذریعہ سے اندرونی بغاوت کو بھی دبا دینے کا نہایت مضبوط ارادہ کیا۔ اس سلسلہ میں بھی صحابہؓ کی جماعت کی طرف سے، جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت کی گئی۔ کم از کم مانعین زکوٰۃ کے بارہ میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان سے جنگ نہ کی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ جو لوگ کلمہ پڑھتے ہیں محض اس وجہ سے کہ انہوں نے مرکزی خزانہ کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے، اپنے جان و مال کی حفاظت سے محروم نہیں کیے جا سکتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے اس نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلام میں زکوٰۃ نماز کے ہم پایہ ہے، اس وجہ سے اگر نماز کے لیے جنگ کی جا سکتی ہے تو زکوٰۃ کے لیے بھی جنگ کی جا سکتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب اپنی رائے پر کچھ اصرار کرنا چاہا تو حضرت ابوبکرؓ نے نہایت سختی سے ڈانٹا کہ جاہلیت کے دور میں آپ بہادر تھے، اب اسلام کے دور میں آپ بزدلی دکھا رہے ہیں! اور پھر پورے جوش و عزم کے ساتھ فرمایا: "اگر کوئی بھی میرے ساتھ نہیں نکلے گا تو میں تنہا ان سے جنگ کے لیے نکلوں گا۔" ان کے اس عزم نے سب کے دلوں میں حرارت پیدا کر دی اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر حضرت ابوبکرؓ نے بغاوت کا قلع قمع کر دیا۔ اس سلسلہ کی یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ باوجودیکہ بغاوت کا دائرہ نہایت وسیع تھا، مدینہ کی حکومت گوناگوں مشکلات کے اندر گھری ہوئی تھی اور صحابہؓ کی جماعت پورے زور کے ساتھ اس بات کی حامی تھی کہ باغیوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جائے، ان سے جنگ نہ کی جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے سمجھوتے کی ساری تجویزوں کو رد کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اسلام کے مقرر کیے ہوئے حقوق میں سے بکری کا ایک بچہ بھی میں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں!

غور کیجیے کہ اگر اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے اس عزم کا ثبوت نہ دیا ہوتا، بلکہ بڑھتی ہوئی بغاوت سے مرعوب ہو کر مرتدین اور باغیوں سے سمجھوتہ منظور کر لیا ہوتا تو عرب کی

تاریخ، بلکہ خود اسلام کی تاریخ اس سے کتنی مختلف ہوتی جو آج اس کی تاریخ ہے۔ اسی طرح اگر حضرت اسامہؓ کے لشکر کی روانگی، لوگوں کی مخالفت سے متاثر ہو کر، حضرت ابوبکرؓ نے ملتوی کر دی ہوتی تو اندر اور باہر کے کتنے خطرے تھے جو ان کی اس کمزوری سے شہ پا سکتے تھے۔ لیکن سخت سے سخت حالات کے اندر حضرت ابوبکرؓ نے وہی فیصلہ کیا جو عزم اور تدبر کا حقیقی تقاضا تھا اور یہ ان کے اسی عزم کا ثمرہ تھا کہ سوا دو سال سے بھی کم کی مدت میں انہوں نے نہ صرف عرب کو اسلام کی طاقت کے آگے سرنگوں کر دیا بلکہ عراق کی تسخیر سے فارغ ہو کر ان کی فوجوں نے شام پر حملے کر دیے۔

حضرت ابوبکرؓ کی داخلی اور خارجی پالیسی

پالیسی کا لفظ سنتے ہی جھوٹ، فریب، دغا بازی اور مکاری ایسے گھناؤنے تصورات دماغ کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے صالح حکمران کی طرف اس لفظ کا انتساب بھی سوءِ ادب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو بات کہنی ہے وہ ٹھیک ٹھیک چونکہ اسی لفظ سے ادا ہو سکتی ہے اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ سوءِ ادب کے پہلو کو نظر انداز کر کے اس لفظ کو استعمال کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ بے ایمانی و دغا بازی جس چیز کے لازمی تضمینات میں سمجھی جاتی ہیں وہی چیز جب ایک مثالی اسلامی نظام میں ایک خلیفہ راشد کے ہاتھوں برتی جاتی ہے تو کتنی پاکیزہ اور کتنی ستھری چیز بن جاتی ہے اور جھوٹ اور فریب کی آلائش اس کے مزاج سے کتنی بے جوڑ ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حکومت کے داخلی اور خارجی امور کی انجام دہی میں جن باتوں کو اپنی پالیسی کے اصول کے طور پر پیش نظر رکھا، ان کا اظہار انہوں نے اپنی پہلی ہی تقریر میں نہایت واضح الفاظ میں کر دیا تھا۔ یہ تقریر اگرچہ نہایت اختصار کے ساتھ نقل ہوئی ہے لیکن ایک غور کرنے والے شخص کے لیے ان کی پالیسی کے ہر پہلو کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں ان کی اسی تقریر کی مدد سے ان

کی پالیسی کے بنیادی اصول کو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں تاکہ لوگ اندازہ کر سکیں کہ ایک اسلامی حکمران اور ایک اسلامی حکومت کا مزاج ایک غیر اسلامی حکمران اور ایک غیر اسلامی حکومت کے مزاج سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔

۱) حضرت ابوبکر صدیق کی سیاست کا پہلا اصول یہ تھا کہ وہ جس کے خلیفہ ہیں اس کے منشاء کو سیاسی زندگی کے ہر گوشہ میں پورا کریں اور اس راہ میں کسی خطرہ کی بھی پروا نہ کریں۔ وہ جس طریقہ سے نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں آپ کے ہر حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرتے تھے اسی طریقہ سے خلیفہ ہونے کے بعد بھی انہوں نے اپنا اور اپنی حکومت کا اصلی مقصد یہ قرار دیا کہ تمام معاملات سیاست و تمدن کی انجام دہی میں ٹھیک ٹھیک نبی ﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی کی جائے اور آپؐ کے جو منصوبے آپ کی زندگی میں ناتمام رہ گئے ہیں وہ پورے کیے جائیں، اگرچہ اس راہ میں کتنی ہی مشکلیں پیش آئیں۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کے بعد انہوں نے جو پہلی تقریر کی اس میں یہ بات واضح کر دی کہ میری حکومت کا مقصد صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منشاء کو ٹھیک ٹھیک پورا کرنا ہے۔ اگر میں اس مقصد سے ہٹ جاؤں تو لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مجھے ہٹا دیں اور کسی دوسرے کو اپنا سربراہ کار بنالیں۔ بعینہٖ اسی حقیقت کا اظہار انہوں نے اپنی دوسری تقریر میں فرمایا جو حضرت اسامہؓ کے لشکر کو بھیجتے وقت کی۔ اس میں انہوں نے فرمایا: 'اے لوگو! میں تمہارے ہی جیسا ایک عام انسان ہوں۔ مجھے نہیں معلوم، شاید آپ مجھ سے وہ توقعات کر بیٹھیں جو صرف رسول اللہ ﷺ ہی پوری کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو تمام دنیا کے لیے ہادی بنایا تھا اور آپ کو ہر قسم کی غلطیوں سے محفوظ کر دیا تھا، یہ چیز مجھے حاصل نہیں ہے۔ تاہم میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں حضور ﷺ ہی کے نقشِ قدم پر چلوں گا اور آپؐ کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ کر کوئی نئی راہ نہیں نکالوں گا۔ اگر میں سیدھی راہ پر چلوں تو میری پیروی کیجیے،

اور اگر میں اس سیدھی راہ سے ذرا بھی ہٹ جاؤں تو مجھے سیدھا کر دیجیے!'

الفاظ میں جو بات انہوں نے فرمائی عملی سیاست سے پوری مضبوطی کے ساتھ اس کو کر بھی دکھایا۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلا حکم انہوں نے جو دیا وہ حضرت اسامہؓ کے لشکر کی روانگی کا حکم تھا، جس کی روانگی کا حکم نبی ﷺ دے چکے تھے لیکن آپؐ کی وفات کے سبب سے جس کی روانگی ملتوی ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس روانگی کے سخت خلاف تھی۔ کچھ لوگ اس کی روانگی سے اس لیے اختلاف کر رہے تھے کہ ملک میں بغاوت پھوٹ پڑی تھی، ایسی حالت میں تمام بڑے بڑے صحابہؓ کا ملک سے باہر کسی مہم پر چلے جانا ان لوگوں کے نزدیک خلافِ مصلحت تھا۔ دوسرے کچھ لوگوں کو حضرت اسامہؓ کی قیادت پر اعتراض تھا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ بڑے بڑے صحابہؓ کی موجودگی میں اسامہؓ جیسے کم عمر آدمی کو فوج کا سپہ سالار بنانا ٹھیک نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں گروہوں میں سے کسی گروہ کی بھی بات نہیں مانی اور جواب میں ان دونوں سے جو بات کہی وہ یہ تھی کہ وہ نبی ﷺ کے تمام منصوبوں کو ہر قیمت پر پورا کرنا اپنی حکومت کا مقصدِ وجود سمجھتے ہیں۔ پہلے گروہ کو انہوں نے جو جواب دیا وہ خود ان کے الفاظ میں کتابوں میں یوں نقل ہوا ہے:

'اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں ابوبکر کی جان ہے! اگر مجھے یہ اندیشہ بھی ہو کہ مجھے کتے اور بھیڑیے اچک لے جائیں گے جب بھی میں اسامہؓ کے لشکر کو بھیج کر دم لوں گا۔ میں کسی ایسے فیصلے کو رد نہیں کر سکتا جو رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے۔'

اور دوسرے گروہ کے نمائندہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی داڑھی پکڑ کر نہایت جوش کے ساتھ انہوں نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

'تمہاری ماں تم کو روئے، اے ابن خطاب! اسامہؓ کو رسول اللہ ﷺ نے

سپہ سالار بنایا اور تم مجھ سے یہ مطالبہ کر رہے ہو کہ میں ان کو معزول کر دوں'

ان کی اس پالیسی کی شہادت ان کے اس جواب سے بھی ملتی ہے جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیا جبکہ انہوں نے فدک وغیرہ کی زمینوں میں نبی ﷺ کی وراثت کا مطالبہ کیا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ موقع بہت نازک تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی پیاری بیٹی کی خاطر داری حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ کسی دوسرے شخص کو عزیز نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ ان کے نزدیک اس معاملہ میں حضرت فاطمہؓ کو خوش رکھنا خود رسول کریم ﷺ کی ناخوشی کے مترادف تھا، اس وجہ سے انہوں نے سیدہ فاطمہؓ کے مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا اور ان کو صاف جواب دے دیا کہ 'میں نے رسول اللہ ﷺ کو جو کام جس طرح کرتے دیکھا ہے اسی طرح کروں گا۔' جس کا مطلب یہ تھا کہ فدک وغیرہ کی زمینوں کا انتظام جس شکل میں رسول اللہ کے زمانہ میں تھا، اسی طرح ان کے زمانہ میں بھی برقرار رہے گا اور رسول اللہ کے اختیار کیے ہوئے طریقہ کے خلاف وہ اس میں کسی طرح کا تصرف نہیں کریں گے، اگرچہ ان کو اس کے لیے جگر گوشہ رسول کی ناخوشی ہی کیوں نہ مول لینی پڑے۔

۲) حضرت ابوبکرؓ کی سیاست کا دوسرا اصول یہ تھا کہ تمام معاملات حکومت کو سچائی، امانت اور دیانت کے ساتھ انجام دیا جائے۔ جھوٹ، فریب، دو رُخے پن اور پراپیگنڈا بازی کے شیطانی ہتھیاروں سے محض اپنا اقتدار جمائے رکھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ وہ اقتدار حکومت کو خدا کی امانت تصور کرتے تھے اور اس امانت کا یہ حق سمجھتے تھے کہ اس کو پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اگر اپنا اقتدار جمائے رکھنے کی خاطر لوگوں کی آنکھوں میں جھوٹے پراپیگنڈے کے زور سے خاک جھونکنے کی کوشش کی گئی تو ممکن ہے اس سے کچھ دنوں کے لیے لوگوں کو دھوکے میں رکھا جا سکے، لیکن یہ درحقیقت اس امانت میں خیانت ہے جو اللہ کی طرف سے ہمارے سپرد کی گئی ہے۔

اپنی اس پالیسی کا اعلان انہوں نے اپنی پہلی تقریر کے دوسرے فقرے میں ان شاندار الفاظ میں فرمایا:

الصدق امانة والكذب خيانة!

معاملات کو سچائی کے ساتھ انجام دینا امانت داری ہے اور جھوٹ اور فریب کے ساتھ انجام دینا خیانت ہے!

ان الفاظ میں حضرت ابوبکرؓ نے اپنا اور اپنی حکومت کا جو سیاسی مسلک بتایا تھا اس کو انہوں نے اپنے دو سوا دو سال کے زمانہ حکومت میں جس خوبی کے ساتھ نبھایا ہے کوئی شخص بھی اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے خود بھی تمام داخلی اور خارجی معاملات میں اسی اصول کو پیش نظر رکھا اور ان کے عمال نے بھی اسی اصول پر عمل کیا۔ ان کی پوری سیاسی زندگی میں ایک مثال بھی اس بات کی پیش نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے کبھی جھوٹ کو اپنے کسی سیاسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا ہو۔ اور پھر وہ چیز بھی کیا تھی جس کے لیے حضرت ابوبکرؓ جھوٹ اور فریب کا سہارا لیتے۔ جس منصب خلافت پر وہ فائز تھے اس کو وہ کوئی طمع کی چیز نہیں سمجھتے تھے کہ اس کے لیے جھوٹ اور فریب کے ہتھکنڈے استعمال کریں۔ وہ اس کو کانٹوں کا تاج سمجھتے تھے اور اپنی خواہش کے بالکل خلاف، محض لوگوں کے اصرار کی وجہ سے، انہوں نے اس کو اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ اس سے اپنی بیزاری کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

'دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ بدبخت طبقہ حکمرانوں کا طبقہ ہے!'

اس منصب کو انہوں نے دنیا کے عیش اور دنیا کی عزت و شوکت کا ذریعہ نہیں بنایا تھا کہ ان چیزوں کے طمع میں اس منصب سے چمٹے رہنے کی کوشش کریں۔ خلیفہ ہونے سے پہلے ان کی زندگی کا جو معیار تھا خلیفہ ہونے کے بعد بھی اس میں سرمو فرق نہیں آیا۔ اور اگر فرق آیا تو اس فرق کی نوعیت یہ تھی کہ ان کا سابق معیار زندگی کچھ گر ہی گیا، یہ نہیں ہوا کہ وہ کچھ اونچا ہو گیا ہو۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے

سے پہلے وہ بالعموم شب میں مدینہ سے کچھ فاصلہ پر سخ میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ وہاں ان کا ایک چھوٹا سا دیہاتی مکان تھا۔ خلیفہ ہونے کے بعد تقریباً چھ مہینے تک یہی مکان ان کی قیام گاہ رہا۔ اس میں انہوں نے سرمو کسی تغیر و ترمیم کی ضرورت نہیں محسوس کی اور مدینہ سے سخ تک ان کی روزانہ کی آمد و رفت بالعموم پیدل ہوا کرتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد خلافت کی ذمہ داریوں کے تقاضا سے مجبور ہو کر جب مدینہ میں قیام شروع کیا تو یہاں بھی اپنے ہی ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کیا اور اس مکان میں بھی کسی قسم کی ترمیم و اصلاح کی ضرورت نہیں محسوس کی حالانکہ اب وہ ایک ایسے حکمران تھے جس کی فوجیں عرب سے نکل کر عراق اور شام کی تسخیر کے منصوبے باندھ رہی تھیں۔

ان کی معاش کا حال یہ تھا کہ خلیفہ ہونے کے کچھ دنوں تک بدستور کپڑے کی تجارت کرتے رہے اور یہ خیال تھا کہ اسی طرح وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی معاش خود اپنی محنت سے پیدا کر کے مسلمانوں کی خدمت حسبۃً للہ انجام دیتے رہیں گے لیکن جب خلافت کی ذمہ داریوں نے ان کا سارا وقت سونت لیا اور ان کے لیے اپنے تجارتی کاموں کے لیے وقت بچانا ناممکن ہو گیا تب انہوں نے مجبوراً اپنا اور اپنے متعلقین کا گزارہ بیت المال سے لینا منظور کیا۔ لیکن اس چیز پر ان کی طبیعت مطمئن نہیں ہوئی۔ چنانچہ وفات کے وقت انہوں نے اپنے وارثوں کو یہ وصیت کی کہ بیت المال سے انہوں نے اپنے اور اپنے بچوں کے گزارے کے لیے جو رقم لی ہے اس کے بدلے میں ان کی فلاں زمین بیت المال کے حوالہ کر دی جائے۔ ان کے اس ایثار کی اطلاع جب حضرت عمرؓ کو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ 'ابوبکرؓ نے اپنے بعد آنے والوں کو تھکا دیا۔' یعنی انہوں نے دین و ملت کی خدمت کی جو مثال قائم کی ہے اس کی پیروی کرنا دوسروں کے بس کی بات نہیں۔'

غور کا مقام ہے کہ جو شخص اس احساسِ ذمہ داری کے ساتھ حکومت کی

ذمہ داریاں سنبھالے گا اور اس بے لوثی و بے نفسی کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی کوشش کرے گا، اس کو کیا پڑی ہوئی ہے کہ وہ اپنی اس عبادت کو جھوٹ اور فریب سے آلودہ کرے اور وہ بھی اس ذلیل غرض کے لیے کہ اس منصب کا بالشرکت غیرے وہی مالک بنا رہے، کسی دوسرے کی طرف لوگوں کی نگاہ نہ اٹھے!

۳) تیسری چیز جو حضرت ابوبکرؓ نے اپنی حکومت میں پیش نظر رکھی وہ ایک ایسے نظام عدل و انصاف کا قیام تھا جو ہر قسم کے ناجائز اثرات کے دباؤ سے بالکل پاک اور آزاد ہو۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بے اثر ہو وہ بغیر کسی مزاحمت کے ان کی حکومت کے اندر اپنے حقوق کی حفاظت بھی کر سکے اور اپنے حقوق بھی حاصل کر سکے اور اس چیز کے لیے حقدار ہونے کے سوا کسی اور سند کی ضرورت نہ پیش آئے۔ اسی طرح ایک شخص خواہ کتنا ہی بااثر اور زورآور ہو، لیکن نہ وہ کسی شخص کے حق پر دست درازی کر سکے اور نہ حکومت سے اپنے واجبی حق سے ایک رتی برابر زیادہ حاصل کر سکے اور اگر وہ اس طرح کی جسارت کبھی کر بیٹھے تو اپنے تمام زور و اثر کے باوجود فوراً اپنے اس ظلم کی سزا بھگتے۔ اس پہلو سے غلام اور آقا، حاکم اور محکوم، امیر اور غریب میں حضرت ابوبکرؓ کسی قسم کا فرق کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ ایک طرف لوگوں کو ان کی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے اس بات کا پورا موقع دینا چاہتے تھے کہ کوئی شخص اپنی ذہانت، اپنے زور اور اپنے مال کو دوسروں کو دبانے اور ان کے حقوق کے تلف کرنے کے لیے نہ استعمال کر سکے۔ دوسری طرف وہ اگرچہ مصنوعی طور پر سارے ملک کے اندر صرف ایک ہی طبقہ قائم کرنے کے درپے نہیں تھے، لیکن وہ کسی ایک ہی طبقہ یا بعض طبقات کی حوصلہ افزائی کرنے اور ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر ظلم و تعدی کرنے کے مواقع دینے کو بھی تیار نہیں تھے۔ حصول معاش کی جدوجہد میں فرق مراتب فطری طور پر پایا جاتا ہے اس کے مٹانے کے لیے انہوں نے کوئی سکیم نہیں بنائی۔ کیونکہ ایسا کرنا وہ عقل اور فطرت کے خلاف سمجھتے تھے، لیکن

بیت المال سے جو وظائف انہوں نے مسلمانوں کے لیے جاری کیے اس میں ہر درجہ کے مسلمانوں کو بالکل مساوی رکھا اور جب ان سے یہ کہا گیا کہ لوگوں کی دینی خدمات کی بنا پر ان کے وظائف میں فرق ہونا چاہیے تو انہوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ 'دینی خدمات کا صلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ملے گا، اس کی بنا پر لوگوں کے معاش کے معاملہ میں ہم فرق مراتب کیوں روا رکھیں؟'

اپنے اس نصب العین کا اظہار بھی حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں کر دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ

'آپ کے اندر جو شخص بے اثر ہے وہ میرے نزدیک بااثر ہے، جب تک کہ اس کا حق اس کو نہ لوٹادوں اور آپ کے نزدیک جو شخص بااثر ہے وہ میرے نزدیک بے اثر ہے جب تک کہ میں اس سے حق وصول نہ کرلوں۔'

اور ان کا دوسوا دو سال کا زمانہ حکومت اس بات کی شہادت ہے کہ انہوں نے اپنی حکومت میں حق کے سوا کسی اور چیز کو بااثر ہونے کا موقع نہیں دیا۔

۴) چوتھی چیز جو حضرت ابوبکرؓ نے شروع ہی سے اپنی حکومت میں پیش نظر رکھی وہ بدکاری کا قلع قمع کرنا تھا۔ وہ قرآن مجید کی بدولت اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ جس قوم میں بدکاری عام ہو جاتی ہے اس پر خدا کی طرف سے ہمہ گیر تباہی آتی ہے جو اس قوم کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس رمز سے اچھی طرح باخبر ہونے کی وجہ سے انہوں نے شروع ہی سے اس امر کا اہتمام رکھا کہ یہ وبا ان کی قوم میں پھیلنے نہ پائے اور اس کے خلاف انہوں نے اپنے خطبہ میں اپنی قوم کو یاددہانی کر دی۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

'یاد رکھو کہ جب کسی قوم میں بدکاری عام ہو جاتی ہے تو اس پر تباہی بھی عام ہو جاتی ہے!'

حضرت ابوبکرؓ کے یہ الفاظ اس امر کو واضح کر رہے ہیں کہ وہ بدکاری کی روک تھام کو صرف افراد کے انفرادی تزکیہ کے ہی نقطہ نظر سے ضروری نہیں سمجھتے تھے، بلکہ قومی اور ملکی تحفظ کے نقطہ نظر سے اس کی روک تھام کو ناگزیر خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس چیز کے سبب سے ریاست کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی تھی اور پوری قوم کسی بڑی تباہی میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ اس وجہ سے وہ اس کام کو محض اصلاحی اداروں پر نہیں چھوڑ سکتے تھے، بلکہ اس کی روک تھام کے لیے تمام ضروری تدبیریں اختیار کرنا اپنا اور اپنی حکومت کا فرض سمجھتے تھے اور اس فرض کو اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی اہمیت قومی تحفظ کی دوسری تدبیروں کو دیتے تھے۔

۵) پانچویں چیز جس کو حضرت ابوبکرؓ نے اپنی سیاست کے ایک اہم اصول کی حیثیت سے پیش نظر رکھا وہ جہاد ہے۔ جہاد کے معنی ان اصولوں کو غالب کرنے کی کوشش کرنا ہے جن پر اسلامی قومیت یا اسلامی ریاست کی تعمیر ہوئی تھی۔ وہ ایک اصولی قومیت کے علم بردار اور ایک اصولی ریاست کے حکمران ہونے کی وجہ سے اجتماعیات کے اس رمز سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ کسی ایک مقام پر ٹھہرے رہ کر اپنی قومی ہستی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ ان کے لیے ٹھہرنا پیچھے ہٹنے یا موت کے ہم معنی ہے۔ ان کے قومی اور سیاسی بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ جن اصولوں پر ایمان لائے ہیں اور جن اصولوں پر انہوں نے اپنی اجتماعی و سیاسی زندگی کی تشکیل کی ہے ان کو غالب کرنے کے لیے برابر کوشش کرتے رہیں یہاں تک کہ زمین کے ایک ایک چپہ پر ان کو غالب اور حکمران بنا دیں۔ اس حقیقت کی طرف انہوں نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا:

'لا یدع قوم الجہاد فی سبیل اللہ الاضربھم اللہ بالذل'
جو قوم اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ترک کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر ذلت مسلط کر دیتا ہے۔

اس جہاد کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ ہوتے ہی دو بالکل تیار محاذ ملے۔ ایک ملک سے باہر رومیوں اور ایرانیوں کے مقابلہ میں اور دوسرا ملک کے اندر باغیوں اور مرتدوں کے مقابلہ میں۔ اور انہیں ان دونوں محاذوں پر بالکل ایک ہی وقت میں جنگ شروع کرنی پڑی۔ اب آیئے دیکھیے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان جنگوں میں کیا پالیسی رکھی اور اس پالیسی میں ان کو کس حد تک کامیابی ہوئی۔

جہاں تک عرب قوم کا تعلق تھا حضرت ابوبکرؓ کی پالیسی ان کے متعلق یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ ان کو جس دین اور جس سیاسی مرکز پر جمع کر گئے ہیں وہ پوری مضبوطی کے ساتھ ان کو اس پر قائم رکھیں۔ آپؐ کے وفات پانے کے بعد، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، بہت سے قبائل میں، جو ابھی پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں ہوئے تھے، ارتداد کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی طرح بہت سے قبائل نے مرکزی بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ تھے کہ اسلام کو اپنے دین کی حیثیت سے تو وہ مانتے ہیں لیکن مدینہ کی حکومت کے سیاسی اقتدار کو وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے پورے عزم کے ساتھ اس فتنہ کا مقابلہ کیا اور تلوار سے کام لے کر ان دونوں رجحانات کا خاتمہ کر دیا۔ نہ تو کسی عرب کو اسلام سے انحراف کی اجازت دی اور نہ ان میں سے کسی گروہ کو مدینہ کی مرکزی حکومت کے حلقۂ اطاعت سے باہر نکلنے دیا۔

اس سلسلہ میں انہوں نے تمام قبائل عرب کے نام جو اعلان کیا تھا وہ خود ان کی پالیسی کا بہترین نقیب ہے۔ اس لیے ہم اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کرتے ہیں:

"تم میں سے جو اسلام کا اقرار کرنے کے بعد، خدا سے بے پروائی، اس کے حکم سے ناواقفیت اور شیطان کی پیروی کے جوش میں، اسلام سے پھر گئے ہیں ان کے پھر جانے کی اطلاع مجھے ملی .... میں نے فلاں شخص کو مہاجرین و انصار اور تابعین کی ایک فوج کے ساتھ تمہاری طرف بھیجا ہے اور اس کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ کسی جماعت

سے اس وقت تک نہ جنگ کرے اور نہ اس کو قتل کرے جب تک اس کو خدا کی دعوت کی طرف پکار نہ لے۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں، اس کا اقرار کر لیں، اپنی مخالف اسلام حرکتوں سے باز آ جائیں، نیک کام کرنے لگ جائیں، ان سے درگزر کرے اور ان کی مدد کرے اور جو لوگ اپنی ضد پر قائم رہیں ان سے جنگ کرے اور جن پر قابو پالے ان پر ذرا رحم نہ کرے۔ ان کو آگ سے جلا دے (۱) ان کو ہر طرح سے قتل کرے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لے اور اسلام سے کم ان سے کوئی چیز قبول نہ کرے جو شخص اسلام کو قبول کرے گا وہ اس کے لیے بہتر ہے اور جو شخص اس سے اعراض کرے گا تو وہ خدا کے قابو سے باہر نہیں جا سکتا۔ میں نے اپنے منادی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ تمہاری ہر جماعت میں میرا یہ اعلان سنا دے۔"

اس اعلان میں حضرت ابوبکرؓ نے اہل عرب کی سیاسی و مذہبی وحدت کے جس عزم بالجزم کا اظہار کیا تھا اس کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے الگ الگ گیارہ لشکر ترتیب دیے اور ان کو اس ہدایت نامہ کے ساتھ عرب کے مختلف گوشوں میں بھیج دیا کہ:

من لم يجب داعي الله فليقتل وليقاتل حيث كان ولا يقبل منه الا الاسلام.

جو اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک نہ کہیں ان کو قتل کیا جائے اور ان سے جنگ کی جائے جہاں کہیں بھی وہ ہوں اور اسلام سے کم ان سے کوئی چیز قبول نہ کی جائے۔

عربوں کو ایک دین اور ایک سیاسی نظم کے تحت رکھنے کی یہ پالیسی حضرت ابوبکرؓ نے اخذ تو کی تھی قرآن کے احکام اور نبی ﷺ کی وصیتوں سے لیکن نہایت شدید مخالف حالات کے اندر جبکہ اپنے بھی اس پالیسی سے اختلاف کر رہے تھے اور دوسرے بھی اس پالیسی کے خلاف ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بغاوت کے لیے اٹھ

۱۔ بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ فتنۂ ارتداد کے زور کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ نے بعض لوگوں کو جلا دیے جانے کی سزا دی لیکن بعد میں وہ اس غلطی پر نادم ہوئے۔

کھڑے ہوئے تھے، اس پالیسی کو عملی شکل دینے کا کام تنہا حضرت ابوبکرؓ صدیق نے انجام دیا اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اس کارنامہ نے امت کو ایک بڑی خوفناک تباہی سے بچالیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان کے اس کارنامہ پر مندرجہ ذیل الفاظ میں داد دی جس سے اس کارنامہ کی پوری اہمیت واضح ہوتی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

'رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ہم ایسی آزمائش میں پڑ گئے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ابوبکرؓ کے ذریعہ ہم پر احسان نہ فرمایا ہوتا تو ہم اس آزمائش میں فنا ہو جاتے۔ ہمارا فیصلہ تو یہ تھا کہ ہم اونٹنی اور اونٹ کی خاطر خواہ مخواہ کی لڑائی مول نہ لیں اور دوسروں سے بے تعلق ہو کر خود اللہ کی بندگی کرتے رہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ابوبکرؓ کے دل کو اس سے (مانعین زکوٰۃ سے) جنگ کرنے پر جما دیا اور وہ ان کی تذلیل اور ان کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کے سوا کسی اور چیز پر راضی نہ ہوئے۔'

عرب کے اندر اپنی اس پالیسی کو پوری طرح کامیاب بنانے میں حضرت ابوبکرؓ کے دور حکومت کا تقریباً ایک پورا سال صرف ہو گیا۔ اس وجہ سے حضرت اسامہؓ کے لشکر کے بھیجنے کے سوا عرب کے باہر اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی کوئی قابل ذکر کوشش اس دوران میں وہ نہ کر سکے۔ اس ہنگامہ سے فارغ ہونے کے بعد البتہ انہوں نے یکسو ہو کر باہر کی دنیا کی طرف توجہ کی اور سب سے پہلے عراق پر لشکر کشی کا حکم دیا۔ اس لشکر کشی سے ان کا مقصد محض اپنی قوم کو دوسری قوم پر غالب کرنا اور حکمراں بنانا تھا یا دنیا کو عدل و انصاف کے ان اصولوں سے آشنا کرنا تھا جو قرآن کے ذریعہ سے ان کو ملے تھے؟ اس سوال کا بہترین جواب ان کی اس پالیسی سے ملتا ہے جو انہوں نے عراق کے مزارعین اور کسانوں کے بارہ میں، اس جنگ کے دوران میں، اختیار کرنے کا اپنے افسروں کو حکم دیا۔ انہوں نے اپنے تمام افسروں کو یہ ہدایت فرمائی کہ کسانوں کے ساتھ نہ تو کوئی بدسلوکی کی جائے، نہ ان میں سے کسی کو قتل کیا جائے اور نہ ان کے معاملہ میں کسی اور قسم کی زیادتی کی جائے کیونکہ یہ لوگ ایرانیوں کے ظلم کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں ان کی تکلیفیں دور ہونی

چاہئیں نہ کہ ان کی تکلیفوں میں کوئی اضافہ ہونا چاہیے۔

حضرت ابوبکرؓ کی مذکورہ بالا ہدایات اس امر کو صاف واضح کرتی ہیں کہ ان کی جنگ درحقیقت ظلم و ناانصافی کے اس نظام سے تھی جو ان کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ وہ اس نظام کو توڑ پھوڑ کر اس کی جگہ اس عادلانہ نظام کو برپا کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو اسلام نے ان کو دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے تمام مظلوم طبقات نے اسلامی فوجوں کی مزاحمت کرنے کے بجائے ان کا نہایت خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ صرف اس طبقہ نے ان کی مزاحمت کی جو اس باطل نظام سے ناجائز فائدے اٹھا رہا تھا اور یہ طبقہ اقلیت میں ہونے کے علاوہ اخلاقی پہلو سے بھی اس قدر بے وزن تھا کہ اسلامی افواج کے سیل رواں کے مقابل میں اس کی حیثیت پر کاہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کی پالیسی کے یہ اصول ان کی جس تقریر سے ماخوذ ہیں اب میں اس کو خود ان کے الفاظ میں یہاں پیش کیے دیتا ہوں اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ یہ میں نے جو کچھ لکھا ہے درحقیقت ان کی پہلی تقریر کی شرح ہے۔ ترتیب میں معمولی تصرف کے سوا کوئی ایسی بات میں نے ان کی طرف منسوب نہیں کی ہے جو انہوں نے نہ فرمائی ہو۔ انہوں نے فرمایا:

'اما بعد! اے لوگو، میں آپ کا امیر بنا دیا گیا ہوں، حالانکہ میں آپ سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجیے اور اگر میں غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجیے۔ راست بازی کے فرائض کو انجام دینا، امانت کو ادا کرنا اور جھوٹ اور فریب سے کام لینا خیانت ہے۔ آپ کے اندر جو بے اثر ہے وہ میرے نزدیک بااثر ہے یہاں تک کہ اس کا حق اس تک نہ لوٹا دوں (ان شاء اللہ!) اور جو آپ کے نزدیک بااثر ہے وہ میرے نزدیک بے اثر ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کر لوں (ان شاء اللہ!) کوئی قوم اللہ کی راہ میں جہاد کو نہیں چھوڑتی ہے مگر اللہ

اس کو ذلیل کر دیتا ہے اور کسی قوم میں بدکاری عام نہیں ہوتی ہے مگر اس پر اللہ کی طرف سے عام تباہی آجاتی ہے۔ میری اطاعت کیجیے جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں، اگر میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو پھر آپ کے اوپر میری اطاعت کی ذمہ داری نہیں ہے۔"

نظمِ قرآن

قرآن مجید کے اکثر طلبہ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات سے شیفتگی کے باوجود، بعض اوقات نظم قرآن کے بارہ میں مشتبہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے خیال میں مولانائے موصوف اس دعویٰ میں بالکل منفرد ہیں، علمائے عرب و عجم میں سے جن لوگوں کو معارف قرآن پر غور کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، کوئی شخص بھی ان کا ہم نوا نہیں ہے۔ اگر قرآن مجید میں نظم ہوتا تو یہ راز ان لوگوں سے مخفی نہ رہتا جن کی دیدہ وری اور نکتہ رسی پر تمام امت کا اتفاق ہے۔ پھر کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ سلف کی نگاہ کشف و تحقیق جس حقیقت کا سراغ لگانے سے عاجز رہی، اس کا دروازہ ایک ایسے شخص نے کھول دیا جو ان آخری صدیوں میں پیدا ہوا جبکہ علم و تحقیق کی تمام روشنیاں گل ہو چکی ہیں۔ اس لیے درحقیقت ائمہ سلف کے خلاف جو شخص نظم قرآن کا دعویٰ کرتا ہے وہ ایک ایسی بات کا دعویٰ کرتا ہے جس کے خلاف گویا تمام سلف کا اجماع ہے۔

اس باب میں ان لوگوں کی سب سے بڑی عقلی و نقلی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید بالکل کھلی ہوئی کتاب ہے۔ اس کے سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے اپنا نام 'کتاب مبین'، 'سراج منیر'، اور 'نور' بتایا ہے اور خداوند تعالیٰ نے اس کی تعریف ایسے لفظوں میں کی ہے جن سے اس کا سہل اور آسان ہونا نہایت واضح

لفظوں میں ثابت ہوتا ہے مثلاً فرمایا:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ○ •

ہم نے قرآن مجید کو یاددہانی کے لیے آسان بنایا پس ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں متعدد ہیں۔

پس اگر قرآن مجید میں نظم ہوتا جیسا کہ علامہ فراہیؒ کا دعویٰ ہے، تو لازماً یہ نظم بھی نہایت سہل الحصول ہوتا اور جس طرح ہر عربی دان بغیر کسی خاص کاوش کے اس کی آیتوں کا ترجمہ سمجھ لیتا ہے، اسی طرح ہر طالب نظم بادنیٰ تامل اس کے نظم کا بھی سراغ لگا لیتا، لیکن صورت واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ نظم کی راہ نہایت دشوار ہے۔ سلف کی آہنی ہمتیں بھی اس کی مشکلات پر قابو نہ پا سکیں اور دنیائے علم وتحقیق کے تمام فاتحین اس قلعہ کو سخر کرنے سے عاجز رہے۔ اس لیے یہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نظم کی کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مجاز ہے جس کے پیچھے کسی لطائف پسند اور موشگاف طبیعت نے اپنے تئیں محض زورآزمائی اور جولانی کے شوق میں ڈال دیا ہے اور میں اس طرح ایک لایعنی سعی میں، جو شریعت اسلام میں ممنوع ہے الجھ کر رہ گئی ہے۔

استاد مرحوم نے مخصوص اس موضوع پر 'دلائل النظام' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے اس خدشہ سے تعرض کیا ہے اور تمام دعاوی پر اپنے اصول کے مطابق، نہایت محکم اور قطعی دلیلیں قائم کی ہیں۔ لیکن اس قسم کے اہم مباحث پر اس مختصر مضمون میں اطمینان بخش تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اس موضوع سے متعلق چند باتیں، جو استاد مرحوم کے خطبات درس میں سے حافظہ میں محفوظ رہ گئی ہیں، اختصار کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔

یہ بات اصول کی حیثیت سے پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس باب میں ہمارا اصلی اعتماد

نصِ قرآن پر ہے۔ وہ بہتر سے بہتر صورت میں منظم ہے۔ یہ نظم، بعض مخصوص مقامات کے علاوہ، ایک صاحب نظر کے لیے ہر جگہ بالکل واضح ہے۔ جن مقامات پر حجاب ہے وہاں ہم قرآن کے بجائے اپنی نگاہ کو متہم کرتے ہیں۔ نظم قرآن پر ہمارا عقیدہ خارجی دلائل پر قائم نہیں ہے، بلکہ اس کی بو ہم نے خود قرآن میں سونگھی اور یہی ہمارے پہلے قدم کی محرک ہوئی۔

لیکن ان تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ قرآن کے علاوہ جو بعض خارجی دلائل ہیں، وہ مضطرب طبیعتوں کے اطمینان کے لیے ذیل میں اجمالاً پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ علامہ فراہیؒ دعوئے نظم میں منفرد نہیں ہیں، بلکہ علمائے سلف کی ایک جماعت کا پہلے سے یہ مسلک رہا ہے، اور اس پر انہوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں:

علامہ ابوجعفر بن زبیر شیخ ابوحیان نے نظم پر ایک خاص کتاب لکھی اور اس کا نام البرھان فی مناسبۃ ترتیب سور القران رکھا۔ اور ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین البقاعی کی تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآی والسور اسی اصول پر لکھی گئی ہے

اس کے بعد انہوں نے خود اپنی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے جس میں نظام کے علاوہ وجوہ اعجاز پر بھی بحث کی ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

ترتیب ونظم کا علم ایک اعلیٰ علم ہے، لیکن اس کے اشکال کی وجہ سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔ امام فخرالدین رازی کو اس کے ساتھ سب سے زیادہ اعتنا رہا اور ان کا قول ہے کہ لطائف قرآن کا اصلی خزانہ نظم وترتیب میں چھپا ہوا ہے

امام رازیؒ آیت وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا الخ (حم السجدہ ۴۴)

کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اس آیت کے سبب نزول کے بارہ میں لوگ روایت کرتے ہیں کہ کفار نے ازراہِ شرارت کہا کہ اگر قرآن کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کو جواب دیا ہے، لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتاب الٰہی پر سخت ظلم ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن مجید میں ایسی آیتیں اتری ہیں جن میں باہم کوئی تعلق نہیں ہے، حالانکہ یہ قرآن مجید پر سب سے بڑا طعن ہے۔ ایسی صورت میں قرآن مجید کو معجزہ ماننا تو الگ رہا، اس کو ایک مرتب و منظم کتاب کہنا بھی مشکل ہے۔ صحیح مسلک میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے آخر تک بالکل مربوط کلام ہے۔ (اس کے بعد انہوں نے تقریباً اٹھارہ سطروں میں سورہ کی اجمالی تفسیر لکھی ہے۔ پھر لکھتے ہیں) ہر منصف، جو انکارِ حق کا عادی نہیں ہے تسلیم کرے گا کہ اگر سورہ کی تفسیر یوں کی جائے جس طرح ہم نے لکھی ہے تو پوری سورہ ایک ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی اور اس کی تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کریں گی۔ (دیباچہ تفسیر نظام القرآن فراہی)

اس سلسلہ کی ایک اہم شخصیت، علامہ مخدوم مہائمی ہیں۔ ان کی تفسیر، آیات کی باہمی مناسبت کے بیان میں ہے، اور اس چیز کی ان کی نظر میں اس درجہ وقعت تھی کہ اپنی کتاب کا نام انہوں نے **تبصیر الرحمان و تیسیر المنان** رکھا۔

اسی عقیدہ کے ایک بزرگ علامہ ولی الدین ملوی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول باقتضائے حالات جستہ جستہ ہوا ہے، اس لیے آیات میں باہمی تعلق نہیں تلاش کرنا چاہیے، ان کو سخت دھوکا ہوا۔ بلاشبہ قرآن مجید کا نزول حسب حالات جستہ جستہ ہوا لیکن اس کی ترتیب میں نہایت گہری حکمت مضمر ہے۔

یہ وہ علمائے امت ہیں جنہوں نے نظم کی بو سونگھی ہے۔ ان کے اقوال پیش نظر رکھیے۔ بعینہٖ یہی حال علامہ ابن جریرؒ وغیرہ کا ہے۔ باوجودیکہ ان کا خاص مقصد صرف روایاتِ سلف کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں جمع کر دینا ہے، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ تمام اقوالِ سلف میں سے اس قول کو ترجیح دے دیتے ہیں جو نظم کلام اور سیاق و سباق سے زیادہ لگاؤ رکھتا ہے اور دوسری روایات جو اس سے مانع ہوتی ہیں، ان کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ بالکل یہی طریقہ علامہ زمخشریؒ کا ہے۔ وہ بھی تمام موانع سے بے پروا ہو کر صرف نظم کا تتبع کرتے ہیں۔ اور اگر بعض جگہ حمایت اعتزال کے جوش میں وہ آگے نہ بڑھ جاتے تو میرا خیال ہے کہ ان کی کتاب اس فن کے مبتدیوں کے لیے نہایت مفید ہوتی۔ یہی بات حضرت امام رازیؒ کی تفسیر میں بھی ہے وہ اشعریت کے علم برداروں میں ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی حمایت کے جوش میں کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔

اوپر جن مفسرین کا تذکرہ ہوا ہے، وہی ائمہ تفاسیر ہیں اور انہی کی کتابیں اس فن کی امہات ہیں۔ وہ سب لوگ نظم کو تسلیم کرتے ہیں لیکن بعض وجوہ سے، جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں، یہ لوگ نظم کو پوری طرح بے نقاب نہ کر سکے۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب **الفوز الکبیر** میں نظم کا انکار کیا ہے تو یہ بات بھی کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ ایک ایسے قول کی بنا پر جس کی تاویل اس کے علاوہ بھی آسانی سے ہو سکتی ہے جو باول وہلہ ذہن کے سامنے آتی ہے، میں ایسے بلند رتبہ امام سے بدگمانی نہیں پسند کرتا۔ علماء کی جماعت میں ٹھیک بات قبول کرنے میں وہ سب سے آگے ہیں، اپنی تصنیفات خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ میں شریعت کے جو اسرار و حکم انہوں نے بیان کیے ہیں، وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ معرفت نظم میں ان کا مقام بہت بلند تھا پھر ابن العربی کے ساتھ ان کو جو حسن ظن ہے وہ سب کو معلوم ہے، اور نظم کے بارے میں ابن العربی اہل علم سے پوشیدہ نہیں اس لیے ضروری ہے کہ اس بارہ میں ان کے کلام کی ایسی تاویل کی جائے جو ان کی شان اور ان کے رجحانات کے مطابق

ہو۔ اور یہ بات آسانی سے ممکن ہے۔ اس باب میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کے مختلف پہلو ہیں۔ اگر ہم کو ایک غیر متعلق بحث میں پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم تفصیل سے دکھاتے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

جو علماء نظم کے منکر ہیں وہ بھی بادلِ ناخواستہ منکر ہیں، کیونکہ اس خیال کی بنیاد محض اس بات پر ہے کہ قرآن مجید حالات کے لحاظ سے جستہ جستہ اترا ہے۔ اس بنیاد کا ضعف بالکل ظاہر ہے کیونکہ بعض طوال اور اکثر قصار پوری پوری ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی ہیں۔ نیز بعض سورتوں کا نظم بالکل واضح ہے اور احادیث سے ثابت ہے کہ آیات کی ترتیب میں آنحضرت ﷺ مناسبت کا لحاظ فرماتے تھے۔ انہی وجوہ کی بنا پر امام رازیؒ نے وہ بات کہی ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور سورہ انعام کی تفسیر میں انہوں نے اپنے خدشہ کو بالکل صاف صاف ظاہر کردیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ نظم قرآن کے منکر علماء کا انکار کرنا بھی ان کی دینی غیرت پر مبنی تھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ نظم کا دعویٰ کرنا اور پھر یہ اعتراف کرنا کہ وہ اکثر یا بعض سورتوں میں مخفی ہے قرآن کے حق میں مضر ہے۔ اس سے معاندین کو اس پاک کتاب پر نکتہ چینی کی جرأت ہوگی۔ اس خیال کی بنا پر وہ ایک ایسی بات کہہ گئے جس کا ضرر اس کے فائدہ سے زیادہ ہے لیکن اعمال کا مدار نیت پر ہے، انشاء اللہ وہ آخرت میں اپنے حسنِ نیت کا اچھا صلہ پائیں گے۔

۳) جن لوگوں نے جمع و ترتیب قرآن سے متعلق روایات پر غور کیا ہے، وہ واقف ہیں کہ قرآن اگرچہ جستہ جستہ نازل ہوا ہے لیکن آیات کی ترتیب آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق ہوئی ہے۔ آپ آیات کی جگہ سورتوں میں متعین فرما دیتے تھے اور کاتبین وحی ان کو ان کی متعینہ جگہوں میں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ترتیب آیات کے توقیفی ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ اگر قرآن مجید میں نظم نہ ہوتا، جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے، تو آنحضرت ﷺ اس قسم کا حکم کیوں دیتے؟ اور اگر کوئی عظیم الشان حکمت داعی نہ ہوتی تو نزولی ترتیب کو چھوڑ کر جو سب سے زیادہ قابلِ لحاظ تھی، ایک نئی

ترکیب کیوں اختیار فرماتے؟ بہرحال جب ہر آیت کے لیے ایک مخصوص جگہ متعین ہوئی تو لازماً اس تعین کے سبب پر غور کرنا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ بجز رعایت نظم کے اس کا کوئی اور سبب نہیں بتایا جا سکتا۔ اس لیے جو لوگ ایک سورۃ کے مضامین میں بھی ربط و نظام کے قائل نہیں ہیں، ان کا خیال صحت پر مبنی نہیں۔ علامہ ملویؒ نے جن کا قول اوپر گزر چکا ہے، اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ہمارے خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جن آیات میں کسی سابق حکم کی تخفیف وارد ہوئی ہے، ان کو ہمیشہ ماسبق حکم کے پہلو میں جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً آیت اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا الخ (انفال ۶۶) ماسبق آیت کے بہت بعد نازل ہوئی ہے لیکن چونکہ اس میں اسی ماسبق حکم کی تخفیف تھی اس لیے اس کو اسی کے بعد رکھا گیا۔ اسی طرح سورۂ مزمل کی آخری آیت ایک مدت کے بعد نازل ہوئی ہے، اس کو بھی پہلے حکم کے بعد ہی رکھا گیا۔ یہی حال آیت وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ الخ (بقرہ ۲۴۰) اور آیت اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الخ (بقرہ ۱۸۷) کا ہے۔ بعض جگہ جہاں اس قاعدہ کے خلاف ہوا ہے اس کے اسباب دوسرے ہیں۔ ایسے مواقع پر زیادہ تر عمود یا بعض دوسرے مصالح کی رعایت کی گئی ہے، جو اس قسم کی تبدیلی کے مقتضی ہوتے ہیں۔ لیکن جب تک کوئی شخص ان تغیرات کو سمجھ لینے کا عادی نہ ہو جائے، وہ جزئیات سے اصول تک نہیں پہنچ سکتا۔

۴) علیحدہ علیحدہ سورتوں کا قائم کرنا اور ان کا چھوٹا بڑا ہونا بھی نظم کی دلیل ہے۔ اگر قرآن مجید غیر منظم ہے تو الگ الگ سورتیں قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے کہ سورتوں کی تحدید وحیِ الٰہی سے ہوئی ہے، کوئی عقلی یا نقلی دلیل اس کے خلاف نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے ان کے پاس قرآن مجید یا حدیث صحیح کی کوئی سند نہیں ہے، اس لیے ان کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ ہر صاحب عقل محسوس کرتا ہے کہ الگ الگ سورتیں قائم کرنا، اور ان کا مختلف المقدار

ہونا اس امر کا صاف ثبوت ہے کہ سورتوں کے مضامین الگ الگ ہیں۔ نیز ہر سورت کسی مخصوص وحدانیت کی حامل ہے جو اس کو دوسری سورتوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو جامعین قرآن آیتوں کے مجموعے لیتے اور برابر برابر سورتوں میں رکھتے چلے جاتے۔ تسہیل تلاوت، حفظ قرآن اور دوسرے مقاصد کے لیے یہ ترتیب اور بھی آسان ہوتی۔

۵) سورتوں کی موجودہ ترتیب جو بالاتفاق تمام مصاحف میں پائی جاتی ہے، وجود نظم کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں سورتوں کی ترتیب میں جو تقدیم و تاخیر ہے وہ بلا سبب نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے سورتوں کی مقدار سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز تھی لیکن اس کا لحاظ ہر شخص کو معلوم ہے، قرآن مجید میں بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ ترتیب میں سورۂ فاتحہ کو بقرہ سے پہلے جگہ دی گئی ہے اور سورۂ کوثر جو قرآن کی سب سے چھوٹی سورہ ہے، متعدد اس سے بڑی سورتوں سے پہلے رکھی گئی ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ یہ ترتیب نزولی نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس تقدیم و تاخیر کا کوئی اور سبب تلاش کیا جائے۔ ہمارے نزدیک رعایت نظم کے سوا اس کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہؓ کی رائے سے ہوئی ہے، پیغمبر ﷺ کے حکم سے نہیں ہوئی ہے۔ لیکن یہ بات قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے بالکل خلاف ہے۔ استاذ امامؒ نے اپنی کتاب 'تاریخ القرآن' میں اس کی مدلل تردید کی ہے، اس لیے یہاں اس پر مفصل بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ سورتوں کی ترتیب صحابہؓ کی رائے سے ہوئی، اس سے یہ کیونکر ثابت ہو گیا کہ انہوں نے نظم کی کوئی پروا نہیں کی اور بلالحاظ ربط و تعلق سورتوں کو جمع کر دیا۔ ہر شخص کو معلوم ہے کہ سورہ توبہ کے بارہ میں جب صحابہؓ میں اختلاف ہوا کہ اس کو کس جگہ رکھا جائے تو یہ گتھی نظم ہی کی مدد سے سلجھی، اور معنوی مناسبت کی رعایت سے اس کو سورۂ انفال

کے بعد جگہ دی گئی۔ یہ بات عام خیال کے لحاظ سے کہی گئی ہے، ورنہ ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں، سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے اور قرآن مجید ہمارے اس دعوے پر حجت ہے۔

سورۂ قیامہ میں ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ

بیشک ہمارے اوپر ہے اس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھنا، پس جب ہم پڑھ چکیں تو اس پڑھے ہوئے کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے اوپر ہے اس کی تشریح کرنا۔

استاذ امامؒ مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اس آیت میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید عہد نبوت ہی میں جمع ہو کر آنحضرت ﷺ کو ایک خاص ترتیب سے سنا دیا جائے گا، کیونکہ یہ وعدہ اگر آپؐ کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس جمع و ترتیب کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا۔ دوسری یہ کہ اس قراءت ثانیہ کے مطابق جو جمع کے بعد ہوئی، آپ کو قرآن مجید سنانے کا حکم ہوا اور عقلاً و نقلاً ناممکن ہے کہ پیغمبر کے پاس کوئی حکم آئے اور وہ اس کو امت تک نہ پہنچائے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے؟ يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ، اس حکم عام کا تقاضا ہے کہ پیغمبر ﷺ نے اس قراءت اخیرہ کے مطابق، جو لوح محفوظ میں ہے، امت کو قرآن مجید کی تعلیم کی ہو اور آخری قرأت کا اصل کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو تعمیم و تخصیص اور تکمیل و تخفیف چاہی وہ بھی فرما دی۔ قرآن مجید ان تینوں مراحل سے عہد نبوت ہی میں گزر گیا، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے تھے اور یہ بغیر اس کے ناممکن ہے کہ قرآن مجید ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپ کو سنایا

گیا ہو۔ اسی ترتیب کے مطابق صحابہؓ نے آپؐ سے قرآن مجید سیکھا، آپؐ آیات کو مناسب جگہوں میں رکھنے کا حکم دیتے تھے اور اس حکم کی تعمیل کی جاتی تھی۔ اگر کوئی تشریحی آیت اترتی تو وہ مناسب جگہ میں شامل کر دی جاتی۔ اس طرح جب پورا قرآن مجید مکمل ہو گیا تو حضرت جبریلؑ نے جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے، آخری مرتبہ پورا قرآن مجید سنایا..... اس حقیقت کے معلوم ہو جانے کے بعد نظام کی بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔" (تفسیر سورہ قیامہ مصنفہ فراہیؒ)

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی جو ترتیب ہمارے زمانہ میں موجود ہے یہ وحیٔ الٰہی کے مطابق عہد نبوت ہی میں مکمل ہو چکی تھی لیکن چونکہ اس عہد کی دنیا لوازم تمدن سے محروم تھی، پڑھنا لکھنا شاذ و نادر اور کاغذ وغیرہ ناپید تھا، اس لیے ایک عرصہ تک قرآن مجید کھجور کے پتوں، ہڈیوں، تختیوں اور حفاظ کے سینوں ہی میں رہا۔ حضرت ابوبکرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے منتشر آیات کو ایک مصحف میں محفوظ کیا اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی متعدد نقلیں کرا کے تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں۔

۶) چھٹا پہلو یہ ہے کہ کسی کلام کی اصلی روح نظم ہے۔ اس کے الگ کر دینے کے بعد صرف یہی نہیں کہ کلام اپنی بعض خوبیوں سے محروم ہو جائے گا بلکہ پورا کلام بالکل مہمل اور بے معنی ہو جائے گا۔ جو کلام نظم سے خالی ہو وہ از قسم خرافات ہے، کوئی عاقل اپنا ایک لمحہ بھی اس پر ضائع کرنا پسند نہیں کرے گا۔ قرآن مجید کی نسبت تمام دنیا کو معلوم ہے کہ اس نے عربوں کو تحدی کی اور عرب، باوجودیکہ ان کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا، اس کے جواب میں ایک چھوٹی سے چھوٹی سورہ بھی نہ پیش کر سکے قرآن مجید کی اس جلالت کے لحاظ سے اس میں سب سے پہلے جو چیز ہونی چاہیے وہ نظم ہے، کیونکہ ایک ایسی کتاب جو سب سے زیادہ منتشر اور بے نظم خیال کی جاتی ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی قابل تحدی نہیں ہو سکتی۔ یہیں سے ایک اور نکتہ کی طرف رہبری ہوتی ہے کہ قرآن مجید نے جہاں کہیں تحدی کی ہے، اپنے مثل ایک کتاب، یا

دس سورتوں یا بحدیث مِنْ مِثْلِهٖ یا کم از کم ایک سورت کا مطالبہ کیا ہے۔ ایک آیت سے تحدی نہیں کی ہے۔ کیونکہ ایک مفرد آیت کتنی ہی عظیم الشان علم و حکمت کی حامل کیوں نہ ہو، تحدی کے قابل نہیں ہو سکتی۔ متفرق آیات کی مثال قیمتی موتیوں یا شیریں الفاظ کی ہے جن کو کسی صفحہ پر آپ نے بکھیر دیا ہو، ان کے آب و رنگ سے تم محظوظ ہو سکتے ہو لیکن ان کو ایسے شخص کے سامنے مقابلے کے لیے پیش نہیں کر سکتے جس نے اپنے قیمتی موتیوں کو کسی رشتہ میں اور اپنے شیریں الفاظ کو کسی عمدہ نظم یا نثر میں پرویا ہو، کیونکہ اس نے ان کے ذاتی آب و رنگ پر نظم و ترتیب کا اضافہ کر کے ان کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ اسی وجہ سے عرب و عجم کے تمام علمائے بلاغت کا اتفاق ہے کہ کلام کی اصلی روح نظم ہے، اسی سے اس کی تمام خوبیاں ظہور میں آتی ہیں۔ اگر کسی شخص کو اس کے باور کرنے میں تامل ہو، وہ کسی بلیغ سے بلیغ خطیب کا کوئی کلام لے اور اس کو اس کے نظم کے شیرازہ سے الگ کر دے۔ وہ دیکھے گا کہ کلام کا تمام حسن و جمال دفعۃً برباد ہو گیا۔ پس ایک پوری سورۃ، جو ایک مخصوص وحدانیت کی حامل ہے، اپنے اندر دو حسن رکھتی ہے۔ ایک اس کے اجزاء کا حسن ہے، دوسرا نظم کا، نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ۔

۷) اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ اور قرآن مجید کو شعر و شاعری سے منزہ قرار دیا ہے۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ۔

اور ہم نے اس کو شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور نہ یہ چیز اس کے لیے زیبا ہے۔

اور دوسری جگہ ہے

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ

اور یہ قرآن مجید کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔

اور شاعروں کا ایک بہت بڑا عیب یہ بتایا ہے کہ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ، وہ ہر

وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں، یعنی جو خیال سامنے آگیا، بے سوچے سمجھے اسی سے مشغول ہو گئے۔ اس قسم کی بے تکی ہرزہ سرائی شعراء کی خصوصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کو اس عیب سے منزہ قرار دیا ہے، اس لیے قرآن مجید کو غیر منظم خیال کرنا کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو 'ھیمان' سے تعبیر کیا ہے، اقتضاب یعنی بے نظمی اسی کی ایک شاخ ہے۔ یہیں سے ان لوگوں کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے، جو قرآن مجید کو اس بنا پر بے نظم خیال کرتے ہیں کہ وہ شعرائے عرب کے کلام کے انداز پر ہے، کیونکہ قرآن مجید نے ان کے کلام کی صرف خوبیاں لی ہیں، اس کے معائب سے آلودہ نہیں ہوا ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اہل عرب کا کلام صرف شاعری ہی نہیں تھا۔ یہ ان کے کلام کی صرف ایک قسم ہے اور شرفائے عرب عموماً اس کو وقار کے منافی سمجھ کر اس سے احتراز کرتے تھے۔ ان کے شوق و رغبت کی اصلی چیز خطبات ہوتے تھے اور جو لوگ ان کے کلام کی اس صنف سے واقف ہیں، وہ اعتراف کریں گے کہ خطبات عرب جملہ محاسن کلام کے حامل ہوتے تھے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان کا بیشتر حصہ مٹ گیا اور بہت تھوڑا حصہ آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

۸) قرآن مجید کی بعض سورتوں میں ترجیعات ہیں۔ مثلاً سورۂ رحمان میں فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ والی آیت بار بار دہرائی گئی ہے۔ اسی طرح سورہ مرسلات میں وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ اور سورہ شعراء میں اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً الآیہ کی تکرار ہے اسی طرح بعض سورتوں میں ہر چند آیات کے بعد کوئی آیت مطلع یا مقطع کی حیثیت سے بار بار آتی ہے مثلاً سورۂ نور میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ "وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ" تین مرتبہ وارد ہے۔ تعجب ہے کہ ان سورتوں کے اجزاء کو کیونکر بے نظم کہا جا سکتا ہے جبکہ باعتبار ترجیع یہ بالکل متحد معلوم ہوتے ہیں۔ اس باب کا ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت میں کلام بار بار عمود یا مرکز کی طرف لوٹتا ہے، لیکن مقام کی رعایت سے الفاظ میں ایسی تبدیلی یا کمی بیشی ہو جاتی ہے کہ مبتدی، جو قرآن مجید کی ان اداؤں سے ناآشنا ہے، سر رشتہ نظم کو نہیں سنبھال سکتا بلکہ اگر مجھ پر غلو کا الزام نہ لگایا

جائے تو یہ کہنے کی جرأت کی جا سکتی ہے کہ ترجیعات تمام قرآن میں پائی جاتی ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں: لفظی اور معنوی۔ لفظی کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، معنوی ترجیعات کے متعلق یہ بات خیال میں رکھنی چاہیے کہ معرفت نظم کا زیادہ تر نظام انہی پر ہے، لیکن بغیر ممارست ان کا تتبع مشکل ہے۔ یہاں یہ بات بھی ظاہر کر دینی چاہیے کہ مجھ کو نظم کا یقین سب سے زیادہ ترجیعات ہی کی رہنمائی سے ہوا۔ جب میں ترجیعات والی سورتوں کی تلاوت کرتا ہوں، ظاہری اقتضاب کے باوجود، مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی تیر انداز نے اپنے ترکش کے تمام تیر اپنے سامنے پھیلا دیے ہیں، اور وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک مخصوص نشانہ کی طرف ان میں سے ایک تیر اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔

۹) قرآن مجید میں قوافی کی رعایت کی گئی ہے اس سے بھی نظم کا ثبوت ملتا ہے جن لوگوں نے بھی اس پہلو سے قرآن مجید پر غور کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کی مدد سے نظم کے کن نکتوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہاں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے، البتہ اتنی بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہونے کے باوجود اس میں قافیہ کی رعایت اقتضاب کے بالکل منافی ہے۔ کیونکہ قافیہ کا ظاہری اقتضا ارتباط و تعلق ہے اور کوئی عقل مند انسان ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید کے جستہ جستہ نازل ہونے کی وجہ سے اس کے اجزاء میں کوئی نظم نہ پیدا ہو سکا، لیکن اللہ تعالیٰ یا پیغمبر ﷺ نے اس کے نغمہ یا سجع کی حفاظت کے خیال سے اس کے قوافی کی رعایت باقی رکھی۔ سجع و قافیہ کلام میں مقصود بالذات چیزیں نہیں ہیں کہ ان کے لیے اس درجہ اہتمام کیا جائے، اس لیے اگر قرآن مجید کا جستہ جستہ نازل ہونا فساد نظم کا باعث ہوتا، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، تو اس کا سب سے زیادہ اثر قوافی پر پڑتا، حالانکہ وہ تمام سورتوں میں بالکل محفوظ ہیں۔

(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ — جولائی ۱۹۳۶)

مقالہ ۳

مولانا حمیدالدین فراہیؒ اور علم حدیث

رسالہ طلوع اسلام (دہلی) نے اپنی دسمبر ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں ایک مضمون بعنوان شاہ ولی اللہ اور قرآن و حدیث شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں ایک جگہ ضمناً مولانا حمیدالدین فراہیؒ کا بھی ذکر آیا ہے۔ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی ایک روایت اوررسالہ البیان کے شائع کیے ہوئے بعض اقتباسات کی بنا پر اس میں مولانا مرحوم کی طرف علم حدیث کے متعلق بعض ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جن سے سخت غلط فہمی پھیل سکتی ہے۔ یہ فتنہ دراصل رسالہ البیان. امرتسر نے اٹھایا تھا اور دلیل میں مولانا عبیداللہ صاحب کی روایت کے علاوہ، مولانا حمیدالدین مرحوم کی کتاب "فاتحہ" نظام القرآن" سے بعض غلط سلط اقتباسات پیش کیے تھے۔ یہ مضمون ہماری نظر سے گزر چکا تھا لیکن ہم نے اس کی تردید کو کچھ ضروری نہیں سمجھا کہ اس کا مسلک اور مبلغ علم، اہل علم کو اچھی طرح معلوم ہے، لوگ خود غث وسمین میں امتیاز کرلیں گے۔ نیز مولانا کا مسلک و مذہب بھی اب لوگوں سے مخفی نہیں رہا ہے۔ لیکن وہی فتنہ البیان کے حوالہ سے طلوع اسلام کی دسمبر کی اشاعت میں موجود ہے اور اس رسالہ نے اس کو کچھ مزید آب و رنگ دے کر چمکانے کی کوشش کی ہے۔ مسلک ومشرب کے اعتبار سے یہ رسالہ بھی البیان ہی کی ملت سے تعلق رکھتا ہے، اور اراجیف کی اشاعت میں شاید چند قدم اس سے بھی آگے ہے، اس لیے اس کی تردید بھی چنداں ضروری نہیں تھی۔ لیکن زمانہ فتنہ کا ہے، لوگ کسی چیز کے نقل و روایت

کرنے اور اس کے باور کرنے میں اسلامی اصول اخلاق کی ذمہ داریوں سے بالکل بے پروا ہو گئے ہیں، نہ نقل و روایت کرنے والے آخرت کی باز پرس کا خیال کرتے اور نہ ان کو قبول کرنے والے کسی ذمہ داری اور خدا ترسی کا احساس کرتے ہیں اس وجہ سے جی ڈرتا ہے کہ مبادا یہ فتنہ برگ و بار پیدا کرے اور جس سہل انگاری کے ساتھ طلوع اسلام نے اس کو اپنے صفحات میں نقل کرلیا ہے اسی بے پروائی کے ساتھ بعض لوگ اس کو باور کرنا شروع کردیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ مولانا مرحوم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ان سے بدگمان ہوں گے اور جو ان کے خیالات وتحقیقات کی عزت کرتے ہیں وہ حدیث کے متعلق سوءِ ظن میں مبتلا ہوں گے، اور ان میں سے کوئی بات بھی اپنے نتائج کے اعتبار سے اچھی نہیں ہے۔ اور دوسری تو انتہائی محرومی و بدقسمتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

طلوع اسلام نے رسالہ البیان کے پیش کیے ہوئے اقتباسات شکریہ کے ساتھ اپنے صفحات میں درج کیے ہیں مگر ہم کو ان دونوں رسالوں سے بعض شکایتیں ہیں:

۱) مولانا مرحوم نے **مقدمہ نظام القرآن** میں حدیث پر جو کچھ لکھا ہے، اس کا تعلق محض روایات تفسیر سے ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کتاب میں وہ اسی حیثیت سے حدیث پر بحث کرسکتے تھے۔ یہ بات ان کے بیانات سے بالکل صاف تھی، لیکن البیان اور طلوع اسلام نے اس کو پورے ذخیرۂ حدیث پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے، جو راستی اور دیانتداری کے بالکل خلاف ہے۔

۲) البیان نے جو اقتباسات دیے ہیں وہ بیشتر بالکل مسخ اور غلط ہیں۔ یہ غلطی اگر عربی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے تو اس کی جسارت قابل افسوس ہے کہ اس نے ایک ایسے کام میں ہاتھ ڈالا جس کی اہلیت اس میں موجود نہیں تھی اور اس نے ایک ایسی معصیت کا ارتکاب کیا جو افتاء بلا علم کے تحت آتی ہے اور جس پر سخت وعید ہے۔ اور اگر جان

بوجھ کر ترجمہ غلط کیا گیا ہے اور عبارت مسخ کی گئی ہے تو یہ کھلی ہوئی تحریف ہے اور ایک متقی عالم دین کے کلام میں تحریف کر کے غلط فہمیاں پھیلانا کسی صورت اللہ کی نظروں میں کوئی محمود فعل نہیں ہوسکتا۔ اور اس کام میں طلوع اسلام کا تعاون کھلا ہوا تعاون علی الاثم والعدوان ہے، البیان نے الذی تولی کبرہ کے جریمہ کا ارتکاب کیا ہے اور طلوع اسلام نے تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (نور) کا بارگراں بے دھڑک اپنے سر پر اٹھالیا ہے۔

۳) حدیث و آثار کے متعلق مولانا مرحوم کا مسلک نہایت واضح اور غیر مشتبہ لفظوں میں کتاب کی انہی فصلوں کے اندر موجود ہے، جن سے ناقص اور غلط اقتباسات دیے گئے ہیں لیکن اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے متعلق مولانا مرحوم کا مسلک پیش کرنا ان حضرات کے مدنظر نہیں تھا۔ یا تو مولانا مرحوم کی نسبت غلط فہمی پھیلانا مقصود تھا یا ان کو آڑ بنا کر حدیث سے لوگوں کو بدگمان کرنا۔

۴) مختلف مقامات سے مختلف ٹکڑے، خبر کو اس کے مبتدا سے اور کلام کو اس کے سیاق و سباق سے چھین کر ایک سلسلہ میں اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کو یہ گمان ہو کہ یہ مقدمہ نظام القرآن کی کسی فصل کا ترجمہ ہے۔ البیان نے تو اتنا کرم کیا تھا کہ صفحات کے حوالے دیے تھے جن سے ان کے اقتضاب کا خیال ہو سکتا تھا، لیکن طلوع اسلام نے تنبیہ کے یہ نشانات بھی ہدم کر دیے کہ پڑھنے والا سمجھے کہ یہ ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہی گئی ہیں اور ایک ہی سیاق و سباق سے وابستہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نیکی محض اس لیے کی گئی ہے کہ مولانا مرحوم کو بھی کسی طرح انکار حدیث کے اس فتنہ میں گھسیٹ لایا جائے جو ان حضرات نے آج برپا کر رکھا ہے۔

ان دوستوں کی ان عنایات نے ہم کو مجبور کیا کہ جو اقتباسات مولانا مرحوم کی طرف

منسوب کیے گئے ہیں ان کی اصل حقیقت اور ان کے سیاق و سباق کو واضح کر دیں تاکہ ان کی وجہ سے اگر کسی کو مولانا مرحوم کی نسبت یا حدیث کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہو تو وہ رفع ہو جائے۔ اور اگر یہ حضرات بھی کسی غلط فہمی کی وجہ سے اس ورطہ ہلاکت میں کود رہے ہیں تو وہ بھی اپنی اصلاح کر لیں اور اگر ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر اپنی راہ میں کانٹے بو رہے ہیں تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔

ان لوگوں نے پہلا فقرہ یہ پیش کیا ہے۔

'یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے۔'

اس فقرہ کو جو شخص بھی پڑھے گا وہ اس کا مطلب یہی سمجھے گا کہ مولانا یہ حکم پورے ذخیرۂ حدیث پر لگا رہے ہیں۔ البیان نے اس پر ص ۶ کا حوالہ دیا ہے مگر اس صفحہ میں کوئی عبارت اس مضمون کی نہیں ہے، البتہ ص ۷ پر مولانا مرحوم نے تفسیر ابن جریر طبری پر یہ تنقید کی ہے:

> **وقداسس تفسيره بعض العلماء على الاحاديث كابن جرير الطبرى الذى حكموا على تفسيره انه لم يصنف مثله ولكن الاحاديث فيه اكثرها ضعاف والمرفوع فيه قليل وانما جمع فيه اقوال اهل التاويل مع كثرة الاختلاف فيما بينها**
>
> بعض علماء نے تفسیر کی بنا روایات پر رکھی ہے مثلاً ابن جریر طبریؒ جن کی تفسیر کی نسبت لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اس کے مثل کوئی اور تفسیر نہیں لکھی گئی، لیکن اس میں اکثر حدیثیں ضعیف ہیں، اور مرفوع احادیث کا حصہ اس میں تھوڑا ہے۔ انہوں نے دراصل اہل تاویل[1] کے اقوال تمام اختلافات کے ساتھ جمع کر دیے ہیں۔

یہی **ولکن الاحادیث فیہ اکثرھا ضعاف والمرفوع فیہ قلیل** کا فقرہ ہے

۱۔ اس زمانہ میں تین آیات کی تفسیر کے لیے تاویل ہی کی اصطلاح تھی۔

جس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ 'یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے۔' لیکن یہ کن احادیث کی نسبت مولانا لکھ رہے ہیں۔ کل احادیث پر یہ حکم لگا رہے ہیں یا تفسیر ابن جریر کی روایات پر؟ اس بات کو گم کرنے کے لیے ایک طرف تو جملہ کو سیاق سے علیحدہ کیا گیا اور پھر اس میں سے 'فیہ' کا ترجمہ غائب کر دیا گیا تاکہ یہ تفسیر ابن جریر کے ساتھ مخصوص نہ رہے بلکہ ایک عام بات ہو جائے، اور پھر اس کو اس ثبوت میں پیش کیا گیا ہے کہ مولانا حمیدالدین فراہیؒ پورے دفتر حدیث کو بے اعتباری کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیسا شدید ظلم ہے جو مولانا مرحوم پر کیا گیا ہے اور اپنی عاقبت سے کتنے بے پروا ہیں وہ لوگ جو بے خطر اس طرح کی تہمتیں تراشتے اور ان کو قبول کرتے ہیں!

اب دوسرا فقرہ ملاحظہ ہو:

'حدیث، اجماع اور صحف اولی یہ تینوں ظن و شبہ سے خالی نہیں۔'

البیان نے اس اقتباس پر ص ۱۰ کا حوالہ ثبت کیا ہے۔ میں نے یہ صفحہ اور اس کے ساتھ اس کے آگے پیچھے کے صفحات بار بار غور سے پڑھے لیکن مجھ کو کوئی فقرہ ایسا نہیں ملا جس کا ترجمہ یہ ہو سکتا ہو۔ البتہ تفسیر کے فرعی ماخذوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

وامّا ماھو کالنبع والفرع فذالک ثلاثة: ماتلقته علماء الامة من الاحادیث النبویة وما ثبت واجتمعت الامة علیه من احوال الامم ومَا استحفظ من الکتب المنزلة علی الانبیاء. ولولا تطرق الظن والشبھة الی الاحادیث والتاریخ والکتب المنزلة من قبل لما جعلنا ھا کالفرع

باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں (۱) علمائے امت نے جن احادیث نبویہ کو پایا ہے۔ (۲) قوموں کے وہ ثابت شدہ احوال جن پر امت نے اتفاق کیا ہے۔ (۳) گزشتہ انبیاء کے صحیفوں میں سے جو کچھ محفوظ ہے۔ اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن و شبہ نے راہ نہ پائی ہوتی، تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے۔

یہاں مولانا مرحوم نے بے شبہ یہ لکھا ہے کہ احادیث میں ظن و شبہ کو دخل ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو اور اسی کے لیے اصول اور اسناد اور رجال کے فنون مدون ہوئے ہیں۔ غرض اسی بنا پر مولاناؒ احادیث کو قرآن پاک کے برابر نہیں بلکہ، اس کے تحت میں، ان کو تابع کا درجہ دیتے ہیں۔ اور یہ یاد رہے کہ یہ تفسیری روایات کے متعلق بیان ہے، جیسا کہ سیاق و سباق سے واضح ہے، لیکن البیان نے معلوم نہیں کس لفظ کا ترجمہ اجماع کر دیا ہے۔ مذکورہ بالا عبارت میں مولاناؒ نے **وماثبت واجتمعت الامة علیه من احوال الامم** کے الفاظ جو لکھے ہیں، اس کا ترجمہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو ہم نے کیا ہے یعنی 'قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات' اس سے مراد اجماع نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اجماع مراد ہوا تو وہاں کے لیے معلوم و معروف اصطلاح چھوڑ کر یہ ٹیڑھی اور غلط تعبیر کیوں اختیار کرتے، اور پھر اس کو ایک ہی سطر کے بعد 'التاریخ' کے لفظ سے کیوں ادا کرتے؟ الفاظ کی ایسی صراحت اور قرائن کی اتنی وضاحت کے بعد بھی اگر البیان کے ایڈیٹر صاحب اس عبارت کا مطلب نہ سمجھ سکے تو وہ آخر عربی عبارات کا ترجمہ کرنے کی جرأت کیوں کرتے ہیں! اور اگر انہوں نے بالقصد یہ تحریف فرمائی ہے تو للہ وہ دوسروں پر نہیں اپنے حال پر رحم کریں!

آگے کتاب کے مذکورہ صفحہ سے مزید اقتباس ان لفظوں میں نقل کیا گیا ہے!

میں نے بعض روایتیں دیکھیں ہیں جو آیتوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہیں اور ان کے نظام کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں (اس کے بعد "الا ان تاول" کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ یعنی الا آنکہ ان کی تاویل کی جائے۔ (اصلاحی) ان لوگوں پر تعجب ہے جو آیت کی تاویل تو کر لیتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کا حوصلہ نہیں رکھتے.... تعجب ہے ان لوگوں پر جو ایسی روایتیں تسلیم کر لیتے ہیں جو نص قرآن پر بھی ہاتھ

صاف کر دیتی ہیں۔ مثلاً کذب ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرم کا نطق قرآن بغیر وحی کے!

ہر چند کہ یہ اقتباس بھی اسقام ترجمہ سے پاک نہیں ہے، بالخصوص مصنف کی شرافت لہجہ تو اس کے اندر سے یک قلم غائب ہے، لیکن فحوائے کلام کی حد تک غنیمت ہے کہ اس میں کوئی تصرف نہیں کیا گیا ہے، لیکن یہ بھی تفسیری روایات سے متعلق ہے۔ تاہم اس کے بعد کا فقرہ جو حدیث و آثار کے متعلق مصنف کے مسلک کو واضح لفظوں میں ظاہر کرنے والا تھا اس کو اڑا دیا گیا ہے۔ مولانا مرحوم نے اس کے بعد لکھا ہے۔

فینبغی لنا ان لانخذ منها الا مایکون مویدا للقران وتصدیقا لما فیه کما ان الاثار المنقولة عن ابن عباس اقرب الاقوال من نظم القران فنشیر الیه کالتبع.
پس ہم کو صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق و تائید کریں۔ مثلاً وہ آثار جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں، وہ بالعموم نظم قرآن سے بہت اقرب ہیں۔ پس ہم ان کی طرف تبعاً اشارہ کریں گے۔

اس سے واضح ہے کہ احادیث صحیحہ و مرفوعہ تو درکنار مولاناؒ آثار صحابہ کو بھی اس درجہ اہمیت دیتے تھے۔

اس کے بعد یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے:

ایسی روایتوں کے تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جو اگرچہ اصول روایت پر پوری نہ اتریں، لیکن درایت کی کسوٹی پر کھری ثابت ہوں۔

یہ اقتباس بھی غلط فہمی پھیلانے والا ہے۔ اس سے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم احادیث کے رد و قبول کے لیے کوئی عام اصول بیان کر رہے ہیں، حالانکہ صورت معاملہ یہ نہیں ہے بلکہ مولاناؒ اسرائیلیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسی طرح اہل کتاب کی جو روایات ہمارے یہاں پھیلی ہوئی ہیں، ان کے مقابل میں خود اہل کتاب کی تاریخ قابل ترجیح ہے، کیونکہ مفسرین نے یہ روایتیں بالعموم عوام کی زبانی لی ہیں جو بنی اسرائیل، اور ان کے انبیاء کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ پس بہتر یہ ہے کہ ان کی معتبر کتابوں کو ہم ماخذ بنائیں اور ان کو تبع کی حیثیت سے پیش کریں۔ اور جہاں کہیں وہ قرآن سے مختلف ہوں وہاں ان کو چھوڑ دیں، کیونکہ یہ قطعی معلوم ہے کہ ان کی کتابوں میں شہادت کو چھپایا گیا ہے۔ نیز ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اس طرح کے اخفاء و تحریف کی نہایت واضح مثال حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کے واقعہ میں موجود ہے۔ پس لازماً جو کچھ قرآن میں ہے ہم اسی کو اصل قرار دیں گے۔ اس اصول میں کسی کے لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم مسلمان آسمانی کتابوں میں کسی قسم کی تفریق جائز نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک قرآن انہی میں سے ایک ہے۔ البتہ جب روایت میں اختلاف ہوگا تو ہم کو صحت روایت کے لیے اہتمام کرنا پڑے گا اور اس وقت ہم مجبوراً اسی روایت کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ صحیح اور معتبر ثابت ہو، ہاں اگر باہم کوئی اختلاف نہ ہو تو ہم درایت کی کسوٹی پر جانچ کر ان کتابوں سے بھی لے سکتے ہیں جن کا از روئے روایت کوئی وزن نہیں ہے مثلاً ہم زبور میں سے اس چیز کو لیں گے جس کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے، الی آخرہ۔ (فاتحہ نظام القرآن ص ۱۰،۱۱)

اس پوری عبارت کو پڑھ جائیے اور خط کشیدہ فقرہ کو غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ یہی فقرہ البیان اور طلوع اسلام کے اقتباس کا ماخذ ہے۔ اولاً تو دیکھیے ترجمہ میں کتنا ناجائز تصرف کیا گیا ہے۔ ثانیاً یہ فقرہ سیاق و سباق سے الگ کر لیے جانے کی وجہ سے مصنف کے منشاء کے کس قدر خلاف ہوگیا ہے۔ طلوع اسلام وغیرہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مولاناؒ روایات کے رد و قبول کے لیے ایک عام ضابطہ بیان کر رہے ہیں، حالانکہ ان کا کہنا صرف

یہ ہے کہ جہاں قرآن اور صحف سابقہ میں باہمدگر کوئی اختلاف نہ ہو تو ہر چند صحف سابقہ کا از روئے روایت کوئی وزن نہیں ہے لیکن درایت کی کسوٹی پر جانچ کر ان کتابوں سے بھی ہم لے سکتے ہیں مگر ان حضرات نے کہاں کی بات کہاں پہنچا دی!

اس کے بعد یہ اقتباس درج کیا گیا ہے:

'حدیث اور تواتر قرآن کو نہیں منسوخ کر سکتے .... ہم اس عقیدہ سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں کہ رسول، خدا کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے.... ایسا خیال یقیناً راویوں کا وہم وخطا ہے۔'

مولانا مرحوم نے یہ بات جن الفاظ اور جن دلائل کے ساتھ کہی ہے، میں اس کا اصل کتاب سے ترجمہ کیے دیتا ہوں:

اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خبر: اگرچہ متواتر ہو، قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ اس کی یا تو تاویل کریں گے یا اس میں توقف کریں گے۔ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبل اور عام اہل حدیث، حدیث کو قرآن کے لیے ناسخ نہیں مانتے اگرچہ حدیث متواتر ہو۔ جب یہ ائمہ، جو حدیث کے لیے صاحب البیت کی حیثیت رکھتے ہیں، اس بات کے قائل نہیں ہوئے تو اس باب میں ہم فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے! اللہ تعالیٰ ہم کو اس بات سے اپنی پناہ میں رکھے کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ رسول اللہ کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اس طرح کے مواقع میں تمام تر راویوں کے وہم اور ان کی غلطی کو دخل ہے اور فریقین کے دلائل پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ حق کیا ہے۔

اخیر میں مقدمہ کے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں ہم اس مقدمہ کی اصل بحث کا صحیح ترجمہ یہاں درج کرتے ہیں:

میں لکھ چکا ہوں کہ جب قرآن اور احادیث میں اختلاف ہو تو اس وقت حکم قرآن ہو گا۔ یہاں اس کی توضیح کرنا چاہتا ہوں۔ میں بعض لوگوں کے طعن سے ڈرتا تھا لیکن حدیث کے معاملہ میں ان کے غلو کا یہ حال ہے کہ وہ کہتے ہیں حدیث اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ کے تحت داخل ہے۔ انہوں نے اپنے اس قول کے نتائج پر غور نہیں کیا۔ اس لیے وقت آگیا ہے کہ میں سچائی کا علم بلند کروں اور کچھ پروا نہ کروں! **ولو قطعوا ار اسی لدبه وا وصالی.**

اکثر اہل حدیث کے دلوں میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ بخاری اور مسلم نے جو روایت کی ہے اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے ہم یہاں بعض مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو رب ٹھہرانے پر تشنیع فرمائی ہے۔ پس ہم اس پر ایمان نہیں لا سکتے جو انہوں نے بغیر غور و فکر کے سمجھا ہے۔

اس کے بعد مولانا نے بعض متناقض و متعارض روایات متعلق تفسیر مثال میں پیش کی ہیں لیکن ہم ان پر بحث نہیں کر سکتے ہیں [بحث کی جگہ بیاض چھوڑ دی ہے۔] لیکن ان کا مدعا واضح ہے وہ ان لوگوں کے خیال کے مخالف ہیں جو حدیث کو ذکر منزل کا درجہ دیں یا اس کے لیے اس حفاظت و صیانت کے مدعی ہوں جس کا ذکر "وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ" میں کیا گیا ہے۔ یہ چیز صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ہے، اور کوئی محقق ایک لمحہ کے لیے بھی حدیث کو اس کے تحت داخل نہیں سمجھتا۔ اس دعوے کے نتائج بلاشبہ نہایت خطرناک ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مولانا ان لوگوں کے خیال سے بھی اتفاق نہیں رکھتے جو بخاری ومسلم کی تمام مرویات کو ظن سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اور یہ بات مولانا نے کوئی نئی اور عجیب نہیں کہی ہے۔ حافظ ابن حجر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی ان کتابوں کو ظن سے بالاتر نہیں سمجھتے ظن سے بالاتر تو سمائے دنیا کے نیچے صرف ایک ہی کتاب ہے؟ ہمیں تعجب ہے کہ ان دوستوں نے اس بات کو اس قدر اہمیت کیوں دی! حنفیہ عموماً ان تمام اقوال میں

جن کا تعلق حادثۂ عامہ سے ہے، خبر احاد کو قابل حجت نہیں سمجھتے، آخر ایسا کیوں ہے؟ اگر خبر احاد میں احتمال اور ظن کی گنجائش نہیں ہے تو حنفیہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ بہرحال یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو پہلی مرتبہ کہی گئی ہے اور جس کو اس اہتمام سے شائع کرنے کی ضرورت ہو۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اگر بخاری و مسلم ظن سے بالاتر نہیں ہیں تو ردّ کر دینے کے قابل ہیں۔ جن لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے انہوں نے پہلی غلطی سے ہزار درجہ بڑھ کر غلطی کی ہے اور افسوس ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی اس غلطی کے نتائج سے بے خبر ہیں!

مولاناؒ کا صحیح مسلک

یہاں تک ہم نے ان اقتباسات سے بحث کی ہے جو البیان اور طلوع اسلام نے پیش کیے تھے۔ اب ہم اسی کتاب — فاتحہ نظام القرآن — سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے احادیث و آثار کے متعلق مولاناؒ کا صحیح مسلک معلوم ہوگا۔

مولاناؒ اتقان سے یہ عبارت ص ۶ میں نقل کرتے ہیں:

> اگر قرآن سے تفسیر نہ ہو سکے تو سنت رسول کی طرف رجوع کرے، کیونکہ سنت قرآن کی شارح اور مفسر ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ نبی ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے سب قرآن سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ اس کے علاوہ اور بھی روایتیں ہیں۔ خود نبی ﷺ نے فرمایا ہے "مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے مانند ایک اور چیز بھی اسی کے ساتھ یعنی سنت۔ لیکن اگر سنت سے تفسیر نہ ہو سکے تو صحابہؓ کے اقوال کی طرف رجوع کرے۔ انہوں نے چونکہ تمام قرائن و حالات کا بوقت نزول مشاہدہ کیا ہے، نیز وہ فہم کامل، علم صحیح اور عمل صالح سے مشرف ہیں، اس لیے وہ تفسیر کے سب سے بڑے جاننے والے ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ خود اپنے طریقہ کا ذکر کرتے ہیں اور مذکورہ بالا مذہب کی حرف بحرف تائید کرتے ہیں:

> اس سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے، اس کے بعد نبی ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ کا فہم ہے۔ پس میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ محبوب وہی تفسیر ہے جو پیغمبر ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہو۔

پھر آگے چل کر احادیث صحیحہ اور قرآن مجید کے توافق کے متعلق اپنا یقین ان لفظوں میں ظاہر کرتے ہیں:

> میں یقین رکھتا ہوں کہ صحیح احادیث اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ تاہم میں روایات کو بطور اصل نہیں بلکہ بطور تائید کے پیش کیا کرتا ہوں۔ پہلے آیت کی تاویل مماثل آیات سے کرتا ہوں۔ اس کے بعد ضمناً احادیث صحیحہ کا ذکر کرتا ہوں تاکہ ان منکرین کو معارضہ کی راہ نہ ملے جنہوں نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

آثار صحابہ کی نسبت مولاناؒ فرماتے ہیں:

> مثلاً جو آثار حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں، وہ بالعموم نظم قرآن سے بہت اقرب ہیں۔ پس اس طرح کی روایات کی طرف ہم ضمناً اشارہ کریں گے۔

آج انکار حدیث کے فتنہ نے صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، قربانی وغیرہ سب کے انکار کی راہ کھول دی ہے۔ مولاناؒ تفسیر کے لسانی مآخذ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اسی طرح تمام اصطلاحات شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور ان سے جو اعمال متعلق ہیں، تواتر و توارث کے ساتھ، سلف سے لے کر خلف تک سب محفوظ رہے۔ ان میں جو معمولی جزئی

اختلافات ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ ہیں۔ شیر کے معنی سب کو معلوم ہیں اگرچہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں اور صورتوں میں کچھ نہ کچھ اختلافات ہیں۔ پس جو نماز مطلوب ہے وہ وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں ہرچند کہ اس کی ہیئت میں بعض جزئی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اس طرح کی چیزوں میں زیادہ کرید سے کام لیتے ہیں وہ اس دین قیم کے مزاج سے بالکل ناآشنا ہیں جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے۔ (ص ۱۲)

جس کتاب میں یہ فقرے بھی موجود ہیں اور انہی فصلوں کے اندر جن سے البیان وغیرہ نے اقتباسات لیے ہیں، اس کے مصنف کے مسلک کی نسبت کیا اشتباہ باقی رہ جاتا ہے!

یہاں یہ امر بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ مولاناؒ نے مقدمہ تفسیر نظام القرآن میں اصولِ تفسیر سے بحث کی ہے اور حدیث پر جہاں جہاں گفتگو کی ہے اس کا تعلق روایاتِ تفسیر سے ہے، حدیث پر بحیثیت حدیث کے اس رسالہ میں گفتگو کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں تھا۔ یہ چیز مولاناؒ کے موضوع کے حدود سے باہر تھی۔ اور روایاتِ تفسیر کے متعلق اہل علم کا یہ فیصلہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ سنن و احکام کی روایات اور تفسیر کی روایات میں بڑا فرق ہے تفسیر کی روایات کا درجہ بہت نیچے ہے۔ علامہ سیوطیؒ اتقان میں لکھتے ہیں،

لطلب التفسير ماخذ كثيرة امهاتها اربعة الاول النقل عن النبی ﷺ وهذا هو الطراز المعلم ولكن يجب الحذر من الضعيف منه والموضوع فانه كثير و لهذا قال احمد ثلاثة كتب لا اصل لها المغازی والملاحم والتفسير، (۲۱۱ ج ۳)

تفسیر کے بہت سے مآخذ ہیں۔ ان میں سے چار اصل ہیں: اول احادیث جو نبی ﷺ سے نقل ہیں، اور یہی سب سے نمایاں ہیں، لیکن ان میں ضعیف اور موضوع سے حذر واجب ہے، کیونکہ ضعیف و موضوع بہت ہیں۔ اسی وجہ سے احمد بن حنبلؒ کا

قول ہے کہ تین قسم کی کتابوں کی کوئی اصل نہیں: مغازی، ملاحم اور تفسیر۔

پس اس باب میں مولاناؒ نے جو بات کہی ہے وہ وہی ہے جو ہمیشہ علمائے حدیث نے کہی ہے، کوئی نئی اور عجیب بات نہیں ہے۔

مولاناؒ کی دوسری کتابیں — جو شائع ہو چکی ہیں — وہ بھی لوگوں کے سامنے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے ساتھ مولاناؒ کا معاملہ سوءِ ظن اور انکار کا نہیں ہے بلکہ اہل تحقیق کے عام طریقہ کے مطابق تنقید، تاویل، ترجیح، تطبیق اور حسن ظن کا ہے۔ البتہ قرآن کی روشنی میں انہوں نے ان اصولوں کے برتنے میں کسی قدر وسعت سے کام لیا ہے۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ جب تک وہ روایات کو اپنے ساتھ نہ لے لیں یا ان سے زیادہ طاقتور چیزوں سے ان کو اپنی راہ سے ہٹا نہ دیں اس وقت تک ایک قدم آگے نہیں بڑھاتے۔ البتہ بنیادِ روایات پر وہ نہیں قائم کرتے، اس کے شدت کے ساتھ مخالف تھے۔ مولاناؒ کی تمام مؤلفات ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی کی روایات

اخیر میں چند لفظ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی اس روایت کی نسبت بھی کہوں گا جس کو طلوع اسلام وغیرہ نے بہت شہرت دی ہے۔ حیرت ہے کہ جو لوگ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی روایت اس جزم و یقین کے ساتھ مانتے ہیں، وہ حدیث کے ماننے سے کیوں اعراض کرتے ہیں!

مولانا سندھی ایک ذہین آدمی ہیں۔ ذہین لوگ بے وقوفوں کی بہت کم پروا کرتے ہیں اور اکثر ایسی باتیں کہہ گزرتے ہیں جو متشابہات کی نوعیت کی ہوتی ہیں، جن سے تیسرے درجہ کی عقلیں فتنہ میں پڑتی ہیں اور اربابِ زیغ ان کو لے اڑتے ہیں اور بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔

مولانا سندھی اور مولانا حمید الدین کے درمیان حدیث کے ماننے اور نہ ماننے کا جو جھگڑا تھا، اس کی بنا تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتی کہ خدانخواستہ مولانا حمید الدین فراہیؒ سارے دفتر حدیث کو ناقابل اعتبار قرار دیتے تھے۔ اگر یہ صورت ہوتی تو مولاناؒ مؤطا کو کیوں مانتے، درآنحالیکہ اہل تحقیق کے نزدیک صحاح ستہ اسی کی شرح کی حیثیت رکھتی ہیں اور اس ایک کا ماننا بہتوں کے ماننے کو مستلزم ہے! نیز بخاری و مسلم کی نسبت مولاناؒ کی رائے اوپر گزر چکی ہے کہ وہ ان کو اس حیثیت سے نہیں مانتے کہ وہ شک سے بالاتر ہیں اور ظاہر ہے کہ اس حیثیت سے بخاری و مسلم کو نہ ماننا ایک بالکل دوسری چیز ہے۔

اصل یہ ہے کہ اس باب میں مولاناؒ کا ایک خاص زاویہ نگاہ تھا۔ وہ تمام تر زور سنت اور تعامل صحابہ پر دیتے تھے، خبر احاد کی بنا پر غلو و افراط اور فرقہ آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ فرقوں میں خبر احاد میں غلو کی وجہ سے جھگڑے اور مناقشے پیدا ہوئے۔ چنانچہ مقدمہ' نظام القرآن ہی کے تیسرے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

> پس جب ایسے الفاظ مصطلحہ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری حد اور تصویر قرآن میں بیان نہ ہوئی ہو، (مثلاً صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ وغیرہ) تو اخبار احاد پر جامد نہیں ہونا چاہیے، ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شک میں پڑو گے، دوسروں کے اعمال کو غلط ٹھہراؤ گے، ان سے جھگڑو گے اور تمہارے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے۔ ایسی صورتوں میں راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصہ پر امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور جن چیزوں کے بارہ میں کوئی نص صریح اور متفق علیہ عمل ماثور موجود نہیں ہے ان میں اپنے دوسرے بھائیوں کا تخطیہ نہ کرو۔

اس سے خبر احاد کے بارہ میں مولاناؒ کا اصلی رجحان بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اور جب ان کا رجحان یہ تھا تو ان کے نزدیک موطا کی محبوبیت و ارجحیت دوسری کتب حدیث کے مقابل میں بالکل فطری بات تھی۔ مؤطا اولاً تو باعتبار حقیقت فقہ کی کتاب ہے،

اس کا تعلق بیشتر اعمال و احکام عملی سے ہے۔ پھر اس کی بنیاد احادیث نبویہ کے علاوہ حضرت عمرؓ کے قضایا، حضرت ابن عمرؓ کے فتاویٰ اور عمل، نیز مدینہ کے دوسرے صحابہؓ و فقہاء کے فتاویٰ پر ہے۔ پھر حضرت عمرؓ کے قضایا کی حیثیت یہ ہے کہ وہ صحابہؓ کی مجمع علیہ قضایا ہو سکتے ہیں۔ مدینہ کے دوسرے صحابہؓ اور فقہا کے فتاویٰ میں بھی ایک اجتماعی حیثیت کا مظنہ ہے۔ نیز امام مالکؒ عمل اہل مدینہ کو خبر احاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ساری ہی باتیں مولاناؒ کو اپیل کرنے والی تھیں۔ ان اسباب سے وہ موطا کو سب پر ترجیح دیتے تھے کہ اس کی بنیاد سنت اور تعامل صحابہؓ پر تھی اور اخبار احاد کے افراط و غلو کو، جیسا کہ اوپر گزرا، وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ خبر احاد کے معاملہ میں حنفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ عموماً ایسے حالات میں جن کا تعلق عموم بلویٰ سے ہو خبر احاد کو نہیں مانتے مالکیہ بھی عمل اہل مدینہ کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ مولاناؒ بھی زور سنت اور تعامل صحابہؓ پر دیتے تھے۔

پس مولانا عبید اللہ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ میں متنازعہ فیہ معاملہ درحقیقت خبر احاد کا تھا۔ اور یہ جھگڑا یوں طے ہو گیا کہ مولانا سندھی نے جونہی مؤطا کا نام لیا، مولاناؒ نے فرمایا: ہم اس کو مانتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جہاں تک سنت اور تعامل صحابہؓ کا تعلق ہے اس میں اختلاف و نزاع کی کہاں گنجائش ہے۔

یہ قضیہ ہے جس کو مولانا سندھی نے حدیث کے ماننے اور نہ ماننے سے تعبیر کیا ہے۔ ذہین لوگوں کو ان کے اس فقرہ سے کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی، لیکن عام لوگوں کی فہم سے یہ بات بالاتر ہے۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ مجھے اپنے خیال کی تائید میں مولاناؒ کے اپنے قلم کی ایک تحریر بھی مل گئی۔ شاہ صاحب کی شرح موطا کا جو نسخہ مولاناؒ کے زیر مطالعہ رہا ہے، اس پر اپنی عادت کے مطابق مولاناؒ نے جگہ جگہ حواشی لکھے ہیں۔ شاہ صاحب نے دیباچہ کتاب میں سنت و حدیث میں جو فرق بیان کیا ہے اس پر مولانا پنسل سے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''فرق درمیان سنت و حدیث نہ چنانست کہ مؤلف رحمہ اللہ بیان فرمودہ، در کتاب موطا امام مالک در اکثر جابا گفتہ والسنۃ عندنا کذا و مرادش آنست کہ عمل علمائے مدینہ چنانست و این را بر احاد خبر ترجیح میداد چرا کہ سنت سلف متصل است تا پیغمبر صلعم و متواتر است و احاد خبر محتمل صدق و کذب و خطاء فہم و تبدیل در ادائے خبرست و طریق امام مالک و ابو حنیفہ اعتماد بر سنت است کہ زمان تابعین را دریافتہ بودند بعد ازان سنت خود تغیر یافت و اعتماد علماء بر اخبار و روایات باقی ماند

مولاناؒ کے قلم کی یہ سطریں سارے راز سے پردہ اٹھا دیتی ہیں۔ وہ امام مالک کے قول **والسنہ عند ناکذا** کا مطلب سمجھاتے ہیں کہ اس سے مراد علمائے مدینہ کا عمل ہے اور پھر اس کے خبر احاد پر ترجیح دینے کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ 'سنت سلف متصل است تا پیغمبر ﷺ و متواتر است' پھر اس کے مقابل میں خبر احاد کے ضعف کے وجوہ بیان کرتے ہیں کہ 'احاد خبر محتمل صدق و کذب و خطاء فہم و تبدیل در ادائے خبر است' پھر امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے فقہ کی بنیاد کا ذکر کرتے ہیں کہ 'طریق امام مالک و ابو حنیفہ اعتماد بر سنت ست کہ زمان تابعین را در یافتہ بودند۔' پھر بعد کی تبدیلی' حالت پر افسوس کرتے ہیں کہ 'بعد ازان سنت خود تغیر یافت و اعتماد علماء بر اخبار و روایات باقی ماند۔' اس ساری تفصیل کے سمجھ لینے کے بعد کون گمان کر سکتا ہے کہ مولاناؒ سنت سلف کے مخالف ہو سکتے ہیں، البتہ خبر احاد کے باب میں انہوں نے جو رائے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے افراط و غلو کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس بارہ میں امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے طریق کو پسند کرتے تھے۔ پس یہی چیز تھی جس کے بارہ میں انؒ سے اور مولانا سندھی سے 'لڑائی رہتی تھی' ورنہ مولانا جیسا 'لکیر کا فقیر' سنت اور عمل صحابہؓ پر گفتگو کا کب روادار ہو سکتا ہے درآنحالیکہ ان کے نزدیک 'سنت سلف متصل است تا پیغمبر ﷺ و متواتر است' اور اگر مولانا سنت پر خدانخواستہ معترض ہوتے تو خود مولانا سندھی ان کو کب بخشنے والے تھے۔

ان سطروں کی رہنمائی سے مولانا مرحوم کی نسبت میرے سامنے ایک بات بالکل پہلی مرتبہ آئی۔ مولاناؒ ایک محقق اور مجتہد عالم تھے تاہم ان پر حنفیت کا رنگ غالب تھا اور بعض مرتبہ حنفیت کی حمایت میں ایسی تقریر کر دیتے کہ اس میں غلو کی بو محسوس ہوتی۔ میں اس پر کبھی کبھی اعتراض کرتا لیکن وہ دلائل سے قائل کر دیتے۔ میں اپنی فہم کے مطابق اس کی مختلف توجیہیں کرتا لیکن کوئی بات دل میں جمتی نہیں تھی۔ کبھی اس کو مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی صحبت و شاگردی کا نتیجہ قرار دیتا، کبھی یہ خیال کرتا کہ فقہ حنفی کی عقلیت سے وہ متاثر ہیں۔ لیکن مذکورۂ بالا سطروں سے اصل حقیقت روشنی میں آئی کہ طریق امام مالک و امام ابو حنیفہ برسنت است کہ زمان تابعین را در یافتہ بودند۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے **حجۃ اللہ البالغہ** میں تصریح کی ہے کہ امام مالکؒ و امام ابو حنیفہؒ زیادہ تر آثار پر بنیاد رکھتے تھے، امام شافعیؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان کے مقابلہ میں احادیث کی روایتی حیثیت پر سب سے زیادہ زور دیا (**باب اسباب اختلاف مذاهب الفقهاء**) اسی لیے ان کی فقہ امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی فقہ سے بہت زیادہ مختلف ہے اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ میں باہم بکثرت اتفاق و اشتراک ہے۔ ان تشریحات کے بعد امید ہے کہ کسی کو مولانا حمید الدین فراہیؒ کی نسبت یا علم حدیث کی نسبت کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی تو وہ رفع ہو جائے گی۔

(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ فروری ۱۹۴۲ء)

۲

اِنٹرویو

مقالہ ۴

جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی سے میرا تعلق

[ایک انٹرویو] [1]

سوال: آپ کے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اپنی ساری زندگی عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا جبکہ آپ نے ان سے مختلف ایک راہ اختیار کی اور ایک زمانے میں سترہ سال تک جماعت اسلامی سے منسلک رہے۔ براہ کرم یہ بتائیے کہ جماعت اسلامی میں آپ کے شامل ہونے کی کیا وجوہات تھیں اور پھر کن وجوہ سے آپ اس سے علیحدہ ہوئے؟

جواب: یہ حقیقت ہے کہ مولانا فراہیؒ نے اپنی زندگی میں عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک کرنے کا اصل کام مسلمانوں کی فکری اصلاح کا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمانوں کی دینی فکر صحیح نہیں ہوگی تو سیاست سمیت ان کے تمام شعبہ ہائے زندگی غلط راستوں پر چل نکلیں گے۔ اس لیے نہایت ضروری

۱۔ یہ انٹرویو ۱۹۹۰ء میں منصور الحمید صاحب نے لیا جو پیشے کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر ہیں۔

ہے کہ ان کی دینی فکر کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ اُمت مسلمہ کے دینی فکر و فلسفہ کی اصلاح کا کام معمولی نہیں بلکہ نہایت دشوار اور کٹھن کام ہے۔ مولانا حمیدالدین مرحوم نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور پھر زندگی بھر اس کے سوا کسی چیز کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اپنے دور کے سیاسی ہنگاموں کے بارے میں ان کی آراء سے میرے دل پر یہ اثر پڑتا تھا کہ وہ ان کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ تحریک خلافت کے زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے، ایک مجلس میں جس میں اور حضرات کے علاوہ سید سلیمان ندوی صاحب اور میں بھی موجود تھا، پوچھا: 'مولانا! خلافت کے حق میں آپ اپنی دلیل بتایئے؟' تو مولانا نے جواب دیا: 'آپ لوگ تو دلیلیں بیان ہی کرتے ہیں' اس جواب سے میرے دل پر یہ اثر پڑا کہ مولانا ان باتوں کو زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی طرح ترک موالات کے بارے میں ایک دفعہ سید سلیمان ندوی صاحب نے پوچھا: 'مولانا ترک موالات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟' تو انہوں نے جواب دیا ''میں تو روزانہ نماز میں ترک موالات کرتا رہتا ہوں۔ نَخلَعُ وَ نَترُکُ مَن یَفجُرُک. غرض سیاسی کاموں میں سے انہوں نے نہ تو کسی کام کو وقعت دی اور نہ کسی میں حصہ لیا۔ مسلمانوں کی فکری اصلاح کے پیش نظر انہوں نے عربی زبان میں لکھنا شروع کیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ مولانا! آپ عربی میں کیوں لکھتے ہیں؟ تو کہنے لگے مسلمان قوم کی اصلاح علماء کی اصلاح سے ہوگی اور علمائے عالم اسلام کی مشترک زبان عربی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ علماء کی اصلاح ہو تاکہ اسی سے مسلمان قوم کی اصلاح ہو سکے!

مولانا فراہیؒ کا یہ موقف مجھ پر واضح تھا اور میں بھی اسی نہج پر کام کرنا چاہتا تھا لیکن جب جماعت اسلامی قائم ہوئی تو واقعہ یہ ہے کہ میں ایک حادثے کے طور پر اس میں شامل ہو گیا۔ یہ راز بہرحال مولانا مودودی مرحوم جانتے تھے اور

اب بھی بعض چوٹی کے لوگ اس سے آگاہ ہیں۔ وہ حادثہ یہ تھا کہ مولانا مودودیؒ اُن دنوں متحدہ قومیت کے خلاف کانگریسی علماء پر سخت تنقید کر رہے تھے۔ چونکہ ان کے قلم میں زور تھا اس لیے جب انہوں نے اس مسئلہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا تو مجاہد و غازی بن گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلم لیگ کے بارے میں یہ بھی لکھتے تھے کہ وہ 'کونوا عباداللّٰہ اخوانا' کی داعی ہے۔ میں اس زمانے میں اپنا رسالہ 'الاصلاح' نکالتا تھا۔ میں نے اس پر ایک مضمون لکھا کہ جہاں تک متحدہ قومیت کے غلط ہونے کا تعلق ہے اس میں تو کسی کو کوئی شبہ نہیں، لیکن میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ مسلم لیگ 'کونوا عباداللّٰہ اخوانا' کی داعی ہے۔ مسلم لیگ کی دعوت یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ 'مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!' میں نے مولانا مودودیؒ کو اس پر غور کرنے کی دعوت دی اور لکھا کہ اگر دعوت دینی ہے تو اسلام کی دعوت دیجیے۔ مسلم لیگ کی دعوت کو 'کونوا عباداللّٰہ اخوانا' کی دعوت سمجھنا صریح غلطی ہے۔ مولانا مودودیؒ صاحب نے میرے موقف کو درست تسلیم کر لیا اور میرے اور ان کے درمیان صلح ہو گئی۔ اس کے بعد مولانا منظور نعمانی مجھ سے، سرائے میر مدرسۃ الاصلاح میں جا کر ملے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ 'اب تمہارے اور مودودی صاحب کے نقطہ نظر میں اتفاق ہو گیا ہے لہٰذا اب اگر 'کونوا عباداللّٰہ اخوانا' کی دعوت کے لیے کوئی جماعت قائم ہو تو کیا تم اس میں شریک ہو گے؟' میں نے کہا 'میرے پیش نظر اور کام ہیں اس لیے میں شریک تو نہیں ہوں گا تاہم میں اس کام کو مبارک سمجھتا ہوں، یہ کام ہونا چاہیے اور آپ حضرات یہ کام کیجیے۔' لیکن انہوں نے مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور یہ اصرار کیا کہ میں ایک دفعہ لاہور جا کر مولانا مودودیؒ سے ملاقات کر لوں۔ میں اس پر تیار نہیں تھا لیکن مولانا منظور نعمانی بہت مصر ہوئے۔ وہی درحقیقت اصرار کر کے مجھے لاہور لائے اور میرے اور مولانا مودودی کے درمیان ملاقات ہوئی۔ اس وقت تک جماعت قائم نہیں ہوئی تھی۔

ملاقات کے بعد جب ہم جانے لگے تو مولانا منظور نعمانی نے مجھ سے پوچھا 'اب تمہاری مولانا مودودیؒ صاحب سے ملاقات ہوگئی ہے، تم نے ان کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہے؟' میں خاموش رہا۔ انہوں نے پھر پوچھا۔ تب بھی میں خاموش رہا۔ جب پھر پوچھا تو میں نے کہا 'ذع شانہٗ، یامولانا، لافرق بینہٗ و بین پرویز' ان کا قصہ چھوڑیئے۔ ان کے اور پرویز کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اس زمانے میں پرویز کے مضامین مفید نکلتے تھے اور وہ رسالہ 'ترجمان القرآن' اور 'الاصلاح' دونوں میں شائع ہوتے تھے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ بس پرویز کی طرح ایک اچھے مضمون نگار ہیں اس سے زیادہ نہیں۔ اس پر مولانا منظور نعمانی کہنے لگے 'دیکھو اب اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ جیسے لوگ نہیں ملیں گے۔ اب تو کام چلاؤ آدمی چاہیے۔ اگر کوئی آدمی یہ کام کرنے اٹھ کھڑا ہو تو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔' میں نے کہا: آپ لوگ ساتھ دیجیے اور کام بھی کیجیے۔ میں کب کہتا ہوں کہ اسماعیل شہیدؒ اور سید صاحب نہ ملیں تو کام ہی نہ ہو۔' کہنے لگے: 'تم اس میں شریک ہوگے یا نہیں؟' میں نے کہا ''میں اس مسئلہ پر غور کروں گا، لیکن آپ حضرات یہ کام کریں میں اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔'

اس کے بعد لاہور میں جماعت قائم ہوئی اور جماعت میں شامل ہونے والوں میں میرا نام بھی دے دیا گیا۔ میں اس اجلاس میں آیا تھا نہ شریک ہوا تھا۔ اس کے باوجود میرا نام دے دیا گیا اور وہ شائع بھی ہوگیا۔ جب مولانا سید سلیمان ندوی کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے مجھے بلایا اور کہا: 'تم تو گئے نہیں تھے، تمہارا نام کیسے آگیا؟' میں نے کہا: 'اب آگیا ہے تو کیا کیجیے گا، رہنے دیجیے!' میں دراصل منظور نعمانی صاحب کی مروت میں آگیا کہ انہوں نے میرے اعتماد پر نام دے ہی دیا ہے تو اب یہ ٹھیک نہیں کہ میں اس کی تردید کروں۔ سید سلیمان

صاحب کہنے لگے 'میں تردید کیے دیتا ہوں کہ یہ تو گیا نہیں۔ اس کا نام غلط دے دیا گیا ہے' میں نے کہا: 'کاہے کو تردید کرتے ہیں۔ کوئی دینی کام ہی ہوگا۔ غیر دینی کام تو نہیں ہوگا۔ اس میں کیا حرج ہے، رہنے دیجیے۔ بہرحال اس کو کمزوری کہیے یا کچھ اور، میرا نام دے دیا گیا اور میں نے مولانا منظور نعمانی کی مروت میں اس کی تردید نہیں کی۔

نام آجانے کے فوراً بعد مجھ سے یہ اصرار کیا جانے لگا کہ جماعت قائم ہونے کے بعد جماعت کا نظام بہت وسیع ہو رہا ہے لہٰذا تمہارا جماعت کے ساتھ پٹھان کوٹ میں قیام نہایت ضروری ہے۔ میں نے معذرت کی کہ میرے لیے مدرسہ چھوڑنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مجھے مولانا فراہی کے کاموں کو انجام دینا ہے۔ پچاس ہزار روپے صرف اس مقصد کے لیے میرے پاس جمع ہیں اور اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ لیکن مولانا مودودی مرحوم اور مولانا نعمانی دونوں میرے درپے ہوگئے کہ تمہارا یہاں آنا بہت ضروری ہے اور اگر تم نہیں آؤ گے تو اس کام میں خرابی پیدا ہوسکتی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے نہایت مدلل خطوط لکھنے شروع کر دیے کہ تنہا میرے لیے ساری ذمہ داریوں کو سنبھالنا مشکل ہے اس لیے پٹھان کوٹ میں تمہارا مستقل قیام ضروری ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سرائے میر کی بساط لپیٹنی پڑی، بلکہ وہ کشتی ہی جلانی پڑی اور میں پٹھان کوٹ آگیا۔

میں جماعت اسلامی میں اس طرح داخل ہوا ہوں۔ کسی کی عقیدت کے تحت یا کسی غلط فہمی کی بنا پر شامل نہیں ہوا۔

مولانا مودودی مرحوم اور میرے درمیان ایک قدر مشترک بھی تھی۔ وہ یہ کہ تقلید و تقید سے میں بھی آزاد تھا اور تقلید و تقید سے وہ بھی آزاد تھے۔ بعد میں جماعتی مصالح کے پیش نظر انہوں نے جانے کتنی بیڑیاں پہن لیں اور وہ ان تمام

مسائل کے ایک ایک کر کے قائل ہو گئے جن کا ہم پٹھان کوٹ میں آپس میں بیٹھ کر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں ہم دینی معاملات پر کم وبیش ایک ہی انداز سے سوچتے تھے۔ یعنی قرآن مجید اور فقہ پر یوں غور کیا جائے، علماء کی یوں اصلاح کی جائے، صوفیاء کو ایسے شکست دی جائے اور لوگوں کو یوں تبدیل کیا جائے۔ ان سب معاملات میں میرا اور ان کا نقطۂ نظر کم وبیش یکساں تھا اور اس میں کوئی بڑا اختلاف نہیں تھا۔

تاہم اس قدر مشترک کے علاوہ میرے اور ان کے درمیان ذوق وفکر کا ایک نہایت گہرا اختلاف بھی تھا۔ جس میں سب سے نمایاں چیز یہ تھی کہ مولانا حمید الدینؒ کے مشن اور طرزِ فکر سے نہ تو انہیں دلچسپی تھی اور نہ یہ کام ان کے بس کا تھا۔ تاہم یہ اختلاف ایسا نہیں تھا کہ میں ان سے تعاون نہ کر سکوں۔ چنانچہ جماعت کے ساتھ میرا جو تعلق پیدا ہو گیا تھا، اس ذوق وفکر کے اختلاف کے باوجود، میں نے اسے قائم رکھنا چاہا الا یہ کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ میرے لیے اس تعلق کو برقرار رکھنا ناممکن ہو جائے۔

پٹھان کوٹ آنے کے بعد آہستہ آہستہ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ مولانا مودودیؒ کے بارے میں میرے اندازوں میں بہت سی چیزیں غلط تھیں۔ لیکن یہ ایسی چیزیں نہیں تھیں کہ میں فوراً الٹے پاؤں واپس چلا جاتا، جیسا کہ مولانا نعمانی واپس گئے۔ چنانچہ جب ایسی باتیں سامنے آئیں تو میں نے مولانا منظور نعمانی صاحب سے کہا کہ آپ لوگ تو اس بنا پر علیحدہ ہوئے ہیں کہ آپ نے مولانا مودودیؒ میں تقویٰ نہیں پایا لیکن میں اس بنا پر نہیں چھوڑ سکتا۔ رہ گیا رائے اور فکر کا اختلاف تو اس میں میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کرتا جو مجھے اس بات پر مجبور کر دے کہ استعفیٰ دے کر الگ ہو جاؤں!

پاکستان کا قیام جوں جوں قریب آتا گیا میں نے محسوس کیا کہ مولانا مودودی میں بعض ایسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جو بالآخر گمراہ کن نتائج تک منتہی ہو سکتی ہیں۔ سب سے پہلی تبدیلی یہ ہوئی کہ جماعت کی دینی دعوت کو ایک تحریک کی شکل دی جانے لگی۔ میں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ نہ آنحضرت ﷺ کوئی لیڈر ہیں اور نہ اسلام کوئی تحریک ہے۔ یہ اللہ کا دین ہے، اسے اسی حیثیت سے پیش کیا جانا چاہیے۔ لیکن میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بے تکلفی سے آنحضرت ﷺ کو ایک لیڈر کی حیثیت سے پیش کیا جانے لگا۔ مولانا مودودی دعوتِ دین کے لیے 'تحریک' کا لفظ بکثرت استعمال کرتے رہے۔ میں نے ان سے کہا دنیا میں نجانے کتنی شیطانی تحریکیں چل چکی ہیں لیکن دین تو ایک ہی ہے اور لیڈر تو بڑے بڑے شیطان بھی ہوئے ہیں لیکن خاتم الانبیاء تو آنحضرت ﷺ ہی ہیں۔ اس لیے یہ اصطلاحات دین کے وقار کو بڑھائیں گی نہیں بلکہ انہیں ختم کر دیں گی۔ مولانا مودودی جواب میں کہتے رہے کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔ لیکن وہ اور ان کے بعض ساتھی اسی انداز میں لکھتے رہے اور یہ چیزیں آہستہ آہستہ بڑھتی گئیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ایک نیا فلسفہ پیدا ہوا کہ تحریکیں اصولوں اور نظریات کی بنا پر نہیں بلکہ 'شخصیت' کی بنا پر چلتی ہیں اور شخصیت آپ سے آپ نہیں بنتی بلکہ بنائی جاتی ہے۔ اس لیے جب تک وہ لوازم اختیار نہیں کیے جائیں گے جو شخصیت بنانے کے لیے ضروری ہیں اس وقت تک یہ کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مجھے معلوم ہوا کہ مولانا مودودی اس نظریے سے بڑے متاثر ہیں۔ چنانچہ میں نے ان سے مختلف ملاقاتوں میں مل کر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ اول تو میں دین کے تحریک ہونے ہی کا مخالف ہوں، تاہم اگر یہ مان بھی لیا جائے تو شخصیت آپ سے آپ، اپنے عمل سے پیدا ہوتی ہے، مصنوعی طریقے

سے پیدا نہیں ہوتی۔ آپ جو خدمت کر رہے ہیں یہی خدمت آپ کو بنائے گی۔ اگر اس مقصد کے لیے مصنوعی طریقے اختیار کیے گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کے لیے بھی وہی سارے طریقے اختیار کیے جائیں گے جو عام دنیا دار لیڈر اختیار کرتے ہیں۔ مولانا مودودی میری باتیں حسب عادت بڑی توجہ سے سنتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے یہی چیز نہیں مانی، بلکہ یہ قبول کر لیا کہ انہیں 'لیڈر' ہی بننا ہے۔ چنانچہ عام سیاسی لیڈروں والے سارے طریقے اختیار کیے گئے۔ جہاں گئے وہاں پہلے سے اطلاع پہنچ جاتی کہ استقبال کیا جائے۔ سٹیشن پر لوگ آئیں اور خیر مقدم کریں۔ تمام نعرے وغیرہ ایجاد ہو گئے اور ہر قدم پر تصویریں لی جانے لگیں۔

اس کے بعد مولانا مودودی کے بعض خوشامدی قسم کے ساتھیوں نے ان سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب اس ملک کے عوام مسلم لیگی قیادت کو آپ کی قیادت سے تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے عوام میں بڑی بے چینی پائی جاتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ مولانا مودودی کے دل میں یہ خیال نہ صرف جڑ پکڑ گیا ہے بلکہ وہ واقعی ایسا سمجھنے لگ گئے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان پر واضح کیا کہ یہ محض ایک وسوسہ ہے کہ اس ملک کے عوام مسلم لیگی قیادت کو ہماری قیادت سے بدلنا چاہتے ہیں۔ یہ ابھی بہت دور کی چیز ہے۔ فی الحال اس کا کوئی امکان نہیں۔ ہمارے اور آپ کے حصے میں اگر ہم صحیح طریقے سے کام کریں تو پھانسی اور جیل ہی ہے۔ انہوں نے کہا 'مولانا آپ مایوس نہ ہوں۔' میں نے کہا: میں بالکل مایوس نہیں ہوں جو حقیقت ہے وہی بیان کر رہا ہوں کہ یہ ملک مسلم لیگی قیادت کو آپ کی قیادت سے تبدیل کرنے پر تیار نہیں!' مولانا مودودی نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ ایسی کسی غلط فہمی میں نہیں ہیں لیکن عملاً جو کچھ ہوتا رہا اس سے معلوم ہوا کہ اب گاڑی اسی رستہ پر چل پڑی ہے اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ

جو جتھہ بندی کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں' اب اس ملک کے ارباب اقتدار سے اس کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ بالآخر الیکشن کا مرحلہ پیش آ گیا۔

اس وقت میری اور میرے بعض ہم خیال دوستوں کی رائے یہ تھی کہ جماعت کے لیے اس الیکشن میں حصہ لینا مناسب نہیں ہوگا۔ لیکن ہم اس کی بہت شدت کے ساتھ مخالفت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا مودودی کا ذہن چونکہ الیکشن لڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا اس لیے وہ میدان میں ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے اتر گئے اور ان کے وہ ساتھی جو اسی طرح کے کسی موقع کے انتظار میں تھے، انہوں نے الیکشن کے لیے پوری سرگرمی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ اس الیکشن کا نتیجہ یہ نکلا کہ جماعت کو بری طرح شکست ہوئی۔ جتنے امیدوار جماعت کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے ان میں سے شاید کوئی بھی اپنی ضمانت واپس نہ لے سکا۔ اخلاقی حیثیت سے جماعت نے سنگین غلطیوں کا ارتکاب کیا اور ان تمام اخلاقی و مذہبی اصولوں کو پامال کر ڈالا جن کا وہ اب تک اعلان کرتی رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں جماعت میں ایک شدید قسم کی بے چینی پیدا ہوئی کہ ہم کس لیے اٹھے تھے! ہمارے دعوے کیا تھے! ہم آج تک کیا اعلان کرتے آئے! اور کس طرح ہم نے سب کچھ ایک ہی آزمائش میں کھو کر رکھ دیا۔ اس شدید بددلی کی وجہ سے شوریٰ نے مجبور ہو کر ایک جائزہ کمیٹی قائم کی کہ وہ حالات کا جائزہ لے اور تحقیقات کے بعد مفصل رپورٹ شوریٰ میں پیش کرے کہ اس میں کیا غلطیاں ہوئیں اور ان غلطیوں کے ذمہ دار کون ہیں؟ چار نہایت ذمہ دار ارکان شوریٰ اس کے لیے منتخب کیے گئے۔ انہوں نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ ہر جگہ ارکان جماعت کے بیانات لیے اور کئی مہینوں کی محنت شاقہ کے بعد ایک رپورٹ مرتب کی۔ یہ رپورٹ جب امیر جماعت کو ملی تو بدقسمتی سے امیر جماعت نے اسے اپنے اوپر ایک چارج شیٹ سمجھ لیا کہ مجھے مطعون کرنے اور ملزم بنانے کی

ایک سازش کے تحت یہ رپورٹ مرتب کی گئی ہے۔ تاہم جب شوریٰ میں اس رپورٹ پر غور ہوا تو شوریٰ نے فی الجملہ اس کا اعتراف کیا کہ کچھ غلطیاں ہوئی ہیں لیکن یہ ایسی غلطیاں نہیں ہیں جو مایوس کن ہوں۔ ایسی غلطیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ آئندہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی شوریٰ نے یہ بھی کہا کہ اصلاح معاشرہ کے لیے جماعت کی بنیادی دعوت پر زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے فی الحال کسی انتخابی مہم کے لیے کام کرنا قبل از وقت ہوگا۔ شوریٰ میں متفقہ طور پر جائزہ کمیٹی کے ارکان کا شکریہ بھی ادا کیا گیا کہ انہوں نے بڑی محنت سے پوری معلومات فراہم کی ہیں۔ اگر وہ رہنمائی بھی دے دیتے تو ان کا حق تھا تاہم شوریٰ ان کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پر شوریٰ کے اس فیصلے کے بعد، میرے نزدیک شوریٰ نے اس بحران پر جو انتخابات میں حصہ لینے سے پیدا ہو گیا تھا، قابو پالیا۔ لیکن مولانا مودودی کے دل میں جو یہ خلش پیدا ہو گئی تھی کہ یہ رپورٹ میرے اوپر ایک چارج شیٹ ہے وہ ان کے دل سے نکلی نہیں اور جس دعا اور درود پر شوریٰ کا اجلاس ختم ہوا تھا۔ انہوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ شوریٰ کے اجلاس سے واپس آکر انہوں نے جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان کے خلاف ایک چارج شیٹ مرتب کی جس میں ان پر یہ الزام لگایا کہ چونکہ آپ حضرات ایک نادانستہ سازش کے مرتکب ہوئے ہیں اس لیے میں آپ کو ہدایت کرتا ہوں کہ استعفیٰ دے دیں۔ ورنہ میں آپ کے حلقے کے ارکان کو لکھوں گا کہ وہ اپنے حلقے سے دوسرے ارکان منتخب کر کے بھیجیں۔

مولانا مودودی کا یہ اقدام اخلاق، عدل، جماعت کے دستور، اس کی روح سب کے صریحاً منافی تھا۔ مجھے ان کے اس رویے سے بڑی مایوسی اور بددلی ہوئی۔ میں ان سے ملا اور ان سے کہا کہ آپ کا یہ اقدام بالکل غلط ہے ایسا نہ

کیجیے۔ جن لوگوں کو آپ کے احکام پہنچ گئے ہیں انہیں واپس لیجیے اور جن کو نہیں پہنچے انہیں روک دیجیے۔ ورنہ یہ چیز بڑے حادثے پر منتج ہوگی۔ مولانا مودودیؒ مجھے تسلی دیتے رہے کہ اس پر غور کر لیا جائے گا، لیکن عملاً وہ اسی پر بضد رہے۔ ایک رکن کو ابھی نوٹس نہیں بھیجا گیا تھا جس سے میں یہ سمجھا کہ شاید صورت حال لیت ولعل کی ہے، لیکن جب انہیں بھی نوٹس بھیج دیا گیا تو میں سمجھ گیا کہ اب یہ قطعی فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس موقع پر میں نے انہیں ایک خط لکھا جس میں اس نوٹس پر پوری طرح تنقید کی اور یہ واضح کیا کہ کسی بھی پہلو سے یہ اقدام درست نہیں ہے۔ میرا یہ خط ایک تاریخی خط ہے جو کچھ عرصہ بعد پریس میں بھی شائع ہو گیا تھا(۲) اور اسے پڑھ کر عمر بہاء الامیری نے — جو اس زمانے میں پاکستان میں شام کے سفیر ہوا کرتے تھے مجھے لکھا کہ انت کتبت ھذا الکتاب کما یکتب القاضی المقضاء ولکن فیہ بعض لخشونہ' (— آپ نے خط ایسے لکھا ہے جیسے قاضی فیصلہ لکھتے ہیں لیکن قدرے ترش ہے)۔

مولانا مودودی نے مجھے اس خط کا تو کوئی جواب نہیں دیا البتہ وہ ڈرامائی انداز سے جماعت اسلامی کی امارت سے مستعفی ہو گئے۔ وہ ایسے استعفے پہلے بھی دیتے تھے اور ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ارکان کے دلوں میں میرے اور دیگر اختلاف کرنے والوں کے بارے میں بدگمانی پیدا کی جائے۔ چنانچہ ان کے خوشامدی قسم کے ساتھی کہتے تھے کہ 'کچھ لوگ ہیں جو مولانا کے اضطراب کا باعث ہوتے ہیں اور انہیں تکلیف دیتے ہیں۔' اسی صورت حال میں جبکہ مولانا مودودی نے استعفیٰ دے رکھا تھا، ماچھی گوٹھ، ضلع رحیم یار خان میں، جماعت اسلامی کا اجتماع ارکان ہوا اور وہاں انہوں نے مختلف طریقوں سے جماعت کے دستور میں ایسی ترامیم کرائیں جن کی بنا پر سارے اختیارات عملاً ان کی ذات میں مرتکز ہو

۲۔ یہ خط مقالات اصلاحی حصہ اول میں شامل ہے۔

گئے۔ اس دوران بعض احباب مجھے یہ یقین دلاتے رہے کہ وہ صورت حال کی اصلاح کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر بالآخر انہوں نے بھی مایوسی کا اظہار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف جائزہ کمیٹی کے ارکان الگ ہوئے بلکہ وہ شوریٰ بھی ختم ہوگئی جو مولانا مودودی کے نقطہ نظر سے اختلاف کرسکتی تھی۔ صرف وہ لوگ رہ گئے جن کا ایمان یہ تھا کہ دین لائے تو رسول اللہ ﷺ مگر اس کو سمجھا صرف مولانا مودودی نے ہے؟

میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کو گوارا کرلوں۔ اگر میں اسے گوارا کر لیتا تو میرا ضمیر مردہ ہو جاتا۔ میں نے آخری حد تک رعایت دی۔ جب مزید رعایت دینے کی گنجائش نہ رہی تو مجبور ہوگیا کہ استعفیٰ دے کر جماعت سے الگ ہو جاؤں۔ تقدیر نے دھکا دے کر مجھے جس گڑھے میں ڈالا تھا، تقدیر ہی نے مجھے اس سے نکالا بھی!

سوال: جب آپ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے اس وقت جماعت کا نصب العین اور طریق کار کیا تھا اور اس میں بڑے انحرافات کون سے ہیں؟ نیز یہ بتایئے کہ آپ کے استعفیٰ دینے کا فوری سبب کیا واقعہ بنا؟

جواب: میں جماعت میں، جیسا کہ میں نے ذکر کیا، ایک حادثے کے طور پر شامل ہوا ہوں، لیکن اس وقت جماعت کا نصب العین واقعتاً یہی تھا کہ وہ انبیاء کی طرز پر اقامت دین کا کام کرنے کے لیے اٹھی تھی۔ جماعت کی تحریروں، تقریروں غرض ہر چیز میں یہی بیان کیا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں پاکستان کا قیام قریب آتا گیا وہ تبدیلیاں آنی شروع ہوئیں جن کا میں نے ذکر کر دیا ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد یہ محسوس ہونے لگا کہ مولانا مودودی جماعت کی سرگرمیوں کو اب محض انتخابات کے لیے مخصوص کرنا چاہتے ہیں۔ انتخابات میں شکست اور بعد کے واقعات نے

یہ چیز اور نمایاں کر دی کہ اقامت دین کی بساط اب لپیٹی جا چکی ہے اور مولانا مودودی ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے اور دین کے نام پر کچھ سیاسی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔

دوسری چیز یہ تھی کہ مولانا مودودیؒ نے مختلف طریقوں سے وہ شوریٰ ختم کر دی جو ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کرسکتی تھی۔ اس سے پہلے شوریٰ میں مولانا مودودی کی رائے سے اختلاف بھی ہوتا تھا، ان پر گرفت بھی ہوتی تھی اور بسااوقات ان کے خوشامدی قسم کے ساتھیوں پر تنقید بھی ہوتی تھی۔ مولانا مودودی نے پہلے اپنے آمرانہ حکم کے ذریعے جائزہ کمیٹی کے ارکان کو الگ کیا، پھر ایسا طرز عمل اختیار کیا جس سے بددل ہوکر اپنی رائے رکھنے والے بیشتر ارکان الگ ہوگئے۔ جماعت میں اپنی رائے رکھنے والے لوگ زیادہ نہیں تھے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ شاید ساٹھ ستر کے قریب لوگ الگ ہوئے ہوں گے۔ تشکیل جماعت کے وقت جتنے چوٹی کے لوگ اس میں شریک تھے، سبھی یکے بعد دیگرے علیحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد صرف وہ لوگ رہ گئے جو مولانا مودودی کے اندھے بہرے عقیدت مند تھے۔ جن میں مولانا مودودی سے اختلاف کرنے کی صلاحیت تھی نہ جرأت۔ بلکہ کچھ ایسے موقع پرست بھی تھے جو یہ چاہتے تھے کہ جماعت سیاسی اقتدار کی بازی کھیلے تاکہ انہیں بھی کچھ موقع ملے۔

اگرچہ اس طرح کی جی حضور، قسم کی شوریٰ سے کسی اختلاف کی توقع عبث تھی تاہم مولانا مودودیؒ نے آئندہ کی کسی سرکشی سے بچنے کے لیے دستور جماعت میں ایسی ترامیم کرائیں جن سے تمام اختیارات عملاً ان کی ذات میں مرتکز ہوگئے۔ اس سے پہلے امیر اور شوریٰ کے اختیارات کے بارے میں جو طے تھا اس پر سبھی مطمئن تھے لیکن مولانا مودودی نے اپنے لیے ان اختیارات کا مطالبہ کیا جو حالت جنگ میں کسی ملک کے سربراہ کو حاصل ہوتے ہیں اور بالآخر جماعت

میں ایک خلاف اسلام آمریت نافذ کردی گئی۔ یہ تیسرا بڑا انحراف تھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر بیس بائیس ارکان پر مشتمل شوریٰ کی بجائے تقریباً پچاس ارکان پر مشتمل شوریٰ بنائی گئی۔ اس شوریٰ کو عاملہ کی بجائے ایک کونسل کی حیثیت دے دی گئی اور اس میں سے پندرہ سولہ ارکان پر مشتمل ایک عاملہ کو نامزد کیا گیا۔ اس عاملہ کو گو وسیع اختیارات دیے گئے تھے لیکن عملاً یہ سارے اختیارات امیر جماعت کی ذات میں مرتکز ہوگئے۔ کیونکہ ترمیم شدہ دستور کے مطابق امیر جماعت اس عاملہ کی اکثریت کی رائے کے پابند نہیں تھے، وہ ساری عاملہ یا عاملہ کے ناپسندیدہ ارکان کو جب چاہیں معزول کرسکتے تھے۔ جس عاملہ کی اکثریت کی رائے کا امیر جماعت پابند نہ ہو بلکہ اس کے برعکس عاملہ کے تمام ارکان اس کے رحم و کرم پر ہوں تو ایسی عاملہ کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے؟ ترمیم شدہ دستور کی رو سے عملاً صورت حال یہ تھی کہ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا اجلاس سال میں ایک بار ہوتا تھا۔ اس دوران میں مولانا مودودی عاملہ — جسے دراصل مشاورتی کمیٹی کہنا چاہیے — کی مدد سے جو دل چاہے کرتے رہیں وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں تھے۔ میں مولانا مودودی کے ان آمرانہ اقدامات پر سخت معترض تھا اور میں نے اس پوری کارروائی میں شرکت نہیں کی۔ مولانا مودودی نے مجھے بھی اس عاملہ کا رکن نامزد کیا تھا لیکن ایسی بے اختیار عاملہ میں شریک ہونا میں نے گوارا نہیں کیا۔ جس جماعت کا اپنا نظام آمرانہ ہو وہ دوسروں کے آمرانہ عزائم کی کیسے مذمت کر سکتی ہے اور عوام کو کیسے یہ یقین دلا سکتی ہے کہ اگر نظام حکومت اس کے ہاتھ میں آجائے تو ملک کا نظام جمہوری طرز پر استوار ہوگا؟

یہ بڑے انحرافات تھے جس کی بنا پر جماعت کا نصب العین، دستور، نظام سب بدل گیا اور جماعت نے پیری مریدی کے نظام یا مطلق آمریت کی شکل اختیار کرلی!

استعفیٰ دینے کا فوری سبب یہ تھا کہ مولانا مودودی نے ایک خط چودھری غلام محمد صاحب(۳) کو لکھا اور اس میں میرے بارے میں یہ لکھا کہ جتنی نازبرداری میں نے مولانا اصلاحی کی کی ہے اتنی کسی اور کی نہیں کی۔ لیکن کچھ عرصہ سے مولانا کا رویہ یہ ہے کہ میرے خاص احباب پر برابر دل شکن فقرے کستے رہتے ہیں۔ اس خط کو مجھے بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن مولانا مودودی نے اس کی ایک نقل مجھے بھی بھیج دی۔ اس خط کو پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے استعفیٰ دینے میں دیر لگائی ہے۔ چنانچہ میں نے اسی وقت استعفیٰ لکھا اور جواب میں یہ بھی لکھا کہ اگر آپ نے ایسے شخص کی نازبرداری کی جو اس کا اہل نہیں تھا تو اپنے آپ کو کوسیے اور اگر وہ اس کا اہل تھا تو آپ نے کوئی احسان نہیں کیا۔ اس لیے اس نازبرداری کو جتلا کر مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ اس کے بدلے میں ضمیر فروشی کروں گا۔ اگلے روز مولانا مودودی میرے پاس آئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔ میں نے کہا: 'یہ استعفیٰ واپس لینے کے لیے نہیں ہے! میرا خیال ہے میں نے آپ کو اچھی طرح جان لیا اور آپ نے مجھے! هذا فراق بینی و بینک! اب ہم شاید کبھی مجتمع نہیں ہو سکیں گے!' مولانا مودودی صاحب خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے اور جماعت سے میری علیحدگی ہوگئی۔

سوال: اختلاف کرنے والے حضرات کیا جماعت کے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے خلاف تھے؟

جواب: اختلاف کرنے والے حضرات جماعت کے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مخالف نہیں تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ جماعت کبھی بھی سیاست میں حصہ نہ لے۔ بلکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ جب حالات سازگار ہوں تو انتخابات میں حصہ لینے

۳۔ امیر جماعت اسلامی کراچی جو عارضی طور پر امیر جماعت بنے اور ماچھی گوٹھ کا اجتماع منعقد کرایا۔

میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک ضمنی کام ہو گا۔ جماعت کا اصل نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ معاشرے کی اسلامی خطوط پر اصلاح کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جماعت کی طاقت اتنی نہیں تھی کہ وہ ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے میدان میں اتر جائے۔ ہمارا خیال تھا کہ فی الحال سیاسی سرگرمیوں کو کم کر کے تعلیم، تربیت اور تنظیم کے کام کو آگے بڑھایا جائے تا کہ جماعت کی قوت اتنی بڑھ جائے کہ یہ ملکی سیاست پر اثر انداز ہو سکے۔ یہی اس شوریٰ نے بھی طے کیا تھا جس کے چار اہم ارکان کو مولانا مودودیؒ نے اپنے آمرانہ حکم کے ذریعے الگ کیا، کہ فی الحال سیاسی سرگرمیوں کو معطل کر دیا جائے۔ یہی چیز بڑی بحث و تمحیص اور کئی حضرات کے بیچ میں پڑنے کے بعد ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں طے ہوئی تھی کہ جماعت اپنی مختلف سرگرمیوں میں توازن قائم رکھے گی۔ جماعت کے سیاست میں حصہ لینے سے کبھی بھی کسی کو انکار نہیں رہا۔ یہ تو محض مجرم بنانے کے لیے کہا جانے لگا کہ یہ حضرات تو اس کو تبلیغی جماعت بنانا چاہتے تھے۔

سوال: آپ کی رائے میں جماعت اب اقامت دین کی تحریک نہیں رہی؟

جواب: جی نہیں! یہ قافلہ گم کردہ راہ ہے۔ یہ قائم تو اقامت دین کے لیے ہوئی تھی مگر اس کے لیڈروں نے اسے اٹھا کر غلط راستے پر ڈال دیا۔ اسمبلی کی چند سیٹوں کی خاطر انہوں نے اپنا سب کچھ بدل ڈالا۔ شہادت حق کے نعرے کھوکھلے ہو گئے۔ اب بس یہی منتہائے مقصود ہے۔ اب تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہ نہ دینی جماعت ہے نہ سیاسی! سیاسی لحاظ سے اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں جماعت کے بارے میں مولانا مودودی کو لکھا تھا اور میرے اس جملے پر بعض لوگ معترض بھی ہوئے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے صحیح لکھا تھا کہ 'مولانا یہی حرکتیں ہیں جن کی بنا پر لوگ جماعت کو مذہبی بہروپیے اور سیاسی چغد کہتے ہیں!'

سوال: جماعت سے نکل کر جانے والوں کے بارے میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے الگ سے جماعت کیوں نہیں بنائی؟

جواب: یہ سوال سادگی پر مبنی ہے۔ جماعت بنانا اور پھر غلط مقاصد کے لیے اسے چلا کر ایک فتنہ کھڑا کر دینا، سعادت دارین کمانا نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کے اس واقعے سے ہمیں بڑا تجربہ ہوا کہ یہ کوئی آسان بازی نہیں ہے اور نہ ہر کسی کا ظرف ہی ہے۔ بڑے ہمہمہ اور بڑے اچھے ارادوں کے ساتھ یہ کام شروع کیا گیا تھا لیکن مولانا مودودی نے جس طرح اسے بگاڑا اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر بیٹھے تھے۔ اس کے بعد سب لوگوں نے اپنے لیے مفید کام نکال لیے۔ اگر جماعت میں رہتے تو اس فساد ہی کو تقویت دینے کا باعث بنتے جس میں جماعت مبتلا ہو گئی تھی۔ جماعت سے نکل جانے کے بعد انہوں نے نہایت عمدہ تعلیمی، مذہبی اور دینی کام کیے ہیں جو وہ جماعت میں رہتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ میں خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ جماعت سے الگ ہونے کے بعد دین اور اس اُمت کی جو خدمت میں نے کی ہے، وہ میں جماعت میں رہ کر نہیں کر سکتا تھا۔

رہے ایسے لوگ جو جماعتیں بنانے کے حوصلہ مند ہوتے ہیں تو ان کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ انہوں نے جو جماعتیں بنائی ہیں اسی سے صاف ظاہر ہے کہ جماعتیں بنانے والوں کا خاندان ایک ہی ہے۔ یہ لوگ دین کے نام پر جماعتیں بناتے ہیں اور کچھ ہی عرصے کے بعد اس فتنے میں پڑ جاتے ہیں کہ جو جتھہ بندی کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں اس کی قیمت وصول کی جائے۔ ہم نے اس خطرے کو مول لینا نہیں چاہا۔ ہمارے مقاصد یہ نہیں تھے۔ اپنی صلاحیت کے مطابق ہم نے ملت کی خدمت کی ہے۔ پوری ملت ہماری جماعت ہے، ہم اس کے خادم ہیں۔ امت مسلمہ کی خدمت کرنا ہمارے واجبات دینی میں سے ہے۔ اس امت میں سے ایک عضو کو کاٹ کر ایک الگ سے جماعت بنا دینا کوئی

دینی ذمہ داری نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ کی یہ رائے جماعت میں شامل ہونے کے بعد بنی ہے؟

جواب: یہ جماعت میں شامل ہونے کے بعد تلخ تجربہ ہوا۔ پہلے تو ہم یہی سمجھے تھے کہ ہم پوری ملت کی خدمت کریں گے لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ ہم نے جسد ملت سے گوشت کاٹ کر اپنی دوکان سجالی ہے اور اب بس اسی دوکان کو چلانا چاہتے ہیں۔ اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق ملت کی خدمت کرے۔ ایسے لوگ اگر نیک نیت ہوں گے تو ان میں خود بخود اشتراک ہو جائے گا۔ یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ آپ کسی جماعت کے تحت ڈسپلن میں جکڑے ہوئے ان کے مقاصد کے لیے استعمال ہوں۔ آپ اپنی صلاحیتیں ملت کے مصالح کے لیے وقف کریں۔ نیک نیتی سے کام کرنے والوں میں خود بخود ایک قدرتی اور فطری تعاون ہو جاتا ہے۔ میں اگر جماعت میں ہوتا تو اس کام کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکتا تھا جو میں نے جماعت چھوڑنے کے بعد کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے ذہن کو تبدیل کرنے میں میرے اکیلے کی اس جدوجہد کا وزن ایسی کسی جماعت سے زیادہ ہے۔

سوال: قیام پاکستان کے وقت جماعت اسلامی کا مسلم لیگ سے کوئی رابطہ یا تعاون تھا؟

جواب: اس زمانے میں مسلم لیگ اپنے شباب پر تھی۔ اسے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی کیا پروا ہو سکتی تھی؟ اس کے قائد اس وقت بھی اتنے اونچے تھے کہ ان سے کسی خاص قسم کے رابطے یا تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جماعت اور مسلم لیگ میں ایک طرح کی رقابت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ پاکستان بننے کے کچھ ہی دیر بعد مسلم لیگ نے یہ کہہ کر ہمیں گرفتار کر لیا کہ پاکستان ابھی قائم ہوا ہے اور یہ لوگ اس میں اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

سوال: کیا جماعت کا تحریکِ پاکستان میں کوئی حصہ ہے؟

جواب: تقسیم سے پہلے جماعت کا کام، پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ پاکستان کے حق میں تھا۔ متحدہ قومیت کی مخالفت میں اس کے لیڈر نے نہایت شاندار کام کیا۔ جماعت نے مسلمانوں کی الگ ریاست بنانے کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ البتہ یہ ہے کہ یہ ریاست کن اصولوں پر قائم ہونی چاہیے اس امر پر اختلاف تھا۔ مسلم لیگ اسے قومی اصولوں پر قومی ریاست (Nationalist State) بنانا چاہتی تھی جبکہ جماعت یہ چاہتی تھی کہ ذہنوں کو اس امر پر تیار کیا جائے کہ یہ ریاست اسلامی اصولوں پر قائم ہو۔ لیکن یہ اختلاف ایسا نہیں تھا جو قیام پاکستان میں رکاوٹ بن سکتا ہو۔ اسے بعض لوگوں نے اگر رکاوٹ سمجھا ہے تو یہ غلطی ہے۔

سوال: آپ کہا کرتے ہیں کہ آپ جماعت اسلامی میں ایک حادثے کے طور پر شامل ہوئے۔ براہ کرم یہ بتائیے کہ شمولیت کے بعد سترہ سال تک جماعت سے وابستگی کی کیا وجہ رہی؟

جواب: اصلی حقیقت تو یہی ہے کہ میں جماعت میں اپنی خواہش اور ارادہ سے داخل نہیں ہوا، بلکہ داخل کر لیا گیا تھا۔ لیکن داخل ہونے کے بعد اتنی طویل مدت تک اس میں جو پڑا رہا تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جماعت کے اندر میری حیثیت ایک عام رکن کی نہیں تھی، بلکہ داخل ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا مودودی مرحوم نے مجھے اصرار بلکہ مجبور، کر کے مرکز میں بلالیا اور جماعت سے متعلق بہت سی ذمہ داریاں میرے سپرد کر دیں۔ یہاں تک کہ علماء اور مشائخ کے اعتراضات کے جواب دینے کا بوجھ بھی میرے ہی اوپر ڈال دیا گیا۔ ان کاموں میں ہاتھ ڈال دینے کے بعد میرے لیے ہٹنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اگر میں ہٹتا تو یہ محاذ سے فرار ہوتا اور میں یہ ننگ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر یہ بات

بھی تھی کہ مولانا مودودی یہ غلط نہیں کہتے تھے کہ انہوں نے جتنی ناز برداری میری کی ہے اتنی کسی کی بھی نہیں کی ہے۔ علاوہ ازیں جماعت کی مجلس شوریٰ میں میری حیثیت ایسی تھی کہ مولانا مودودی میری تائید حاصل کیے بغیر اپنی کوئی بات اس سے منوا نہیں سکتے تھے۔ ایسے حالات میں کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں جماعت سے الگ ہوتا۔ لیکن جب مولانا نے جماعت کے دستور کے خلاف ایسے اقدامات کیے جن کے بعد وہ ایک پیر بن گئے اور جماعت ان کے مریدوں کی جماعت بن کر رہ گئی تو مجھے اس سے الگ ہونے کے لیے ایک معقول عذر ہاتھ آگیا اور میں اس سے الگ ہو کر اپنے ان کاموں میں لگ گیا جن کے لیے جماعت کے اندر ہوتے ہوئے، میں کوئی وقت نہیں نکال سکتا تھا۔

سوال: مولانا منظور نعمانی صاحب اور بعض دیگر احباب جماعت میں شامل ہونے کے کچھ ہی دیر بعد علیحدہ ہوگئے۔ مولانا منظور نعمانی صاحب علیحدگی کے بعد آپ سے سرائے میر، اعظم گڑھ میں ملے تھے، اس وقت ان کی علیحدگی کی وجوہ کیا تھیں اور آپ کا ردِعمل کیا تھا؟

جواب: مولانا نعمانی کے بیانات اور بعض تحریروں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ جماعت کا امیر بن جانے کے بعد مولانا مودودی اپنے آپ کو بدل کر تقویٰ کے اس معیار کے مطابق بنالیں گے جو اس کام کے لیے مطلوب ہے۔ لیکن ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے وہ الگ ہوگئے۔ میرے دل میں مولانا نعمانی کے لیے بڑی عزت و محبت ہے، لیکن میں نے ان کے اس گمان کو محض ان کی سادہ دلی پر محمول کیا۔ مولانا مودودی سے متعلق میں نے اپنی رائے شروع ہی میں مولانا نعمانی سے عرض کر دی تھی اور میں اس پر اب بھی قائم ہوں۔ تقویٰ اوّل تو صبح و شام میں پیدا ہونے والی چیز نہیں اور ہو بھی تو میں خود اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ دوسروں کے تقویٰ کو ناپ سکوں۔

سوال: کیا جماعت اسلامی نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی؟

جواب: جماعت اسلامی، پاکستان کے قیام کی مخالف ہرگز نہیں تھی۔ مولانا مودودی نے متحدہ قومیت کے نظریہ پر جو تنقیدی مضامین لکھے وہ بہت شاندار تھے۔ البتہ پاکستان کے قیام کے بعد وہ اس خبط میں ضرور مبتلا ہو گئے تھے کہ اب پاکستان کی قیادت کے اصلی حقدار وہ ہیں، نہ کہ مسلم لیگی لیڈر۔ مزید برآں وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہو گئے تھے کہ اب ملک ان کی قیادت کے خیر مقدم کے لیے بے چین ہے۔ میں نے ان کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی بہتیری کوشش کی، لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

سوال: جہادِ کشمیر کے بارے میں جماعت کا مؤقف کیا تھا اور آپ کی اس ضمن میں کیا رائے تھی؟

جواب: کشمیر کے مسئلہ پر جب مولانا مودودی صاحب نے اظہار خیال کیا میں راولپنڈی میں تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے شوریٰ سے مشورہ کے بعد رائے ظاہر کی تھی، یا مشورہ کے بغیر! مجھے اخبارات سے صرف یہ اندازہ ہوا کہ وہ کشمیر میں پٹھانوں کی مداخلت کو ایک غیر منظم بھیڑ کی مداخلت خیال کرتے ہیں، اس وجہ سے اس کو جہاد کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں نے راولپنڈی سے خط لکھ کر ان کو توجہ دلائی کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے حکومت پاکستان کے ایماء پر ہو رہا ہے اور موجودہ حالات میں یہی طریقہ ممکن ہے، لیکن میرا خط پہنچنے سے پہلے ہی وہ بھی گرفتار کر لیے گئے اور میں بھی راولپنڈی میں دھر لیا گیا۔

سوال: ۱۹۴۸ء میں جماعت کے چند بزرگوں نے طالب علموں کی ایک تنظیم، اسلامی جمعیت طلبہ کے نام سے، قائم کی۔ اس وقت اس تنظیم کا قیام کس وجہ سے عمل میں لایا گیا تھا؟ کیا اس سے جماعت کی سیاسی قوت کو مضبوط کرنا مقصود تھا؟

جواب: مجھے اچھی طرح یہ علم نہیں ہے کہ اسلامی جمعیت طلبہ، اصلاً کس مقصد کے لیے قائم کی گئی تھی لیکن یہ بات میں خوب جانتا ہوں کہ جماعت اسلامی نے اس کو ہمیشہ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ میں شروع ہی سے طلبہ کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا شدید مخالف رہا ہوں۔ میں نے جماعت کے لیڈروں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ آج ہمیں ان طلبہ کی تربیت اس طرح کرنی چاہیے کہ یہ مستقبل میں اسلامی نظام کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں۔ لیکن جماعت کے لیڈروں نے میرا یہ نقطۂ نظر قبول نہیں کیا۔ وہ مجھے یہ سمجھاتے رہے کہ یہی تو ہماری فوج ہیں۔ اگر ہم ان کو استعمال نہ کریں گے تو ہماری لڑائی کون لڑے گا؟ میں نے ان لوگوں سے یہ بھی کہا کہ آج آپ لوگ طلبہ کو جس طرح استعمال کر رہے ہیں میرے نزدیک یہ بچوں کے اغوا سے بڑا جرم ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ میں ان لوگوں میں سے کسی ایک شخص کے دل میں بھی اپنی بات نہ اتار سکا!

سوال: آپ نے ایک زمانے میں، بعض علمائے کرام کے اعتراضات کے جواب میں، جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کی مدافعت کی ہے، کیا آپ اب بھی اس کو حق بجانب سمجھتے ہیں؟

جواب: میں نے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب مرحوم کی مدافعت میں جو مضامین لکھے ہیں درحقیقت اپنی مدافعت میں لکھے ہیں۔ ان اعتراضات کی زد، میرے جماعت میں ہونے کے سبب سے، مجھ پر بھی پڑتی تھی۔ اس وجہ سے میں نے جن اعتراضات کو غلط سمجھا ان کی تردید کی۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی بات مودودی صاحب کی بھی مجھے غلط معلوم ہوئی ہے تو میں نے اس کی بھی تردید کر دی ہے۔ مثلاً لامِ تملیک، تصوف اور تقلید کے بارے میں میں نے مودودی صاحب کی رائے کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اپنے ان مضامین کے بارے میں اب بھی میں وہی رائے رکھتا ہوں جو ان کے لکھنے کے وقت تھی۔ مودودی صاحب

کی ذات اور ان کے کردار کے بارے میں میری رائے میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ ماچھی گوٹھ اور اس کے بعد کے حوادث کے باعث ہوئی ہے۔

سوال: ۱۹۶۸ء میں رحیم یار خان میں ایک نئی تنظیم کے قیام کی کوشش کی گئی جو بالآخر کامیاب نہیں ہوئی۔ براہ کرم یہ بتائیے کہ اس نئی تنظیم کے قیام کا محرک کیا چیز بنی اور کیوں یہ کامیاب نہیں ہو سکی؟

جواب: ۱۹۶۸ء میں جو تنظیم قائم کی گئی تھی اس کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ اس میں جو لوگ منصب قیادت کے اہل تھے ان سب کی نظر منصب امارت کے لیے مجھ پر تھی، لیکن میں امیر کی حیثیت سے کسی تنظیم کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک کارکن کی حیثیت سے تو کچھ خدمت کے لیے میں تیار تھا، لیکن اس بات پر آمادہ نہیں تھا کہ اپنی ساری قوت اس پر صرف کروں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میری عمر کا بڑا حصہ جماعت اسلامی کی نذر ہو چکا تھا اور میں اب تک اپنے اصل کام تفسیر تدبر قرآن کو مزید مؤخر کرنے کی بالکل گنجائش نہیں پاتا تھا۔ میں اس کام کو دوسرے تمام کاموں پر مقدم سمجھتا تھا۔ تنظیم کے رفقاء اس کو اتنی اہمیت نہیں دے سکتے تھے جتنی اس کی اہمیت میری نگاہوں میں تھی۔ میرے اندر یہ کمزوری بھی ہے کہ میں ایک وقت میں دل جمعی سے صرف ایک ہی کام کر سکتا ہوں۔

علاوہ ازیں جماعت اسلامی کے تجربہ سے گزرنے کے بعد اب میرے اندر کسی نئے تجربہ کے لیے حوصلہ باقی نہیں رہا تھا۔ جس طرح مذہبی فرقے ملت کے لیے فتنہ ہیں، جس طرح پیروں کی گدیاں فتنہ ہیں اسی طرح یہ دین کے نام پر بننے والی جماعتیں بھی ملت کے لیے فتنہ ہیں۔ انہوں نے ملت کے جسم سے گوشت کاٹ کاٹ کر اپنی دکانیں سجالی ہیں۔ ان میں سے کسی کے اندر بھی

کوئی خیر نہیں ہے۔ صحیح طریقۂ خدمت یہ ہے کہ پوری ملت اسلامیہ کو اپنا مقصود بنائیں اور ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق خود کو جس خدمت کا اہل پائے وہ خدمت انجام دے اور کسی پہلو سے اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو کہ وہ کسی اعتبار سے ملت سے کوئی ممتاز اور بالاتر فرد ہے اور اس کی جماعت ہی دین کی حامل جماعت ہے۔

سوال: ڈاکٹر اسرار احمد صاحب علمی دنیا میں آپ کی وجہ سے روشناس ہوئے۔ بہت سے حلقوں میں ان سے اور ان کی تنظیم سے آپ کے تعلق کے بارے میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، براہ کرم یہ بتایئے کہ ان کا کس حد تک آپ سے تعلق رہا ہے اور ان کی تنظیم اسلامی اور دیگر دینی سرگرمیوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے متعلق آپ مجھ سے کوئی سوال نہ کریں تو آپ کی نوازش ہوگی۔ جس وقت ان کے رخ سے ذرا پردہ ہٹانے کی ضرورت تھی میں نے ایک خط لکھ کر اور اسرار نامہ (۴) لکھوا کر یہ پردہ ہٹا دیا تھا۔ اب وہ خود عریاں ہو کر تمام خلق کے سامنے آگئے ہیں اب میرا کچھ کہنا محض تحصیل حاصل ہے۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ ان کی وجہ سے میرے متعلق کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہے اور اگر کسی کے اندر کچھ ہے تو مجھے اس کی مطلق پروا نہیں ہے۔ اس دنیا میں

۴۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے پہلے انجمن خدام القرآن اور پھر تنظیم اسلامی بنائی تو ان دونوں اداروں کا محور ان کی ذات تھی اور قواعد و ضوابط شرعی لحاظ سے بھی قابل اعتراض تھا۔ پھر انہوں نے اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لیے طویل مضامین لکھے جن میں ادعاء کا انداز واضح تھا۔ اس پر مولانا نے یہ رائے دی کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ سارا نظام قادیانیوں کی نقل اور ان کے دعووں کا رنگ مرزا صاحب کے دعووں جیسا ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب سخت جز بز ہوئے تو اسرار نامہ کے عنوان سے ایک پمفلٹ میں مولانا کے موقف کے حق میں شواہد ڈاکٹر صاحب کی اپنی تحریروں سے پیش کر دیے گئے تھے۔ (مرتب)

بے وقوف بننے والے بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور بے وقوف بنانے والے بھی! یہ کارخانہ اسی طرح چلتا آیا ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا یوں ہی چلتا رہے گا۔ شیطان نے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی ہے اور یہ مہلت اس کو مل چکی ہے! آپ نو عمر آدمی ہیں، اس وجہ سے آپ کو یہ سوانگ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ہم بوڑھوں نے اپنی عمر میں اتنے تماشے دیکھے ہیں کہ اب کسی مداری کا کوئی کرتب بھی عجیب نہیں معلوم ہوتا۔ اللہ بڑا ہی حلیم ہے۔ اس قسم کے بوالفضولوں کو بھی مہلت دیتا ہے، لیکن بس چند دنوں کے لیے۔

سوال: بعض حضرات جماعت سازی کے حق میں بعض احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں، جن میں سے چند روایات یہ ہیں۔

(الف) علیکم بالجماعة وایاکم والفرقة (جامع الترمذی)
(تم پر لزوم جماعت فرض ہے اور انتشار سے بچو)

(ب) امرکم بخمس بالجماعة والسمع والطاعة والهجرة والجهاد فی سبیل اللہ
(میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ لزوم جماعت، سمع و طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد)

(ج) من فارق الجماعة شبرا فمات فمیتة جاهلیة
(جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اور اس کی موت آگئی تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے)۔

براہ کرم یہ بتایئے کہ ان احادیث کی توضیح اور موقع و محل کیا ہے؟

جواب: یہ حدیثیں سب صحیح ہیں۔ ان میں **الجماعة** سے مراد امت مسلمہ من حیث الجماعت ہے نہ کہ وہ ٹولیاں جو تفرقہ باز اور جاہل پمفلٹ فروش گلی گلی میں بناتے

پھر رہے ہیں۔ اس الجماعۃ سے وابستگی لازمۂ ایمان ہے۔ اس سے کٹ کر اپنی ایک الگ ٹولی بنانا تفریق ملت اور کفر ہے۔ **سمع و طاعت اور ھجرت و جھاد کی بیعت** صرف مسلمانوں کا صاحب امر لے سکتا ہے۔ ہرایرا غیرا یہ بیعت لینے کا مجاز نہیں ہے۔ ایک صحیح اسلامی حکومت میں اگر صاحب امر کے سوا کوئی دوسرا یہ بیعت لے تو صاحب امر اس کا سر قلم کرا سکتا ہے۔

سوال: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اقامت دین کے لیے نبی ﷺ کا طریقہ منصوص ہے۔ لہٰذا جس طرح حضور ﷺ نے جماعت بنائی اسی طرح ہمیں بھی جماعت بنانی چاہیے۔ نیز ان کا کہنا ہے کہ ہجرت و جہاد کے مراحل جماعت قائم کیے بغیر، کس طرح عمل میں آسکتے ہیں؟

جواب: اقامت دین کے لیے نبی ﷺ کا منصوص طریقہ تو بے شک ہے، لیکن ان لال بجھکڑوں سے پوچھیے کہ کیا اس منصوص طریقہ کا آغاز سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کی بیعت سے ہوتا ہے؟ نبی ﷺ نے زندگی کا جو طویل اور صبر آزما دور مکہ میں گزارا اس میں آپ نے لوگوں کے سامنے دین حق کی دعوت و شہادت پیش کی یا ان سے سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کی بیعت کا مطالبہ کیا؟ ان سے پوچھیے کہ انہوں نے پیدا ہوتے ہی جو ہجرت و جہاد کی بیعت لینی شروع کی ہے تو کیا اس کی کوئی شہادت حضور ﷺ کی مکی زندگی میں ملتی ہے؟ اگر یہ دعوت کے اس منصوص طریقہ کی پیروی کے مدعی ہیں جو پیغمبر ﷺ سے ثابت ہے تو انہوں نے حضور ﷺ کی زندگی سے مکی دور کو کیوں خارج کر دیا؟ سمع و طاعت کی بیعت تو میں نے عرض کیا کہ صرف صاحب امر لے سکتا ہے، اگر کوئی دوسرا اس کی جسارت کرے تو وہ اسلام میں مستحق سزا ہے۔ ہجرت کا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب داعی دعوت و شہادت کا فرض ادا کر چکتا ہے اور قوم اس کی اور اس کے ساتھیوں کی جان کی دشمن بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اور اس کے ساتھیوں

کو اپنا ایمان اور اپنی جان بچانے کے لیے کسی اور سرزمین کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ اوّل تو یہ ضروری نہیں کہ ہر داعی کو لازماً یہ مرحلہ پیش آئے، کتنے انبیاء ایسے گزرے ہیں جن کو یہ مرحلہ پیش نہیں آیا۔ تو آخر یہ حضرات ہجرت کے لیے اتنے بے چین کیوں ہیں کہ انہوں نے اسی سے بسم اللہ کی ہے؟ کیا یہ دعوت اور شہادت کے فرض سے فارغ ہو گئے؟ کیا ان کے لیے یہ سرزمین اتنی تنگ ہو چکی ہے یا اس کا اندیشہ ہے کہ اتنی تنگ ہو جائے گی کہ ان کو امریکا اور کینیڈا بھاگنا پڑے گا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ قبل از مرگ واویلا کیوں ہے؟ ابھی اطمینان سے دعوت کا کام کریں، کیا عجب کہ ان کے فیض سے یہی ملک دارالاسلام بن جائے! اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تو کینیڈا کا مرکز اسلامی تو موجود ہی ہے۔

ان ابوالفضولوں کو یہ بھی بتائیے کہ ہجرت اور جہاد کو مقصود بنا کر جماعت سازی کے بجائے معاشرہ کو اسلامی معاشرہ بنانے کی سعی کریں۔ ہجرت و جہاد کی حیثیت مقاصد کی نہیں، احوال و عوارض کی ہے۔ اگر اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے گا تو وہ عوارض کا بدل خود پیدا کر لے گا۔

لیکن اگر صحیح معاشرہ ہی وجود میں نہ آسکا تو نہ ہجرت کا خطرہ پیش آئے گا، اور نہ جہاد کا میدان گرم ہو سکے گا۔ جب تک اسلامی معاشرہ موجود نہیں، ہر مسلمان کی اصلی ذمہ داری اس معاشرہ کو وجود میں لانے کی جدوجہد کرنا ہے نہ کہ ہجرت و جہاد کے پروگرام بنانا اور عوام فریبی کے نعرے لگانا۔ معاشرہ کو مسلمان بنانے کے لیے اصل کام دعوت دین اور شہادت حق ہے اور یہ کام اس طرح انجام دینا ضروری ہے جس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام نے انجام دیا۔ اس میں جو ترتیب اور تدریج ہے وہ نبی ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی سے واضح ہوتی ہے۔ اس ترتیب کو اگر آپ نے الٹ دیا تو اس کی مثال یہ ہو گی کہ آپ بچوں کے سامنے وہ باتیں کرنی شروع کر دیں جو جوانوں یا

بوڑھوں کے سامنے کرنے کی ہیں۔

میں پورے اعتماد کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ دنیا میں کسی نبی نے بھی اپنی جماعت ہجرت و جہاد کی اساس پر نہیں بنائی۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ کتنے انبیاء علیہم السلام ایسے گزرے ہیں جن کو نہ ہجرت سے سابقہ پیش آیا نہ جہاد بالسیف سے، حالانکہ انہوں نے جماعت بھی بنائی اور اسلام کی دعوت کا فریضہ بھی انجام دیا۔

سوال: کیا نبی اور رسول کے اقامت دین کے طریق کار میں فرق ہے؟ ہمیں کس طریقے کی پیروی کرنی ہے اور کیوں؟

جواب: نبی اور رسول کے طریق کار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہر رسول لازماً نبی بھی ہوتا ہے۔ بس رسول اس اعتبار سے نبی سے مختلف ہوتا ہے کہ رسول اپنی قوم کے لیے آخری حجت اور فیصلہ کر دینے والی عدالت بن کر آتا ہے جبکہ نبی کی یہ حیثیت نہیں ہوتی۔ رسول کی قوم اگر اس کی تکذیب پر اڑی رہ جاتی ہے تو وہ اتمام حجت کے بقدر مہلت پانے کے بعد لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ خدا کے قہر سے تباہ ہو یا رسول کے پیروؤں کی تلوار سے! اسی طرح رسول کے لیے اپنے اعداء پر غلبہ حاصل کرنا لازمی ہے، عام اس سے کہ یہ غلبہ اس کو اس کی زندگی ہی میں حاصل ہو یا اس کی وفات کے بعد اس کے ساتھیوں کو حاصل ہو۔ لیکن نبی کے لیے ان امور کا ظہور ضروری نہیں ہے۔ کتنے انبیاء گزرے ہیں جن کی قوموں نے ان کو قتل کر دیا اور اس کے بعد بھی ان کی قوموں کو ڈھیل ملتی رہی۔

رہا یہ سوال کہ ہمیں کس کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں نبی ﷺ کی پیروی کرنی چاہیے۔ آپؐ نبی بھی ہیں اور رسول بھی! آپؐ کی زندگی دونوں طریقوں کی جامع ہے۔ ہم کو پہلے اپنی قوم کے اندر

دعوت اور شہادت کا فریضہ انجام دینا چاہیے جو ہر نبی نے اپنی قوم کے اندر انجام دیا ہے۔ اگر اسی میں ہماری زندگی تمام ہو جائے تو ان شاء اللہ ہم کامیاب اور عنداللہ ماجور ہیں۔ پیغمبر ﷺ نے اپنی مکی زندگی میں یہی فریضہ انجام دیا۔ اور اگر اس سے آگے ہمیں ہجرت و جہاد اور اقامت دین کی سعادت بھی حاصل ہوتی ہے تو یہ نور علیٰ نور ہے۔ ہمیں اس مرحلہ کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے بھی سر دھڑ کی بازی لگانی چاہیے۔ لیکن جو کام مقدم ہے اس کو مقدم رکھنا چاہیے، محض شیخی بگھارنے کے لیے مؤخر کو مقدم اور مقدم کو مؤخر نہیں کرنا چاہیے۔

سوال: موجودہ حالات میں ایک عام مسلمان پر شہادت حق کی کیا ذمہ داری ہے اور اس کو کیسے ادا کرنا ہے؟

جواب: ایک مسلمان اگر ایک سچے مسلمان کی زندگی بسر کرتا ہے اور خواہ وہ عام شخص ہے یا خاص شخص اپنے قول اور عمل سے ہر گام پر حق کی شہادت دیتا ہے، اس کے لیے کسی انجمن یا تنظیم کا ممبر ہونا ضروری نہیں ہے۔ ذی علم لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے علم سے دوسروں کو بہرہ مند کریں اور اس کے صلہ میں ان سے کچھ لینے یا ان سے اپنے پمفلٹ اور کیسٹ فروخت کروانے کے بجائے صرف یہ مطالبہ کریں کہ وہ اس علم پر خود عمل کریں اور جہاں تک ممکن ہو اس کو دوسروں تک پہنچائیں۔ نبی ﷺ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا اور تمام داعیان حق نے ہمیشہ اس طریقہ کی پیروی کی۔ آج دعوت دین کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ دکان داری ہے اور اسی وجہ سے اس میں کوئی خیر و برکت بھی نہیں ہے۔

سوال: جو لوگ دینی خدمت آگے بڑھ کر کرنا چاہتے ہیں ان کو کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے؟

جواب: آگے بڑھ کر کام کرنے والوں سے اگر آپ کی مراد وہ لوگ ہیں جو لیڈر بن کر اقامت دین کرنا اور ہجرت و جہاد کی بیعت لینا چاہتے ہیں تو ان کے لیے میرا ناچیز مشورہ یہ ہے کہ وہ اس مہم کے لیے اٹھنے سے پہلے کسی ذی علم کی صحبت میں رہ کر دین کا علم حاصل کریں اور نمائشی لیڈروں کی ریس کرنے کی بجائے ان لوگوں کے نقش قدم کی پیروی کریں جنھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے زیادہ اپنی عملی زندگی سے حق کی شہادت دی ہے۔ اگر میرا یہ مشورہ ان کو منظور نہیں ہے تو وہ اپنے گلوں میں ڈھول ڈال کر پیٹتے پھریں، کچھ لونڈے ان کے اردگرد جمع ہو جایا کریں گے، پیسے بھی مل جائیں گے، کچھ دنوں یہ کھیل جاری رہے گا، پھر ٹائیں ٹائیں فش!

۳

آئین و قانون

مقالہ ۵

مسودۂ قانون ’’وضاحت قانون شریعت بابت ۱۹۵۴ء‘‘ کا ایک جائزہ

بیگم سلمیٰ تصدق حسین نے پنجاب اسمبلی میں مذکورہ بالا نام سے ایک مسودۂ قانون پیش کرنے کا نوٹس دیا ہے۔ یہ مسودۂ قانون بعض اخبارات میں شائع ہو چکا ہے اور اس کے بعض پہلوؤں پر مخالف اور موافق بحثیں بھی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ جس اہمیت کا حامل ہے اور شریعت اور معاشرت پر اس کے جو دور رس اثرات پڑ سکتے ہیں، اس کے اعتبار سے اہل علم نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔ ہمارے نزدیک اگر یہ مسودۂ قانون اسی صورت میں پاس ہو جائے جس صورت میں یہ مرتب کیا گیا ہے تو اس سے وہ فوائد تو شاید حاصل نہ ہو سکیں جو اس کی فاضل مرتبہ نے اپنے پیش نظر رکھے ہیں، البتہ بہت سی ایسی خرابیاں ہمارے معاشرہ میں پھوٹ پڑیں گی جن کا خیر مقدم کرنے کے لیے دوسرے دیندار مسلمان تو درکنار، شاید خود بیگم صاحبہ موصوفہ بھی آسانی کے ساتھ تیار نہ ہوں۔ اس وجہ سے ہم اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اس مسودہ کے خام پہلوؤں کی وضاحت کر دیں تاکہ اگر بیگم صاحبہ پسند فرمائیں تو اس کی روشنی میں خود ہی اس پر نظر ثانی فرما لیں، ورنہ دوسرے اصحاب علم سے اس کے بارے میں مشورہ کر لیں۔ اگر وہ فی الواقع اپنی دینی بہنوں کی بھلائی چاہتی ہیں (اور مجھے یہی حسن ظن ہے کہ وہ بھلائی ہی چاہتی ہیں) تو میرے نزدیک یہ بھلائی اسی شکل

میں حاصل ہو سکتی ہے جب یہ مسودۂ قانون ٹھیک ٹھیک اس روشنی میں مرتب کیا جائے جس کا، اس مسودہ کے شروع میں، بل کا منشاء بیان کرتے ہوئے حوالہ دیا گیا ہے۔

یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ اس کی فاضل مرتبہ نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ وہ مسلمان قوم کی ایک فرد ہیں اور مسلمانوں کے پاس ایک ضابطہ حیات خود اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا ہے جس کے اندر ہماری زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اصولی ہدایات مرقوم ہیں۔ چنانچہ اس مسودہ کی ابتدا میں اس کا منشاء مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> ہر گاہ یہ امر قرینِ مصلحت ہے کہ اسلامی قانون کے احکام متعلقہ شادی، انفساخِ نکاح، طلاق، مہر، اور حضانت کو قرآنی قوانین کی روح کے مطابق بنانے کے پیشِ نظر مجتمع کیا جائے اور ان کی وضاحت کی جائے۔

ہم اس تمہید پر محترمہ بیگم صاحبہ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انہوں نے مسلمان ہونے کے بنیادی تقاضے کو ملحوظ رکھا اور قرآن کو زندگی کے عملی معاملات میں ایک رہنما کتاب مانا۔ اس کی نسبت اگر ہمیں کوئی شکایت ہے تو بس یہ ہے کہ ایک واضح بات ایسے الفاظ میں کہی گئی ہے جس میں اس قسم کے ذہنی تحفظ کی ایک جھلک نظر آتی ہے جو ان لوگوں کی باتوں کے اندر پائی جاتی ہے جو شریعت سے فرار کی راہ شریعت کا کلمہ پڑھتے ہوئے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ بلاوجہ بدگمانی نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ عرض کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں قرآن کا نام تو لیا گیا ہے لیکن سنت کو یک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ اگر کسی قانون کو اسلام کے مطابق مجتمع کرنا اور واضح کرنا پیشِ نظر ہے تو اس کے لیے تنہا قرآن ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ نبی ﷺ کی سنت بھی لازمی ہے۔ اسلامی قانون کی بنیاد صرف قرآن ہی پر نہیں بلکہ سنت پر بھی ہے۔ جس طرح اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی اسی طرح اسلام میں کتاب اور سنت کے درمیان کسی تفریق کی گنجائش نہیں ہے۔ سنت سے میری مراد نبی ﷺ کا ثابت شدہ طریقہ ہے۔ اسلام

میں اس سے انحراف کھلا ہوا کفر ہے اور جو قانون سازی سنت سے ہٹ کر کی جائے اس کو اسلام سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی نسبت یہ دعویٰ کتنی ہی بلند آہنگی سے کیا جائے کہ وہ 'قرآنی قوانین کی روح' کے مطابق ہے۔ اس وجہ سے اگر یہ لفظ تمہید میں سہواً چھوٹ گیا ہے تو یہ ایک بہت بڑی فروگزاشت ہے اور اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ اور اگر خدانخواستہ یہاں سنت کو نظر انداز کرنے میں وہی فاسد ذہنیت کام کر رہی ہے جس کا زہر منکرین حدیث پھیلا رہے ہیں تو میں بیگم صاحبہ کی خدمت میں باادب عرض کروں گا کہ وہ اگر سنت کو نظر انداز کر رہی ہیں تو پھر قرآن کو بھی ممنونِ احسان نہ فرمائیں تو زیادہ اچھا ہے اگر یہ بیڑی بھی پاؤں میں رہی تو آخر اسلام سے فرار میں اس سے کچھ نہ کچھ تو رکاوٹ پیدا ہوگی ہی۔ پھر ایسی الجھن میں پڑنے سے کیا فائدہ جس سے نہ دنیا میں کوئی نفع اور نہ آخرت میں!

پھر یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ صاف صاف 'قرآنی احکام' کے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے 'قرآنی قوانین کی روح' کی پرپیچ اور پرتکلف ترکیب کے استعمال کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ قرآنی احکام کی روح سے پہلے تو اس کے الفاظ کا سوال آتا ہے۔ روح کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ اس کے الفاظ کے تقاضوں سے فارغ ہو لیں۔ پہلے جو کچھ قرآن نے اپنے نصوص میں صاف صاف بتا دیا ہے اس پر اپنے قانون کی بنیاد رکھیے۔ پھر جس شعبہ زندگی سے متعلق قرآن کے نصوص میں کوئی رہنمائی نہ مل رہی ہو وہاں اس کی روح کے مطابق قانون بنائیے۔ اور اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس پاک نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی سنت اور اس کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے رہنما بنایئے جو قرآنی قوانین کی روح کو سب سے زیادہ سمجھنے والا تھا۔ ہاں اگر اس کی سنت میں بھی کوئی رہنمائی نہیں مل رہی ہے تو پھر بلاشبہ آپ کو حق ہے کہ قرآنی قوانین کی روح سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔ مگر یہ بات تو نہ صرف عجیب بلکہ نہایت ہی احمقانہ ہوگی کہ آپ نہ تو قرآن کے الفاظ اور اس کے نصوص کی پروا کریں نہ نبی کی سنت

کی پروا کریں بلکہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنی ہوائے نفس کی رہنمائی میں قانون بنائیں اور دعویٰ یہ کریں کہ آپ نے یہ قانون 'قرآنی احکام کی روح' کے مطابق بنایا ہے۔ یہ تنبیہ کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ آج کل ہمارے ہاں 'قرآنی قوانین کی روح' کی اصطلاح بہت چلی ہوئی ہے اور جن لوگوں نے یہ اصطلاح چلائی ہے ان کا منشاء اس سے یہی ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جن کے اندر روح تو اپنی خواہشاتِ نفس کی ہو لیکن ان پر لیبل قرآن کا چپکا دیا جائے۔ چنانچہ افسوس ہے کہ اس مسودۂ قانون کے اندر بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔ دعویٰ تو یہ کیا گیا ہے کہ شادی اور نکاح سے متعلق مسائل کو قرآن کی روح کے مطابق منضبط کیا جائے۔ لیکن کیا یہ گیا ہے کہ معاشرتی خرابیوں سے زیادہ اس میں خود قرآن کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔

اب ہم اصل مسودہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں اور چونکہ مسودہ کی مرتبہ نے قرآن ہی کو اس کا اصل ماخذ بتایا ہے اس وجہ سے ہم بھی بحث و استدلال میں اپنے آپ کو قرآن مجید ہی تک محدود رکھیں گے۔

ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح

اس مسودۂ قانون کے ذریعہ سے پہلی چیز جو چاہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ:

۱) کوئی مسلمان مرد، تاوقتیکہ اس نے کسی دیوانی عدالت سے اس امر کے متعلق ڈگری نہ حاصل کر لی ہو کہ وہ اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے کا اہل ہے، دوسری عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔

۲) کوئی عدالت کسی مسلمان مرد کو، پہلی بیوی کی موجودگی میں، دوسری شادی کرنے کے لیے ڈگری دینے کی مجاز نہ ہوگی تاوقتیکہ شخص مذکور عدالت کو اس امر کے بارے میں مطمئن نہ کر دے کہ:

☆ اس کی بیوی کم از کم دس سال کے عرصہ سے کسی متعدی مرض میں مبتلا ہے۔

☆ یا وہ بانجھ ہے۔

☆ یا وہ فاتر العقل ہے۔

☆ یا یہ کہ اس کے ذرائع آمدنی دونوں بیویوں اور اس کے اور ان کے بچوں کے کفیل ہو سکتے ہیں

☆ یا یہ کہ وہ دونوں بیویوں سے برابر کا انصاف روا رکھ سکتا ہے اور یکساں محبت کا برتاؤ کر سکتا ہے۔

مختصر الفاظ میں اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایک بیوی رکھتے ہوئے، اس قانون کے بن جانے کے بعد، کسی دوسری عورت سے شادی کرنے کا مجاز نہیں ہو سکتا، جب تک وہ ایک دیوانی عدالت سے اس بات کی سند نہ حاصل کر لے کہ وہ دوسری شادی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور کوئی عدالت اس کو دوسری شادی کی ڈگری دینے کی مجاز نہیں ہو سکتی جب تک وہ عدالت میں اپنی بیوی کا بانجھ ہونا، یا فاتر العقل ہونا، یا دس سال سے کسی متعدی مرض میں مبتلا ہونا نہ ثابت کر دے۔ اور یہ نہ ثابت کر دے کہ اس کے ذرائع آمدنی اس کے لیے بھی اور اس کی دونوں بیویوں اور ان کے بچوں کے لیے بھی کافی ہیں۔ اور یہ کہ وہ دونوں بیویوں کے ساتھ برابر کا انصاف بھی کرے گا اور ان کے ساتھ یکساں محبت بھی کرے گا۔

جب ہم مسودہ کی اس دفعہ کو اس قرآن کی روشنی میں دیکھتے ہیں جس کے مطابق اس کے مرتب کیے جانے کا دعویٰ کیا گیا ہے تو اس میں سب سے پہلی بات جو صریحاً قرآن کے بالکل خلاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں مرد کو، اگر وہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرا عقد کرنا چاہے، عدالت کی اجازت کا پابند کر دیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ قرآن مجید نے

جہاں یہ اجازت دی ہے وہاں مرد پر بعض پابندیاں تو ضرور عائد کی ہیں لیکن عدالت سے اجازت حاصل کرنے کی کوئی پابندی اس پر عائد نہیں کی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہیں۔ فرمایا ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَامَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ (سورۃ نساء:۳)

اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو نکاح کرلو اپنی پسند کی عورتوں سے دو دو کر کے۔ تین تین کر کے۔ چار چار کر کے۔ اور اگر اندیشہ ہو کہ تم بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی پر بس کرو۔ یا اپنی لونڈی پر۔ یہ طریقہ زیادہ قریب ہے اس بات سے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔

اس آیت میں ایک مرد پر جو ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا چاہے مندرجہ ذیل پابندیاں عائد کی گئی ہیں:

۱) یہ کہ اس بات کے لیے کوئی معاشرتی، خانگی، یا اخلاقی ضرورت داعی ہو، محض تنوع اور تلذذ کے لیے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا اشارہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی (اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تب) سے نکلتا ہے۔

۲) یہ کہ بہر حال یہ تعداد بیک وقت چار سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔

۳) یہ کہ ان بیویوں کے ساتھ حتی الامکان مساویانہ برتاؤ کیا جائے۔

اگر ان شرطوں کے ساتھ یہ شرط بھی قرآن مرد پر عائد کرنا چاہتا کہ وہ نکاح کرنے سے پہلے عدالت سے اجازت بھی حاصل کرے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس کا ذکر بھی صاف صاف

نہ کر دیتا۔ لیکن اس کی تصریح تو درکنار آیت میں اس کا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔

اگر محض ان شرطوں کی بنا پر کوئی شخص یہ کہے کہ چونکہ اس زمانہ میں مرد عموماً ان شرطوں کا احترام نہیں کرتے جس کے سبب سے بہت سی عورتیں نہایت مظلومیت اور بے کسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہیں، اس وجہ سے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ مرد کی اس آزادی پر قدغن لگا دی جائے اور ایسا کرنا قرآنی احکام کی روح کے مطابق ہوگا تو ہم اس چیز کو مختلف پہلوؤں سے غلط سمجھتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ اللہ کی کتاب پر ایک اضافہ ہے جس کے کرنے کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے آپ کو اگر قرآن کی کوئی بات پسند نہیں ہے تو آپ آزاد ہیں کہ اس کو چھوڑ کر جو طریقہ بھی آپ کو پسند ہے اس کو اختیار کر لیجیے۔ لیکن یہ بڑی زیادتی ہے کہ آپ اپنی ہوائے نفس کی پیروی میں ایک بات ایجاد کریں اور پھر اس کو قرآن پر تھوپیں کہ یہ اس کے 'احکام کی روح' کے مطابق ہے۔

دوسرا اعتراض اس پر یہ ہے کہ اس اضافہ سے نہ صرف یہ کہ وہ مقصد نہیں حاصل ہو سکتا جس کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی یہ تحریف کی جا رہی ہے بلکہ الٹے اس سے اس مقصد کو شدید نقصان پہنچے گا۔ اس سے ہمارا معاشرہ بھی نہایت بری طرح متاثر ہوگا اور خود عورت بھی، جس کے حقوق کے تحفظ ہی کے لیے بیگم صاحبہ نے یہ قوانین تجویز فرمائے ہیں، نہایت ہی سخت مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے گی۔ ہم مسئلہ کے اس پہلو کو یہاں کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہماری جو بہنیں اس کو اپنے حقوق کے تحفظ کے نقطہ نظر سے بڑی اہمیت دے رہی ہیں وہ اس کے حقیقی عواقب سے آگاہ ہو جائیں۔

پہلے اس نقصان کو ملاحظہ فرمائیے جو اس سے خود ہماری ان بہنوں کو پہنچ سکتا ہے، جن کے تحفظ ہی کے لیے اس قانون کو بنایا جا رہا ہے۔

اگر فی الواقع ایک مرد کو، جو ایک نئے نکاح کا شائق ہے، اس نکاح کی اجازت عدالت سے اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک وہ اپنی پہلی بیوی کو بانجھ یا فاتر العقل، یا کسی مرضِ متعدی میں مبتلا ہونا نہ ثابت کر دے اور اپنے مالی وسائل کی کفایت اور اپنے مساویانہ سلوک کے بارہ میں بھی عدالت کو مطمئن نہ کر دے تو لازماً اس کا رجحان یہ ہوگا کہ وہ ایسی بیوی سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا حاصل کرے۔ اور اس کے لیے واحد راستہ جو وہ اختیار کر سکتا ہے طلاق کا راستہ ہے۔ اس وجہ سے وہ مجبوراً یہی راستہ اختیار کرے گا اور ان پابندیوں کے علی الرغم جو اس مسودہ قانون میں طلاق پر عائد کی گئی ہیں وہ طلاق کی راہ بہرحال پیدا کر ہی لے گا۔ نہ اس چیز میں اس کے لیے 'طلاق الاحسن' کی پابندیاں روک بن سکیں گی اور نہ وہ کسی 'سببِ معقول' کے پیدا کرنے ہی سے قاصر رہے گا جیسا کہ ہم آگے چل کر طلاق کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے دکھائیں گے۔

اب غور کیجیے کہ اگر یہ قانون بن کر نافذ ہو جاتا ہے تو ہماری ان ہزاروں بہنوں کا کیا حشر ہوگا جن کے شوہران کو کسی عدالت میں بانجھ یا فاتر العقل یا مدقوق تو ثابت نہیں کر سکتے لیکن وہ تنہا ان کے اوپر قناعت کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یا تو وہ ان کو زنجیر پا بستہ ہوئے، ڈالے رکھیں گے یا ان سے کسی نہ کسی صورت میں پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ پیچھا چھڑانے کی واحد شکل جو وہ اختیار کر سکتے ہیں طلاق ہے۔ ایسی صورت میں ان ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں شریف عورتوں کے انجام پر غور کیجیے جو اپنی جوانیاں کھو چکیں، جو اپنے شوہروں کے لیے بچے جن چکیں اور جن کے اندر دوسرے مردوں کے لیے اب کوئی خاص کشش باقی نہیں رہی۔ کیا وہ اس قانون کے نتیجہ میں مطلقہ بن کر نہایت برا بڑھاپا گزارنے پر مجبور نہ ہوں گی؟ کیا یہ کسی طرح بھی مطابقِ مصلحت ہو سکتا ہے کہ ان بیچاریوں کو سوکن کے جلاپے سے بچانے کے لیے ذلت اور مصیبت کی ایک اور جہنم میں جھونک دیا جائے؟ اس سوال پر غور کرتے ہوئے اس امر کو بھی ملحوظ رکھیے کہ ہمارا معاشرہ مغربی معاشرہ سے بالکل مختلف مزاج رکھتا ہے۔ اس میں ایک عورت مطلقہ بن

کر صرف ازدواجی زندگی ہی سے محروم نہیں ہوتی ہے بلکہ خاندان اور برادری کے اندر اپنا بہت کچھ نسوانی شرف بھی کھو دیتی ہے۔

معاشرہ کو اس سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے وہ بحیثیتِ مجموعی اس سے بھی زیادہ ہے۔ اسلام نے تعددِ ازواج کی جو اجازت دی ہے اس میں جہاں اور بہت سی شخصی اور اجتماعی مصلحتیں ہیں، جیسا کہ آگے ہم بیان کریں گے، وہاں اس کے اندر ایک بہت بڑی مصلحت معاشرہ کے اخلاقی تحفظ کی بھی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام نے عفت و عصمت کی حفاظت کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس مقصد کے لیے بڑے سخت قوانین بنائے ہیں۔ زنا ایک ایسا جرم ہے جس کا اسلامی معاشرہ میں تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ سختی جائز اور معقول اسی حالت میں ہو سکتی ہے جبکہ قانون، جنس غالب کے مفرط جنسی جذبات سے بے پروا نہ ہو، بلکہ اگر کوئی شخص کسی سبب سے تشنگی محسوس کرتا ہے تو اس تشنگی کو دور کرنے کے لیے خود قانون کے اندر ایک مناسب حد تک گنجائش موجود ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کے لیے ناجائز راستے پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس کا نتیجہ پورے معاشرے کے حق میں نہایت مہلک اور خطرناک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس معاشرہ نے یک زوجگی کے اصول کو شدّت کے ساتھ اپنایا ہے اس کو زنا کا دروازہ پوری وسعت کے ساتھ لازمی طور پر کھلا رکھنا پڑا ہے۔ امریکا اور یورپ کے ملکوں میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے کسی شخص کے لیے دوسرا نکاح کرنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے لیکن زنا وہاں شاید نکاح سے بھی زیادہ پاکیزہ سمجھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کی تقلید میں یک زوجگی کے قانون کو اپنانے پر اصرار ہے تو پھر دوسرے پہلو میں بھی پوری فراخ دلی کے ساتھ ان کی پیروی کرنی پڑے گی۔

علاوہ ازیں کبھی معاشرہ بحیثیت مجموعی اس بات کا محتاج ہو جاتا ہے کہ تعددِ ازواج کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ایسی صورت میں اگر یہ طریقہ نہیں اختیار کیا جاتا تو پورے معاشرہ پر صنفی انتشار کا ایسا بحران طاری ہو جاتا ہے کہ وہی لوگ جو ایک بیوی کے ہوتے ہوئے

دوسرے نکاح کے ذکر سے بھی شرماتے ہیں نکاح اور بیاہ کی سرے سے قید ہی اڑا دینے کی تجویز پر غور کرنے لگتے ہیں۔ اور جن بیگمات کی پیشانیاں سوکن کے تصور سے بھی عرق آلود ہوتی ہیں وہ اس بات کی تمنا میں مرنے لگتی ہیں کہ کاش کسی مرد کی 'داشتہ' ہی بن کے زندگی بسر کرنے کا موقع نصیب ہو جائے! یہ محض مبالغہ آرائی نہیں ہے بلکہ میں اس کے ثبوت میں ایک ایسے معاشرہ کی مثال پیش کر سکتا ہوں جو یک زوجگی کے نظریہ کا سب سے بڑا علم بردار اور بیگم صاحبہ کے نقطۂ نظر سے غالباً ایک مثالی معاشرہ ہے۔

۱۶ فروری ۵۵ء کے نوائے وقت میں اس کے لندن کے نامہ نگار کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں:

۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی عالمگیر جنگوں اور سلطنت برطانیہ کے دفاع نے انگلستان میں عورتوں کا تناسب مردوں سے زیادہ کر دیا ہے۔ چنانچہ یہاں اکثر عورتیں شادی کا ارمان دل ہی دل میں لیے ہوئے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ یوں تو وہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتی رہتی ہیں لیکن عورت کا حقیقی سکون انہیں میسر نہیں آتا۔ لندن کے ایک پادری صاحب لکھتے ہیں کہ آج کل اگر غلطی سے کسی دوشیزہ کو شادی شدہ سمجھ لیا جائے تو وہ چند لمحوں کے لیے باغ باغ ہو جاتی ہے۔

اکثر کنواری لڑکیوں نے زندگی کا مقصد ہی شادی سمجھ رکھا ہے۔ وہ شادی کے لیے ماری ماری پھرتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ لڑکوں کے پیچھے ماری ماری پھرتی ہیں۔ انہیں جو لڑکا مل جاتا ہے وہ اسے اپنا ممکنہ شوہر سمجھنا شروع کر دیتی ہیں۔

پادری صاحب مزید فرماتے ہیں:

جو دوشیزائیں 'مسز' کہلا سکتی ہیں وہ اپنے آپ کو اعلیٰ و ارفع سمجھنا شروع کر دیتی ہیں اور احساسِ برتری کے مرض کا شکار ہو جاتی ہیں۔ وہ ان سہیلیوں کو ذرا نفرت سے دیکھنا

شروع کر دیتی ہیں جن کو شوہر نہیں ملتے۔ عام لڑکیاں جب ایک دوسری سے ملتی ہیں تو سب سے پہلے ان کی نگاہیں دوسری کی انگلی میں 'شادی کی انگوٹھی' تلاش کرتی ہیں۔ ان حالات میں لڑکیاں کسی خاص شخص کے بجائے شادی کے خیال ہی سے محبت شروع کر دیتی ہیں۔

پادری صاحب نے گلہ کیا ہے کہ لڑکی جوں ہی پندرہ کے سن میں پہنچتی ہے اسے شادی کا خیال ستانا شروع کر دیتا ہے۔ دراصل یہ شکایت فضول ہے۔ انگلستان (اور یورپ میں بھی) مردوں کی کمی ایک معاشرتی مسئلہ بن چکی ہے اور مغربی تہذیب میں بے راہ روی کے جو گھناؤنے مظاہرے نظر آتے ہیں اس کی وجہ بھی مردوں کی کمی ہے۔ عورت کی شادی کی خواہش قدرتی خواہش ہے۔ لیکن مغرب کے داناؤں نے اس کا علاج یہ نکالا ہے کہ مرد شادی تو ایک کرے لیکن عیاشی جتنی عورتوں سے چاہے کرے۔ مغربی تہذیب، مذہب اور قانون یہ تو برداشت کر لیتے ہیں کہ شادی شدہ مرد داشتہ رکھ لے لیکن ان کے نزدیک دوسری شادی معیوب اور تہذیب کے خلاف ہے۔

دیکھ لیجیے انگلستان اور یورپ کا معاشرہ اس وقت جس بحران میں مبتلا ہے اس کا واحد علاج تعدد ازدواج ہے لیکن ان ملکوں کے لال بجھکو زنا کو تو ثواب قرار دے لیں گے لیکن ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کے ذکر کو بھی خلاف تہذیب قرار دیں گے۔ اور یہی حال وہاں کی عورتوں کا بھی ہے۔ وہ بیسوا اور داشتہ بن کر زندگی بسر کرنے میں تو کوئی قباحت نہیں خیال کرتیں، بلکہ کتنی اس ارمان میں بوڑھی ہو جاتی ہیں، لیکن اگر ان کے سامنے تعدد ازدواج کا نام بھی لے لیجیے تو یہ ان کی شان میں ایک ایسی گستاخی ہوگی جو کسی طرح بھی قابلِ معافی نہیں۔ ہمارے ملک کی بیگمات بھی یہی چاہتی ہیں کہ اور چاہے جو پاپڑ بھی بیلنے پڑیں لیکن تعدد ازدواج کی لعنت بہرحال اس ملک سے ختم ہونی چاہیے۔ ان بہنوں کی خواہش اور کوشش اگر یہی ہے تو یہ چیز تو ختم ہو جائے گی لیکن اس کو خوب یاد رکھیے کہ اس کے بعد کی منزل وہی ہے جس سے آج انگلستان کی عورتیں گزر رہی ہیں۔

ایک بیگم صاحبہ نے، جو اپوا کی بیگمات میں ایک بڑا مقام رکھتی ہیں، ابھی پچھلے دنوں یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر ان کے حقوق مردوں نے سیدھے سیدھے نہ دیے تو پاکستان کی عورتیں بھی وہی طریقے اختیار کرلیں گی جو ان کی مغربی بہنوں نے اختیار کرلیے۔ ان کی مغربی بہنوں نے جو طریقے اختیار کیے ہیں اور اس سے انہوں نے جو شاندار نتائج حاصل کیے ہیں اس کا ایک ہلکا سا تصور دینے کے لیے ہم ذیل میں اسی اخبار کے نامہ نگار کی ایک چٹھی کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں جس کا ایک اقتباس ہم اوپر نقل کرآئے ہیں۔ اس سے انہیں بخوبی اندازہ ہوسکے گا کہ ان کی مغربی بہنوں نے کیا کچھ پایا ہے اور ان کے نقش قدم پر چل کر یہ کیا کچھ پائیں گی۔ نامہ نگار کا بیان ملاحظہ ہو:

آپ پوچھیں گے کہ لندن میں اتنی لڑکیاں کیوں ہیں؟

اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ گزشتہ دو جنگوں اور سلطنتِ برطانیہ کو برقرار رکھنے کی کوشش میں بے شمار مرد کام آچکے ہیں۔ سارے برطانیہ ہی میں یورپ کی طرح عورتوں کی تعداد زیادہ اور مردوں کی کم ہے۔

دوسرے ہر سال ہزاروں لڑکیاں جرمنی، فرانس اور اٹلی سے 'لندن کی شہرت' کے قصے سن کر — روزی اور شوہر — کی تلاش میں لندن آجاتی ہیں۔

تیسرے ہر سال کوئی پچیس ہزار لڑکیاں برطانیہ کے مختلف صوبوں سے آتی ہیں۔ کیوں؟

گھر میں ماں 'بوائے فرینڈ' سے ملنے پر اعتراض کرتی تھی۔ یہاں ترقی کے مواقع زیادہ ہیں۔ منگیتر سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ ایکٹریس بننے کا شوق بھی صاحبزادیوں کو چراتا ہے۔ اور کچھ 'دنیا دیکھنے' گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور پھر یہاں پر سینکڑوں شاخوں والے 'لائنز' اور اے بی سی کے سستے کھانے والے ریستوران ہیں جہاں ہزاروں لڑکیاں

کام کرتی ہیں۔ 'ورل ورتھ' اور 'اسپنسر اینڈ مارکس' کے وسیع وعریض اسٹوروں میں 'شاپ گرل' بن سکتی ہیں — ہوٹلوں میں Receptionist بن سکتی ہیں۔ سیکرٹری بن سکتی ہیں — اور فوٹوگرافروں کے 'ماڈل' اور ہندوستانی اور پاکستانی 'شہزادوں' کے 'حرم' کی زینت......

ان میں سے اکثر چار پانچ پونڈ سے لے کر سات آٹھ پونڈ فی ہفتہ تک کماتی ہیں جس سے بمشکل یہ اپنا ضروری خرچ چلاتی اور کپڑے وغیرہ بناتی ہیں۔ اور جنہیں کچھ بچا کر اپنے بوڑھے ماں باپ کو بھی بھیجنا ہوتا ہے وہ زندہ رہنے کے لیے پوری غذا بھی نہیں کھا سکتیں اور تقریباً تمام شام کو تفریح کے لیے 'شکار' کی تلاش میں رہتی ہیں، جو انہیں پکچر دکھا دے، ریستوران میں ایک وقت کا کھانا کھلا دے یا کسی اچھے کافی ہاؤس میں کافی کی ایک پیالی ہی پلا دے۔ اور انہیں 'آزادی' اور 'دنیا دیکھنے' کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

یہاں عورت 'آزاد' ہے لیکن اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔ یہاں عام عورت کی کوئی عزت نہیں، کوئی مقام نہیں۔ اگر وہ مشرق کی 'مظلوم عورت' کی 'جیل کی زندگی' کی ایک جھلک دیکھ لے تو آزادی اور مساوات سے فوراً توبہ کرلے۔ یہاں ہزاروں عورتیں ساری عمر گھر اور اولاد کو ترستے ہوئے زندگی بسر کردیتی ہیں اور انہیں اپنی مظلومی اور کس مپری کا احساس ہوتا ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت۔ مورخہ ۲ فروری ۱۹۵۵ء)

یہ اقتباسات ہم ان بہنوں کے ملاحظہ کے لیے پیش کرتے ہیں جو دھمکی دیتی ہیں کہ اگر ان کے مطالبہ مساوات اور ان کے حقوق کو سیدھے سیدھے تسلیم نہ کیا گیا تو وہ اپنی مغربی بہنوں کے طور طریقے اختیار کرلیں گی وہ اگر ٹھنڈے دل سے اپنی مغربی بہنوں کی اس درگت کا جائزہ لیں گی تو ہمیں امید ہے کہ ان کے مقابل میں اپنی حالت کو بدرجہا بہتر پائیں گی اور اس پر اللہ کا شکر ادا کریں گی۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ دلوں کے مچلتے ہوئے جذبات اول تو کسی حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ دوسرے

ہماری ان بہنوں کو اس کا اتفاق ہی کب ہوتا ہے کہ وہ یورپ یا امریکہ کی عام عورت کی واقعی زندگی کا اندازہ کرسکیں! انہیں تو عموماً انہی عورتوں کو دیکھنے کے مواقع ملتے ہیں جو انہی کی طرح بالکل فارغ البال ہیں اور سیر سپاٹے کے سوا جن کا کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔

بات اپنے دائرہ سے باہر نکلی جارہی ہے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب معاشرہ اس کا محتاج ہوتا ہے کہ تعدد ازدواج کے طریقہ پر عمل کرے لیکن محض جھوٹی، صاحبیت، کی پاسداری میں اس پر عمل نہیں کیا جاتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زنا عام ہو جاتا ہے، عورت کی قیمت دو کوڑی کی رہ جاتی ہے، یہاں تک کہ نہ تو اسے کسی مشرقی کی بدنام 'حرم' میں داخل ہونے سے انکار کی مجال رہ جاتی اور نہ وہ کسی کی 'داشتہ' بننے میں ہی کوئی عار محسوس کرتی، بلکہ زندگی بھر اس ارمان میں رہتی ہے کہ کاش! کوئی آدم کا بیٹا جھوٹ موٹ ہی اپنی طرف اس کو منسوب ہونے کی عزت سے سرفراز کردے۔

ممکن ہے اس پر یہ کہا جائے کہ اگر یورپ کے ملکوں میں یہ صورت حال ہے تو وہاں تعدد ازدواج کو جائز ہونا چاہیے، لیکن ہمارے ملک میں یہ صورت حال نہیں ہے۔ یہاں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابل میں کم ہے، اس وجہ سے یہاں اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ اگر آپ کے ہاں صورت حال یہ نہیں ہے تو تعدد ازدواج یہاں کب عام ہے؟ غرباء کا طبقہ، جو اس ملک کی اصلی آبادی کی حیثیت رکھتا ہے، ایک سے زیادہ بیوی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ان کے اندر تو شاید لاکھوں میں کوئی مثال تعدد ازدواج کی مشکل سے مل سکے۔ صرف خاص خاص برادریاں ہیں جن کے کھاتے پیتے گھرانوں میں یہ خرابی موجود ہے کہ ان کے بعض افراد ایک سے زیادہ شادیاں کرلیتے ہیں اور بدقسمتی سے اس کی مثالیں بھی ان کے ہاں پائی جاتی ہیں کہ وہ عموماً بیویوں میں انصاف اور مساوات کے تصور سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ایک جزوی شر کو مٹانے کے لیے ایک ایسا قانون بنا ڈالا جائے جو معاشرہ کو ایک ناروا پابندی میں باندھ کے رکھ تو دے گا لیکن اس سے ان مظلوموں کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا جن کی

حمایت کی آڑ لے کر یہ قانون بنایا جارہا ہے۔ اس قانون کا لازمی نتیجہ، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، یہ نکلے گا کہ نکاح جدید کے شائقین اپنی ان بیویوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے جو ان کی اس خواہش کے راستہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ اور ہمارے موجودہ معاشرے میں شاید ہزار میں سے پانچ عورتیں بھی اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ تو ان کی حفاظت کے لیے قانون بنائیں گے اور ان بچاریوں کے زندگی کے رہے سہے سہارے بھی چھن جائیں گے۔

یہ خرابی ہمارے معاشرہ میں اب تک جس پیمانہ پر ہے اس کے علاج کے لیے بجائے اس کے کہ ایک غلط قسم کے قانون کی بیڑی اپنے پاؤں میں ڈال لی جائے، یہ بالکل کافی ہے کہ معاشرہ میں اسلامی حقوق عدل و انصاف کا احساس پیدا کیا جائے۔ مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی۔ خصوصیت کے ساتھ عورتوں میں اس بات کا کماحقہٗ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ اپنے شوہروں سے ان حقوق کے لیے جرأت کے ساتھ لڑسکیں جو اسلام نے ان کو بخشے ہیں۔ اور ہمارے ہر شہر کے اندر خواتین کی ایسی انجمنیں بھی ہونی چاہئیں جو اس قسم کی مظلوم خواتین کی مدد کریں اور اگر وہ اپنے شوہروں کی طرف سے نان نفقہ اور حقوق زوجیت سے محروم کی جارہی ہوں تو اسلامی قوانین کے مطابق عدالتوں کے ذریعہ سے ان کے حقوق دلوائیں یا ان کے لیے خلع اور فسخ نکاح کا مطالبہ کریں۔

تعدد ازدواج اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ شروع سے یہ چیز موجود ہے۔ لیکن صحابہؓ اور نبی ﷺ کے زمانہ میں بلکہ بعد کے زمانوں میں بھی کسی شخص کی مجال نہیں تھی کہ وہ اپنی ایک سے زیادہ بیویوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی ادنیٰ ناانصافی بھی کرسکے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اولاً تو معاشرہ میں اس بات کا احساس تھا کہ اسلام میں اس قسم کی ناانصافی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ثانیاً خود عورتوں کے اندر بھی اپنے حقوق کا اتنی شدت کے ساتھ احساس تھا کہ جہاں ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہوئی وہ فوراً اپنا معاملہ عدالت میں لے کر پہنچیں۔ ثالثاً اس وقت کی عدالتیں بھی آج کل کی عدالتوں کی طرح نہیں تھیں کہ ان سے کمزور

کے لیے انصاف حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے ہم معنی ہو۔ پھر آج بھی اگر مقصود مظلوم عورتوں کی حمایت ہی ہے نہ کہ محض مغرب کی اندھی تقلید میں اسلامی اصولوں کی قطع و برید، تو آخر یہ طریقہ عورتوں کے حقوق کے تحفظ کا کیوں نہیں اختیار کیا جا سکتا؟

چند مزید خرابیاں

یہاں تک تو ہم نے صرف اس عام خرابی کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس بل کے قانون بن جانے کی صورت میں رونما ہوگی۔ لیکن اس کے علاوہ اس میں اسی مسئلہ سے متعلق بعض اور بھی ایسی شرطیں عائد کی گئی ہیں جو اپنے محل میں اگرچہ صحیح ہوں لیکن بیگم صاحبہ نے ان کو بالکل بے محل عائد کر کے عجیب قسم کا تضاد پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً اس قانون کی رُو سے اگر کوئی شخص ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کو نہ صرف ایک دیوانی عدالت سے اس کے لیے ڈگری حاصل کرنی پڑے گی، نہ صرف شادی کے لیے اہلیت کا باقاعدہ عدالتی ثبوت مہیا کرنا پڑے گا، نہ صرف اپنی موجود بیوی کو مدقوق یا بانجھ یا فاترالعقل ثابت کرنا پڑے گا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ اس کی آمدنی دونوں بیویوں اور ان کے بچوں کے لیے کفایت کر سکتی ہے اور وہ ان دونوں کے ساتھ یکساں انصاف بھی کرے گا اور یکساں محبت بھی کرے گا۔

گزارش یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنی موجود بیوی کو مبتلائے برص ودق یا بانجھ یا فاترالعقل ثابت کر دیا تو اس کے بارہ میں یہ سوال کہاں پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس بیوی کے ساتھ اور اپنی نئی بیوی کے ساتھ یکساں انصاف بھی کرے گا اور یکساں محبت بھی کرے گا۔ اس کے متعلق اگر کوئی جائز سوال پیدا ہوتا ہے تو محض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شوہر اس کو اپنے حبالہ عقد میں رکھنا چاہتا ہے تو اس کو روٹی اور کپڑا دیتا رہے۔ یہ تو غریب شوہر کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی کہ اس سے ایک فاترالعقل اور مجنون یا بانجھ یا مبروص عورت کے ساتھ فرائض زوجیت ادا کرنے کا بھی مطالبہ کیا جائے اور برابر کی محبت کا بھی تقاضا کیا

جائے اور وہ بھی ایک دیوانی عدالت کے ذریعہ سے!

آخر عدالت کے پاس اس چیز کے معلوم کرنے کا کیا ذریعہ ہوگا کہ اس شخص کا ذریعہ آمدنی نہ صرف دونوں بیویوں کے لیے کفایت کرے گا بلکہ ان سے پیدا ہونے والے بچوں کے لیے بھی کفایت کرے گا اور یہ کہ یہ دونوں کے ساتھ یکساں انصاف بھی کرے گا اور یکساں محبت بھی کرے گا؟ یہ کون بتا سکتا ہے کہ اس شخص کے دونوں بیویوں سے کتنے بچے ہوں گے اور اس کی جو آمدنی ہے کل بھی وہ باقی رہے گی یا نہیں رہے گی؟ جو شخص بھی نئی شادی کا ارمان لے کر عدالت میں جائے گا وہ یہ تو کہنے سے رہا کہ میں دونوں بیویوں کے ساتھ انصاف نہیں کروں گا یا دونوں کے ساتھ یکساں محبت نہیں کروں گا۔ وہ تو لازماً یہی کہے گا کہ میں دونوں پر جان نثار کروں گا۔ آخر عدالت یہ کس طرح معلوم کرے گی کہ یہ صحیح کہہ رہا ہے یا غلط! آخر اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر قائم بھی رہے گا! اگر کہا جائے کہ اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے تو یہ ایک تو ایسی چیز ہے جس کا حق عام اسلامی قانون کے تحت ہر عورت کو حاصل ہے۔ اگر ایک عورت اپنے شوہر سے اس قسم کی کسی زیادتی کی شکایت رکھتی ہے تو اسلامی قانون کی رو سے عدالت میں مرافعہ کر سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ شادی سے پہلے عدالت میں اس معاملہ کے لیے جانے کا کیا فائدہ ہوا؟

پھر ستم یہ ہے کہ شوہر اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد بھی اگر عدالت سے دوسری شادی کی اجازت حاصل کرے تو بیگم صاحبہ کے اس بل کی رو سے موجود بیوی کو طلاق یا افتراق کے مطالبہ کا قانونی حق حاصل ہوگا۔ طلاق کا مفہوم تو واضح ہے۔ افتراق کا مطلب غالباً یہ ہے کہ بیوی صاحبہ قیام تو فرمائیں گی میاں سے بالکل الگ تھلگ لیکن ان کے جملہ مصارف میاں کے سر ہوں گے۔ اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ مصارف کچھ ایسے ویسے نہیں ہوں گے بلکہ میاں کو اپنی کل آمدنی کا چوتھائی حصہ بیوی صاحبہ کی نذر کرنا پڑے گا۔ اور یہ ادائگی اس طرح ہوگی کہ یہ رقم ہر مہینہ کی دسویں تاریخ کو عدالت میں جمع کرانا پڑے گی۔ اور اگر وہ

ایسا کرنے سے قاصر رہا تو یہ رقم بطور بقایا مالیہ اراضی وصول کی جائے گی۔

گزارش یہ ہے کہ اگر آخر انجام یہی ہونا تھا کہ اس تمام ہفت خوان عدل و انصاف کے طے کرنے کے بعد بھی بات اونچی بیوی صاحبہ ہی کی رہے گی، انہیں طلاق کے مطالبہ کا بھی حق رہے گا اور افتراق کے مطالبہ کا بھی، اور غریب شوہر کی مجموعی آمدنی کے چوتھائی حصہ کے ہتھیانے کا بھی تو پھر ان بہت ساری دفعات کی کیا ضرورت تھی۔ تب تو سب یہ ایک ہی دفعہ سارے قضیہ کو طے کر دینے کے لیے کافی تھی کہ اگر کوئی مرد غلطی سے دوسری شادی کی جرأت کر بیٹھے تو اس کی پہلی بیوی کو طلاق یا افتراق کے مطالبہ کا حق ہونا چاہیے اور بصورتِ افتراق شوہر کی چوتھائی آمدنی پر مالکانہ متصرف ہونے کا! بلکہ یہ بھی ایک تکلیف ہے۔ پھر تو آسان راستہ وہی ہے جس کی طرف اپوا کی شاخ کراچی کی محترمہ صدر صاحبہ نے اپنی ایک تقریر میں جو انہوں نے کراچی کی اپوا کانفرنس میں فرمائی ہے، رہنمائی کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر مرد دوسری شادی کرے تو ایسی صورت میں عورت کو قانونی طور پر یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کو طلاق دے دے۔

یہ امر بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ بصورتِ افتراق کل آمدنی کا چوتھائی حصہ بطور نان نفقہ دینا تجویز کیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ بیوی کا کل حصہ شوہر کی میراث میں اکثر حالات میں آٹھواں اور صرف بعض حالات میں چوتھائی ہے۔ اور یہ نفقہ ان بیوی صاحبہ کے لیے تجویز کیا گیا ہے جو یا تو بانجھ ہیں یا مدقوق یا فاترالعقل۔ بھلا بتایئے کہ کون فاترالعقل مرد ہے جو ایسی خوبیاں رکھنے والی بیگم صاحبہ کو سفید ہاتھی کی طرح پالے گا۔ پھر تو جس قیمت پر بھی ممکن ہو اس کی کوشش اور آرزو یہی ہوگی کہ وہ ان کو 'طلاق احسن' دے کر بطریقِ احسن ان کے میکہ رخصت کر دے، اگرچہ ان کو وہاں دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہ ہو سکے۔

نان نفقہ کے متعلق یہ فقاہت ہمارے سامنے بالکل پہلی مرتبہ آئی ہے کہ وہ مرد کی مجموعی آمدنی کا چوتھائی حصہ ہونا چاہیے۔ قرآن نے اس سلسلہ میں جو رہنمائی کی ہے اس

سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں معیار مجموعی آمدنی نہیں بلکہ آدمی کا معیار معیشت (Standard of Living) ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مجموعی آمدنی اور معیار معیشت میں بڑا فرق ہے۔ فرض کیجیے ایک مرد کی کل آمدنی سو روپے ماہوار ہے اور اس کے چار پانچ بچے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اس کو وہ افتاد پیش آجائے کہ اس کی بیوی افتراق کا مطالبہ کر بیٹھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اکیلی بیوی صاحبہ کے لیے تو ہر مہینے کی دسویں کو اپنی تنخواہ کے پچیس روپے سرکاری خزانے میں جمع کرا دے گا اور خود چار پانچ بچوں اور اگر بوڑھے ماں باپ بھی خیر سے زندہ ہوں تو سات آٹھ افراد کے پورے کنبے کی پرورش پچھتر روپے میں کرے گا۔ اور اگر اس آزمائش میں خدانخواستہ کوئی ایسے بزرگ مبتلا ہو جائیں جو کارخانہ داروں اور مالکان مل کے زمرہ میں شامل ہیں یا صفِ اول کے تاجروں میں ہیں یا چوٹی کے زمینداروں میں ہیں تو وہ مجبور ہوں گے کہ ہر مہینے حساب کر کے اپنی مجموعی آمدنی کا چوتھائی حصہ ان افتراق پسند کرنے والی بیوی کے حوالہ کریں درآنحالیکہ وہ خود اپنی ذات اور اپنی نئی نویلی بیوی پر اپنے پورے کنبے سمیت مشکل سے اپنی آمدنی کا چوتھائی حصہ خرچ کرتے ہوں گے۔

یہ بات کہ قرآن مجید نے نان نفقہ کے معاملہ میں معیار آمدنی کو نہیں بلکہ معیشت کو قرار دیا ہے نہایت آسانی سے اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر اس کو یہی معیار قرار دینا ہوتا تو وہ نہایت مختصر لفظوں میں یوں کہہ سکتا تھا کہ اپنی بیویوں کو اپنی آمدنی کا ایک چوتھائی بطور نان نفقہ دیا کرو۔ لیکن اس نے جہاں کہیں بھی نان نفقہ کا ذکر کیا ہے کہیں بھی یہ الفاظ نہیں استعمال کیے ہیں۔ بلکہ ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قرآن معیشت کو نان نفقہ کے لیے معیار قرار دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو چند آیتیں۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ
لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ (بقرہ۔۲۳۳)

اور باپ پر ان کو کھلانا اور پہنانا ہے دستور کے مطابق۔ کسی جان پر اس کی طاقت

سے زیادہ نہ بوجھ ڈالا جائے۔ نہ ماں کو اس کے بچے کے سبب سے کوئی نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کے سبب سے۔

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۚ وَإِن كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِن تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ۞ لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ (سورہ طلاق: ۶۔۷)

اور ان کو رکھو اس حیثیت سے جس حیثیت سے تم اپنی مقدرت کے مطابق رہتے ہو۔ اور ان کو تنگ کرنے کے لیے ان کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرو یہاں تک کہ وہ وضع حمل سے فارغ ہو جائیں اور اگر وہ تمہارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو دودھ پلائی دو۔ اور اس کے لیے رواج کے مطابق آپس میں قرارداد کرلو۔ اور اگر اس میں دشواری محسوس کرو تو کوئی دوسری عورت دودھ پلا دے گی اور گنجائش والے اپنی گنجائش کے مطابق خرچ کریں۔ اور جس کی روزی تنگ ہو تو جو کچھ اللہ نے اس کو دیا ہے اسی میں سے خرچ کرے۔ اللہ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اتنا ہی جتنا اس کو دیا ہے۔

یہ دونوں مجموعہ آیات ایسی ہی عورتوں کے نان نفقہ سے متعلق ہیں جن کے لیے بیگم سلمیٰ تصدق حسین صاحب کا یہ بل ہے۔ لیکن ان میں کہیں آمدنی کا کوئی متعین حصہ نان نفقہ کے لیے تجویز نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو دستور اور معروف پر چھوڑا گیا ہے کہ ایک شخص اپنے معیار زندگی کے لحاظ سے نان نفقہ دے خواہ وہ اس کو خود باہم طے کرلیں یا دو پنچ مل کر طے کردیں یا کوئی عدالت ان کے حالات اور معیار زندگی کو سامنے رکھ کر طے کردے۔

مسئلہ طلاق

طلاق سے متعلق بیگم صاحبہ جو قانون بنوانا چاہتی ہیں اس کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ:

طلاق کی تمام صورتیں ماسوا طلاق الاحسن کے ناجائز تصور کی جائیں گی۔

اس کی دوسری دفعہ یہ ہے:

> طلاق صرف اس صورت میں جائز تصور کی جائے گی جبکہ کسی قانونی عدالت نے شوہر کو یہ ڈگری دے دی ہو کہ طلاق بطریق احسن دی گئی ہے اور اس کے لیے معقول وجوہ کارفرما تھیں۔

بیگم صاحبہ نے جس طرح ایک بیوی کی موجودگی کی حالت میں دوسری شادی کے معاملہ کو عدالت کے ساتھ باندھ کر رکھ دیا ہے، اسی طرح طلاق کے معاملہ میں بھی شوہر کی آزادی کو بالکل سلب کر کے اس کو عدالت کی اجازت کا پابند بنا دیا ہے۔ اور ساتھ ہی عدالتوں پر یہ پابندی عائد کردی ہے کہ اول تو وہ 'طلاق الاحسن' کے سوا کسی اور طریقہ پر دی ہوئی طلاق کو طلاق ہی تسلیم نہ کریں، وہ لازماً اس بات کی تحقیق کریں کہ طلاق بطریقِ احسن دی گئی ہے یا نہیں۔ ثانیاً طلاق کے ہر معاملہ میں اس بات کو بھی دیکھیں کہ طلاق کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں یا نہیں۔ اگر معقول وجوہ موجود نہ پائیں تو وہ طلاق کو سرے سے جائز ہی نہ قرار دیں۔

اب آیئے دیکھیے کہ اگر یہ قانون بن جاتا ہے تو اس سے کیا کیا مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلی دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ نکاح اور طلاق کے معاملہ کو قرآن مجید نے سرتاسر شوہر کی صوابدید پر چھوڑا ہے۔ ان معاملات میں اس کی آزادی کو ہرگز کسی قاضی یا کسی عدالت کے فیصلوں کا پابند نہیں کیا ہے۔ قرآن کا صاف ارشاد ہے کہ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (اس کے اختیار میں رشتہ نکاح کی گرہ ہے) جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ اس گرہ کے باندھنے اور کھولنے کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ تاریخ اسلامی کے ہر دور میں اور

ہر مسلمان حکومت میں پوری امت کا اسی پر عمل رہا ہے اور اسی پر عمل ہے۔ لیکن بیگم صاحبہ مرد کی اس آزادی کو سلب کر کے اس کو عدالت کے فیصلہ کا تابع بنا رہی ہیں۔

دوسری چیز اس میں قابلِ غور یہ ہے کہ شریعت نے اگر طلاق کے معاملہ کو مرد کی صوابدید اور اس کے فیصلہ پر چھوڑا تھا تو خدانخواستہ کوئی بیوقوفی نہیں کی تھی کہ آج بیگم صاحبہ کو اس کی اصلاح کی ضرورت پیش آئے۔ اصل یہ ہے کہ طلاق کوئی لذت یا تفریح کی چیز نہیں ہے۔ جو شخص بھی طلاق دیتا ہے (الا ماشاء اللہ) وہ مجبوری ہو کر اور بادلِ ناخواستہ ہی طلاق دیتا ہے۔ اور اکثر حالات میں اس کا کوئی نہ کوئی سبب بھی موجود رہتا ہے جو میاں اور بیوی اور ان کے رازداروں کے علم میں تو ہوتا ہے لیکن نہ تو میاں کی یہ مصلحت ہوتی ہے کہ اس کا عام طور پر اظہار ہو اور نہ عورت ہی کے لیے یہ کچھ بہتر ہوتا ہے کہ یہ چیز کہیں زیرِ بحث آئے۔ بلکہ عموماً اس کا زیرِ بحث آنا کمزور فریق ہونے کے سبب سے عورت کے لیے زیادہ مضر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اغلباً دونوں فریق کی مصلحت یہی ہوتی ہے کہ چپ چپاتے طلاق ہو جائے اور خواہ مخواہ کو اس کے اسباب کی زیادہ کھوج کرید نہ ہو۔ ایک خاص حد تک اگر اس معاملہ میں دونوں فریق کے اولیا یا بزرگان خاندان دخل دیں اور اپنے اثرات سے کام لے کر فریقین میں صلح کرا دیں تو قرآن نے اس کو نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ مگر بیگم صاحبہ ہر طلاق کو جو ایک عدالتی معاملہ بنا رہی ہیں تو یہ ایک بہت بڑے فتنہ کی ذمہ داری اپنے سر لے رہی ہیں اور میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ خود انہی کی بہنیں اس قانون کے بنوانے پر ان کو گالیاں دیں گی اور ان پر لعنت بھیجیں گی۔

تیسری چیز اس سلسلہ میں یہ قابلِ غور ہے کہ طلاق کے معاملہ کو عدالتوں کے ساتھ باندھ دینا تجربہ سے کچھ مفید نہیں ثابت ہوا ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں تو اس سے ایسی ناقابلِ برداشت مصیبت پیدا ہو گئی ہے کہ لوگ چیخ اٹھے ہیں۔ رائٹر کی ایک تازہ خبر ملاحظہ ہو۔

ایتھنز۔ ۱۰ مارچ۔ پانچ ہزار سے زیادہ کشتگان 'قانون ازدواج' نے یونانی وزیرِاعظم فیلڈ مارشل پاپاگوس سے ایک یادداشت میں اپیل کی ہے کہ طلاق کے یونانی قواعد کو سہل بنانے کے لیے اقدام کریں۔ ان کشتگان قانون ازدواج نے یادداشت میں دعویٰ کیا ہے کہ انہیں اپنی بیویوں سے جدا ہوئے پانچ سے لے کر بیس برس تک ہو چکے ہیں لیکن موجودہ قوانین نے انہیں ابھی تک طلاق دینے کی اجازت نہیں دی۔ طلاق کے یونانی قوانین زیادہ پرانے تو نہیں ہیں لیکن ان کے تحت بیوی کو دماغی، اخلاقی یا جسمانی کمزوری کی بنا پر ہی طلاق دی جا سکتی ہے۔'

(روزنامہ نوائے وقت۔ ۱۱ مارچ)

بیگم سلمیٰ تصدق حسین صاحبہ نے بھی کم و بیش انہی لائنوں پر اپنا مسودہ مرتب فرمایا ہے اس وجہ سے انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے نتائج بعض حالات میں مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے اتنے خطرناک نکل سکتے ہیں کہ آج ان کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات بھی اپنے اندر متعدد قباحتیں رکھتی ہے کہ ایک طلاق احسن کے سوا طلاق کے دوسرے تمام طریقے ناجائز تصور کیے جائیں گے۔

طلاق احسن کا طریقہ جو قرآن نے بتایا ہے وہ یہ ہے کہ شوہر علی الترتیب دو طہروں میں اپنی بیوی کو الگ الگ دو طلاقیں دے۔ پھر تیسرے مہینے میں یا تو اس سے رجعت کر لے اگر رجعت کرنا چاہتا ہے، ورنہ خوبصورتی کے ساتھ اس کو رخصت کر دے۔ اس دوران میں بہتر یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی ایک ہی مکان میں رہیں تاکہ اگر ان کے اندر سازگاری پیدا ہونے کا کوئی ادنیٰ امکان بھی ہو تو یکجائی اس کے لیے محرک کا کام دے سکے۔

اگر طلاق کے سوا طلاق کی دوسری تمام شکلیں ناجائز قرار دے دی جائیں، جیسا کہ

بیگم صاحبہ کی تجویز ہے، تو ان حالات میں کیا کیا جائے گا جن میں میاں بیوی کی یا تو یکجائی سرے سے متعذر ہے یا تین مہینے انتظار کرنے کے لیے نہ تو نقلی کوئی وجہ موجود ہے نہ عقلی؟ نابالغہ، غیر مدخولہ اور کسی دوسرے ملک میں رہ جانے والی بیویوں کے طلاق کے معاملات آخر اس ایک ہی ضابطہ پر کس طرح پورے اتریں گے؟

طلاق احسن کے سوا طلاق کے کسی دوسرے طریقے کا عدالتوں کا درخور اعتنا نہ سمجھنا اس حالت میں تو بے شک اچھا خیال کیا جائے گا جبکہ میاں بھی اس بات پر پچھتا رہا ہو کہ وہ کیوں ایک ہی مرتبہ میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے بیٹھا اور بیوی بھی اس غم میں نڈھال ہو رہی ہو کہ وہ اپنے محبوب شوہر سے محروم ہو گئی۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو، بلکہ شوہر نے انتہائی نفرت کے ساتھ بیوی کو طلاق دی ہو اور وہ بدستور اس نفرت پر قائم بھی ہو تو ایسی صورت میں اگر عدالت اس کی طلاق اس بنا پر ناجائز ٹھہراتی ہے کہ یہ طلاق احسن نہیں ہے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ وہ ایک ایسی بیوی کو اس کے سر زبردستی منڈھ رہی ہے جس سے اس کے دل کا ریشہ ریشہ بیزار ہے۔ کیا یہ عورت کے ساتھ کوئی احسان ہوگا؟ ممکن ہے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اگر شوہر کو اس کی بیوی واقعی ناپسند ہوگی تو اس کے لیے اس سے ازسرنو چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے طلاق احسن کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن فرض کیجیے وہ عورت اپنے شوہر سے دل وجان سے بیزار تھی اور ان تین طلاقوں سے وہ خوش ہوئی تھی کہ چلو ایک عذاب سے رہائی ہوئی! لیکن بیگم صاحبہ کے اس قانون کے بعد وہ مظلوم عورت مجبور ہوگی کہ بدستور اپنے ظالم شوہر کے ساتھ بندھی ہی رہے۔ کیونکہ اس کی طلاق بیگم صاحبہ کے تجویز کردہ طریقہ کے مطابق نہیں ہے۔ کیا یہ اس عورت کے ساتھ کوئی احسان ہوگا؟

ایک ہی نشست میں تین طلاقوں کے معاملہ کو بھی اس معنی میں بدعت سمجھنا صحیح نہیں ہے جس معنی میں بیگم صاحبہ نے اس کو بدعت سمجھا ہے۔ یہ چیز حضرت عمرؓ جیسے خلیفۂ راشد کے اجتہادات میں سے ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ طلاق کو جو تین مہینوں کے اندر دینے

کی پابندی عائد کی گئی ہے یہ شوہر کے فائدہ کے لیے عائد کی گئی ہے تاکہ اس دوران میں اگر وہ چاہے تو اپنی بیوی سے رجوع کر سکے۔ لیکن اگر ایک شوہر اپنے اس حق سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تو اسے بہرحال یہ حق حاصل ہے کہ ازخود اپنے کسی حق سے دستبردار ہو جائے۔ اس سبب سے ایک ہی نشست کی تین طلاقوں کو وہ نافذ تو کر دیتے تھے لیکن ساتھ ہی اس طرح طلاق دینے والے کو اس جرم پر سزا بھی دیتے تھے کہ اس نے کتاب اللہ کے مقرر کیے ہوئے قاعدہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سزا کی موجودگی میں اس طریقۂ طلاق کو وہی شخص اختیار کر سکتا تھا جو اپنے ارادۂ طلاق میں اتنا پختہ اور اتنا سنجیدہ ہو کہ سزا کا اندیشہ بھی اس کو اس سے نہ روک سکے۔ اب غور کیجیے کہ اگر ایک شخص اپنے ارادۂ طلاق میں اتنا مضبوط ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس طرح طلاق دینا اسلامی تعزیرات کا ایک جرم ہے اور اس کی اس کو لازماً سزا بھگتنی پڑے گی، وہ اپنی بیوی کو طلاق دے ڈالتا ہے تو آخر ایسے شخص کو اس کی بیوی کے ساتھ باندھے رکھنے کا کیا فائدہ؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ بیگم صاحبہ بجائے اس کے کہ اس طریقۂ طلاق ہی کو کالعدم قرار دینے کے لیے قانون بنوائیں، اس بات کی کوشش کریں کہ حضرت عمرؓ کا طریقہ ہی صحیح طریقہ پر جاری ہو جائے۔ اس سے لوگوں کو احسن طریقہ پر طلاق دینے کی تعلیم بھی ہو گی اور وہ مشکل بھی نہ پیدا ہوگی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اور اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس ملک کی عظیم اکثریت کو اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل بھی نہیں ہوگا۔

طلاق کے ہر مقدمہ میں، اس کے جائز قرار دینے سے پہلے بیگم صاحبہ نے عدالتوں کے لیے یہ تحقیق کرنا بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اس کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں یا نہیں۔ یہ شرط ہمارے نزدیک بس کی گانٹھ ہے اور اس سے ہزاروں مفاسد پیدا ہوں گے۔ میاں بیوی کے تعلق میں اصلی چیز باہمی الفت و محبت ہے۔ اگر کسی جوڑے کے اندر یہ چیز باقی نہیں رہی ہے تو یہ تو ایک معقول بات ہے کہ اس کے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اگر ان کے دل پھٹ چکے ہیں تو پھر یہ بات نہایت احمقانہ ہے کہ ان کو محض

اس لیے ایک ساتھ باندھے رکھا جائے کہ طلاق دینے کے لیے شوہر کے پاس کوئی معقول سبب موجود نہیں ہے۔ آخر اس سے زیادہ معقول وجہ اور کیا چاہیے کہ ایک شوہر کا دل اپنی بیوی کے اندر نہیں بس رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے بیزار ہو کر اسے طلاق دے ڈالی ہے۔ اگر یہ وجہ ایک معقول وجہ ہے تو کسی مزید سبب معقول کی تلاش فضول ہے۔ اس لیے کہ یہ وجہ موجود ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے طلاق دے رکھی ہے۔ اور اگر یہ وجہ ان وجوہ میں شامل نہیں ہے جن کو ایک عدالت معقول باور کر سکے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہر اس شخص کو جو اپنی ناپسندیدہ بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے اس بات پر مجبور ہونا پڑے گا کہ وہ اپنی بیوی پر کوئی سنگین الزام اور کوئی گھنونی تہمت لگائے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے اقدام کو کسی عدالت میں مشکل ہی سے معقول ثابت کر سکے اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارے یہاں بھی انگلستان اور امریکہ کی عدالتوں کی طرح جب کوئی شخص طلاق کا مقدمہ دائر کرے گا تو ساتھ ہی اپنی بیوی کے زانیہ ہونے یا کم از کم کسی سے ناجائز راہ و رسم رکھنے کا کوئی ثبوت بھی فراہم کرے گا اگرچہ وہ کتنا ہی بعید از حقیقت ہو۔ شروع شروع میں یہ چیز ضرورت سے ایجاد ہو گی اس کے بعد آہستہ آہستہ اس کو سوسائٹی کا مزاج اس طرح اپنا لے گا کہ لوگوں میں اس کا احساس ہی مردہ ہو جائے گا۔

اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے بیگم صاحبہ ارشاد فرمائیں کہ وہ اس مسلمان سوسائٹی پر اور اپنی بہنوں پر کوئی احسان فرما رہی ہیں یا ان سب کے حق میں کانٹے بو رہی ہیں؟

بیگم صاحبہ نے غریب شوہروں پر ایک اور چپت یہ لگائی ہے کہ

> شوہر اپنی بیوی کو ایسے تمام اخراجات ادا کرے گا جو بیوی نے طلاق کے لیے دائر کردہ مقدمہ اور شوہر کی دوسری شادی کے مقدمہ کی مدافعت کے سلسلہ میں برداشت کیے ہوں۔ یہ رقم عدالت معین کرے گی جو بیوی کے عدالت میں حاضر ہونے کے وقت ادا کی جائے گی۔ نیز شوہر اس عرصہ کے لیے بھی نان نفقہ ادا کرے

> گا جب تک کہ مقدمہ زیر سماعت رہے۔

اس نان نفقہ سے متعلق بیگم صاحبہ کا تصوّر اُس تصوّر سے بالکل مختلف ہے جو شریعت سے واضح ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کو بیگم صاحبہ کے خود اپنے ہی الفاظ میں سمجھ لینا چاہیے۔ اس کی وضاحت انہوں نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

> نان نفقہ کی رقم شوہر کی جمع ذرائع آمدنی، جس میں سے شوہر پر واجب الادا محصولات وضع کر لیے گئے ہوں، کے پانچویں حصہ سے کم نہ ہو گی۔

مقدمہ کے اخراجات کے معاملہ میں انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر بیوی مقدمہ دائر کرنے کے معاملہ میں حق بجانب ثابت ہو تو اس کے مصارف شوہر سے دلوائے جائیں ورنہ یہ تو شوہر پر بڑی زیادتی ہو گی کہ ایک طرف تو اس غریب کو بلاوجہ ایک مقدمہ میں پھنسایا جائے اور پھر اسی سے اس مقدمہ کے مصارف وصول کیے جائیں اور وہ بھی پیشگی! اور پھر مزید ستم یہ کیا جائے کہ نان نفقہ کے نام سے اس کی کل آمدنی پر بیوی صاحبہ کو خمس وصول کرنے کا بھی اور وہ بھی پیشگی حق دلا دیا جائے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر بیگم صاحبہ نے اس قسم کی قانون سازی کر کے عورت کو اتنی خطرناک چیز بنا دیا تو مرد شادی کرنے کی ہمت ہی چھوڑ بیٹھیں گے۔

چند معروضات

یہاں تک ہم نے بیگم صاحبہ کے مسودہ پر ایک عام تبصرہ کیا ہے اور مقصود اس سے، جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا ہے، یہ ہے کہ اگر بیگم صاحبہ اس سلسلہ میں کسی قانون سازی کی ضرورت پر مصر ہی ہیں تو اس مسودہ کو فی الواقع اس قرآن کے مطابق کر لیں جس کی روشنی میں اس کے مرتب کیے جانے کا انہوں نے دعویٰ کیا ہے۔ اب آخر میں ہم ان کی خدمت میں صرف دو باتیں اور عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

ایک یہ کہ مغرب کی کورانہ تقلید میں یہ سمجھ بیٹھنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ تعدد ازدواج محض ایک جاہلیت کی یادگار ہے یا شوہر کو طلاق کی آزادی دینا ایک بالکل خلاف عقل وتہذیب قانون ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو ہماری اخلاقی، عائلی اور اجتماعی نظام کے تحفظ میں بڑا دخل ہے اور ہماری انتہائی نادانی ہوگی اگر ہم ان کے سوء استعمال کی کچھ مثالوں سے متاثر ہو کر سرے سے ان کے ختم کر دینے ہی کی تدبیریں سوچنے لگ جائیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اسلام نے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت اسی صورت میں دی ہے جب کوئی واقعی اخلاقی، تمدنی اور اجتماعی ضرورت اس کے لیے داعی ہو۔ مرد کو عورتوں کا باڑہ بنانے کی اجازت ہرگز نہیں دی گئی ہے۔ اور یہ بھی نہایت کڑی شرطوں کے ساتھ مشروط ہے جن کا توڑنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کسی نئی شادی کی کوئی واقعی ضرورت موجود ہے یا نہیں، اسلام نے خود مرد کی صوابدید پر چھوڑا ہے۔ اس امر کو کسی عدالت کے فیصلہ پر منحصر نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ضرورت کے اتنے پہلو ہو سکتے ہیں کہ کسی معین ضابطہ کے تحت ان کو منضبط کرنا سہل نہیں ہے۔ اس وجہ سے اسلامی قانون اس صورت میں تو مداخلت کرتا ہے جب ایک مرد ایک سے زیادہ شادیاں کر کے کوئی ناانصافی یا حق تلفی کرتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے وہ اس معاملہ میں کسی مداخلت کو پسند نہیں کرتا۔ اور اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، یہی ہے کہ یہ چیز ضابطہ بندی کی ہے ہی نہیں۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے خاندان کے نظم کو سنبھالے رکھنے کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرے۔ مثلاً ایسے بچوں کا باپ مر جاتا ہے جن کی ولایت کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں بعض اوقات ناگزیر ہو جاتا ہے کہ مرد بچوں کی ماں کو اپنے حبالہ عقد میں لے لے۔ کیونکہ بیوہ کے نکاح نہ کرنے میں بھی اندیشہ ہے اور کسی غیر جگہ نکاح کرنے میں بھی بچوں کے حقوق تلف ہونے اور ماں کی

محبت سے محروم ہو جانے کا ڈر ہے۔

اسی طرح بے شمار صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں کہ ایک شخص کا مقصد ازدواج ایک عورت سے پورا نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن نہ تو وہ خود اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لیے تیار ہے اور نہ اس کی بیوی ہی طلاق لینے کے لیے تیار ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص ایک عورت سے پوری جنسی تسکین نہ حاصل کر پاتا ہو اور وہ کسی مزید نکاح کی ضرورت محسوس کرے۔

اجتماعی اور معاشرتی ضرورت کی مثالیں ہم اوپر انگلستان اور یورپ کے حالات سے پیش کر چکے ہیں۔ ان کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

الغرض اس کی اتنی شکلیں ممکن ہیں اور اس کے اتنے واضح اور غیر واضح اسباب ہو سکتے ہیں کہ قانون کے لیے ان سب کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ قانون اس معاملہ میں اگر کوئی مؤثر مداخلت کر سکتا ہے تو صرف اس شکل میں کر سکتا ہے جبکہ نکاح کرنے والے شخص کی طرف سے کوئی تعدی صدور میں آئے۔

اسی طرح طلاق کے معاملہ میں یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ ایک ابغض المباحات ہے اور اسلام نے اس کو پسند نہیں کیا ہے لیکن اسلام اس پر ہرگز ایسی پابندیاں عائد نہیں کرنا چاہتا جن کے سبب سے اس شخص کے لیے بھی طلاق دینا ناممکن ہو جائے جو کسی وجہ سے اپنی بیوی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی راحت صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جبکہ اس کی بنیاد الفت ومحبت پر قائم ہو۔ اگر یہ بنیاد اکھڑ چکی ہو تو مصنوعی طریقوں سے اس کو جمائے رکھنے کی کوشش بسا اوقات مزید خرابیوں کا سبب بنتی ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے ایسے حالات میں میاں اور بیوی دونوں کو الگ الگ شرائط کے تحت یہ حق دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

بیگم صاحبہ سے دوسری گزارش یہ ہے کہ اس ملک میں معاشرتی خرابیوں کی اصلاح اگر پیشِ نظر ہے تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے اندر مذہب کے تحت اپنے حدود اور اپنے حقوق کی نگہداشت کے لیے بیداری پیدا کی جائے اور اس سلسلہ میں اگر قانون سازی کی ضرورت پیش آئے تو یہ کام سو فیصدی اسلام کے مطابق ہونا چاہیے۔ اسی طرح ہماری قوم اپنے فطری داعیات اور اپنی ملی روایات کے مطابق ترقی کرسکتی ہے۔ اگر یہ راستے چھوڑ کر یہاں مغرب کی کورانہ تقلید کی تلقین کی گئی اور آدھی تیتر آدھی بٹیر قسم کی قانون سازی کی گئی تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہماری قوم بالکل شتر مرغ بن کر رہ جائے گی۔

مقالہ ۶

قانونِ تحفظِ امنِ عامہ کا ترمیمی بل

ہمارے سامنے اس وقت قانونِ تحفظِ امنِ عامہ سے متعلق وہ ترمیمی بل ہے جو ہماری مغربی پاکستان اسمبلی نے ابھی حال ہی میں بڑی بھاری اکثریت سے پاس کیا ہے۔ اس بل کے ذریعہ سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر کسی جماعت کو خلافِ قانون قرار دے دیا جائے تو ایسے تمام افراد کے متعلق جو ایک ہفتہ قبل تک اس جماعت سے وابستہ رہے ہوں یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ امنِ عامہ کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

ہم اس بل کے پاس کرنے پر اپنی معزز اسمبلی کے محترم ممبروں کو مبارک باد نہیں دے سکتے۔ یہ حضرات ہماری قوم کے تعلیم یافتہ اور اونچے طبقہ کے لوگ ہیں۔ ان سے بجا طور پر ہم یہ توقع رکھتے تھے کہ یہ قانون و آئین کی اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ ہر ملک و قوم کا قانون اس کے تصورِ عدل، اس کے اجتماعی ارادہ اور اس کے شعورِ شہریت و جمہوریت کا مظہر ہوتا ہے۔ پھر یہ حضرات خوش قسمتی سے مسلمان بھی ہیں۔ مسلمان اس دنیا میں خدا کے قانونِ عدل و انصاف کے گواہ اور اس کے قائم کرنے والے ہیں۔ ان پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم اس بل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں سخت شرمندگی ہوتی ہے کہ دنیا ہمارے تصورِ عدل و انصاف کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی اور ہمارے یہ معزز ممبران کل کو خدا کے آگے کیا جواب دیں گے! اگر یہ ترمیم ایک آرڈیننس کی شکل میں آتی

جب بھی ہر صاحبِ احساس کے دل پر گراں گزرتی چہ جائیکہ اسمبلی کی بھاری اکثریت کی تائید و تصدیق کے ساتھ یہ ہمارے صوبے کی کتابِ قانون میں جگہ پائے۔ گزرے زمانوں میں انگریز اور فرانسیسی اپنی افریقی نوآبادیات کے لیے ایسے قوانین بنایا کرتے تھے اب یہ کتنے صدمے کی بات ہے کہ ایک آزاد قوم کے آزاد ممبران، خود اپنی قوم کے لیے، ایسے قانون بنا ڈالتے ہیں اور نہ تو ان کا ضمیر کوئی خجالت محسوس کرتا اور نہ ان کی پیشانی ذرا عرق آلود ہوتی ہے! قانونِ تحفظِ امنِ عامہ کی زد پہلے ہی کیا کم تھی کہ اس پر اس ترمیم کی سان بھی ضروری سمجھی گئی۔ ہمارے یہ معزز ممبران جس پارٹی کے ممبر ہیں اس کا جماعتی منشور ابھی تازہ تازہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس میں جمہوریت اور اسلام دونوں کے حقوق ادا کرنے کے جو بلند بانگ دعوے کیے گئے ہیں کیا ان کی تعبیر یہی ہے؟ ہمارے مرکزی وزیر قانون صاحب نے ابھی کل اعلان فرمایا ہے کہ ہم نے سارے خلافِ اسلام قوانین اسلامی مشاورتی کونسل کے حوالہ کر دیے ہیں کہ وہ اسلام کی روشنی میں ان میں ترمیم کا مشورہ دے۔ ایسے وعدوں کے ساتھ جب یہ کارنامے سامنے آتے ہیں تو ان کا اثر دلوں پر وہی پڑتا ہے جو پڑنا چاہیے۔ ہمارے معزز ممبروں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اقتدار آنی جانی چیز ہے، باقی رہنے والی چیز خدمات و روایات ہیں۔ اگر کوئی اچھی روایت نہ قائم ہو سکے تو چنداں قابلِ ملامت نہیں لیکن یہ تو نہ ہو کہ کوئی بری روایت قائم ہو جائے۔

ترمیم پاس کرنے والوں نے اگر خالی ذہن اور مجہول ارادے کے ساتھ یہ پاس کی ہوتی تو اس کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس ترمیم میں جماعت کا لفظ گو لفظاً نکرہ ہے لیکن ہے یہ بہت بڑا معرفہ! اس معہود جماعت کے متعلق کیا ہمارے ان معزز ممبروں کے ضمیر کی شہادت یہی ہے کہ یہ چوروں اور ڈاکوؤں کی ایک جماعت تھی جس کے اصل سرغنوں کو پکڑ لینے کے بعد ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے ساتھ وابستہ رہنے والوں کو بھی چور اور ڈاکو ہی سمجھا جائے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ان حضرات سے یہ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ ہم خود اس جماعت کے مشہور مخالفوں میں سے ہیں لیکن اس کے

باوجود ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام اور ملک دونوں کے مخلص اور وفادار ہیں اور اس جماعت کے لیڈر نے اسلام اور پاکستان دونوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار ناممکن ہے کہ پاکستان کی تحریک کی کامیابی میں سب سے بڑی نظری رکاوٹ اگر کوئی تھی تو متحدہ قومیت کے نظریہ کے سبب سے تھی۔ اس نظریہ کی بیخ کنی اور دو قومی نظریہ کے اثبات کے لیے مذہب کی روشنی میں جو دلائل اور جو جاندار لٹریچر اس جماعت کے لیڈر نے فراہم کیے اس میں اس کا شریک و سہیم کم از کم ان لوگوں میں تو کوئی بھی نہیں ہے جو آج اس کو پاکستان کا مخالف قرار دیتے ہیں۔ اب اقتدار کی کشمکش میں اگر یہ لوگ آپ کے حریف بننا چاہتے ہیں تو یہ شوق انہیں بھی پورا کرنے کا حق ہے۔ جب آپ جمہوریت کا نام لیتے ہیں تو جمہوریت کی لنکا میں تو ہر شخص باون گز کا ہوتا ہے۔ آخر جو چیز آپ کے لیے جرم نہیں وہ ان کے لیے کیوں جرم قرار پائے؟ اسی طرح یہ بات بھی صاف ہے کہ سیاست میں مذہب کا نام لینا جب آپ اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں، جیسا کہ مسلم لیگ کے منشور سے ثابت ہے، تو پھر دوسرے اگر اس کا حوالہ دیں تو اس پر کیوں اعتراض ہو؟

ہماری گزارش کا منشاء یہ ہے کہ سیاسی رقابت کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ مخالف پارٹیاں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ صوبے یا ملک کی قانون ساز مشینری گویا ان کے تعاقب میں لگ گئی ہے۔ یہ احساس لوگوں میں بددلی اور مایوسی پیدا کرے گا اور اس سے نہایت غیر صحت مندانہ رجحانات کے پرورش پانے کا امکان ہے۔ ہم صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے ارکان اور وزراء، مسلم لیگ کے لیڈروں اور خاص طور پر ریاست اور مسلم لیگ دونوں کے صدر محترم ایوب خان صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپوزیشن پارٹیوں کے معاملے میں ضروری فراخدلی کا ثبوت دیں، ہونے والے انتخابات گھٹی ہوئی فضا کے بجائے کھلی ہوئی فضا میں کرائیں۔ اس سے دنیا میں ہمارے ملک کا بھی وقار بڑھے گا اور ہمیں امید ہے کہ اس سے صدر ایوب کے وقار میں بھی بڑا اضافہ ہو گا۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اپریل ۱۹۶۳ء)

آئین کمیشن کے سوال نامہ کا جواب

آئین کمیشن (۱) کے سوال نامہ کے جواب میں چند باتیں ہم بھی کمیشن کے محترم ارکان کی خدمت میں عرض کرنی چاہتے ہیں لیکن ان باتوں کی نوعیت کمیشن کے شائع کردہ سوالوں کے رسمی جواب کی نہیں ہوگی بلکہ ایسے شخص کے دل کی آواز ہوگی جو اس ملک کے حالات کو سیاسی طالع آزماؤں کی نگاہ سے دیکھنے کے بجائے صرف ایک وفادار شہری کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جس کی دلی آرزو صرف یہ ہے کہ یہ ملک ہر پہلو سے ترقی کرے، اس کی حکومت زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو اور یہاں ہر شعبۂ زندگی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کا قانون جاری و نافذ ہو۔ اس آرزو کی کشاکش سے ممکن ہے ہماری بعض باتیں سوال نامہ کے معین کردہ حدود سے متجاوز ہو جائیں لیکن ہمیں امید ہے کہ کمیشن کے محترم ارکان ہماری یہ بے ضابطگی یہ خیال کر کے معاف فرما دیں گے کہ ہم جو کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں یہ کوئی نغمہ نہیں ہے بلکہ ایک فریاد ہے اور فریاد کسی لے کی پابند نہیں ہوا کرتی۔

ہم سب سے پہلے کمیشن کے محترم ارکان کو اس عظیم ذمہ داری کی طرف توجہ دلائیں گے جو صدر ریاست کی طرف سے ان کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم ذمہ داری ہے جس کے وہ حامل قرار پائے ہیں۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اس ملک کو

۱۔ مراد وہ کمیشن ہے جو صدر ایوب خان نے ملک کا آئین بنانے کے لیے قائم کیا تھا اور جس کی مساعی ۱۹۶۲ء کے دستور کی صورت میں سامنے آئیں۔

ایک خطرناک انتشار سے بچا کر اس کی جو خدمت انجام دی ہے، ہمارے نزدیک تاریخ میں اس کی بڑی اہمیت ہے لیکن اس اہمیت کا تمام تر انحصار اس کمیشن کے کام پر ہے۔ اگر کمیشن نے صحیح کام کرنے کی توفیق پائی، اس نے ایک ایسا دستور بنا دیا جو اس ملک کے باشندوں کے جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہو اور یہ ملک مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہو گیا تو آج اس کمیشن کے ارکان کو اس ملک کے عام باشندے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں لیکن ہماری قوم کی آئندہ نسلیں ان میں سے ایک ایک کے نام کو ہمیشہ فخر و احترام کے جذبات کے ساتھ یاد رکھیں گی۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ کمیشن ایک صحیح قسم کا دستور بنانے میں ناکام ہو گیا تو پھر نہ تو تاریخ میں اس انقلاب ہی کی کوئی اہمیت باقی رہ جائے گی جو فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کے ہاتھوں برپا ہوا اور نہ اس کمیشن ہی کا نام کوئی عزت سے لے گا بلکہ ہم نہایت صدمہ اور غم کے ساتھ یہ دردانگیز حقیقت بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ اس صورت میں اس ملک اور اس قوم کے مستقبل سے متعلق بھی کوئی اچھی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ جو قوم پورے ۱۳ سال ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی اپنی منزل مقصود اور اپنے لیے راہِ عمل متعین نہ کر سکے گی، آخر اس کو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر جگہ گھیرے رکھنے کا کیا حق حاصل ہے؟ اللہ تعالیٰ غفلتوں کی تلافی کے لیے مہلت ضرور دیا کرتا ہے، لیکن قوموں کی زندگی اور موت سے متعلق اس کے جو متعین ضابطے ہیں وہ تو بہر صورت اٹل ہیں۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا

دوسری گزارش جو ہم کمیشن کے فاضل ارکان سے کریں گے وہ یہ ہے کہ انہوں نے جو سوال نامہ شائع کیا ہے اگرچہ اس کے اکثر سوالات بجائے خود مفید اور ضروری نظر آتے ہیں، لیکن اصلی سوال جو اس قوم سے پوچھنے کا تھا کمیشن نے وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان میں قائم ہونے والی ریاست سے متعلق اس قوم کا تصور کیا رہا ہے؟ اس نے جان اور مال کی عظیم قربانیاں کس قسم کی ریاست قائم کرنے کے لیے دی تھیں؟ کن نظریات و عقائد اور کن خصوصیات و ممیزات پر اس ملک کی حکومت کھڑی کی جائے تو اس کے وہ

خواب پورے ہو سکیں گے جو پاکستان کے مطالبہ کے روزِ اوّل سے وہ دیکھتی رہی ہے؟

ہمیں افسوس ہے کہ کمیشن نے انتظامی نوعیت کے تو بہت سے سوالات پوچھ ڈالے ہیں لیکن اصلی سوال جو پوچھنے کا تھا وہ اس نے نہیں پوچھا۔ اگر اس سوال کے نہ چھیڑنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا جواب اس قوم کے ایک ایک فرد کے دل میں اور بچہ بچہ کی زبان پر ہے اور کمیشن اس سے اچھی طرح باخبر ہے تو ہمیں اس کے نظر انداز کیے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ تغافل دیدہ و دانستہ ہے اور مقصود اس سے اس سوال کی ذمہ داریوں سے دامن بچانا ہے تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سوال کی ذمہ داریوں سے دامن بچا کے اگر کوئی دستور بنانے کی کوشش کی گئی تو وہ دستور اس ملک میں کبھی کسی مضبوط حکومت کی بنیاد نہیں بن سکے گا۔

ان اصولی گزارشات کے بعد اب ہم چند باتیں کمیشن کے سوال نامہ کو سامنے رکھ کر عرض کریں گے۔ لیکن یہ امر واضح رہے کہ کمیشن کے سوالوں میں سے ہم صرف انہی سوالوں سے دلچسپی رکھتے ہیں جو کوئی اصولی اور مقصدی اہمیت رکھنے والے ہیں۔ ان سوالوں سے ہمیں زیادہ دلچسپی نہیں ہے جو محض انتظامی نوعیت کے ہیں اور جن کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی اختیار کر لیا جائے تو اس سے ہمارے نزدیک کوئی خاص خرابی ان شاءاللہ واقع نہیں ہوگی۔

سوال: آپ کے نزدیک پاکستان میں جمہوریت کے پارلیمانی طریقے کی بتدریج ناکامی کی نوعیت اور اس کے اسباب کیا ہیں جن کی بدولت آخر کار ۱۹۵۶ء کے دستور کی تنسیخ عمل میں آئی؟

جواب: اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ کسی ملک میں جمہوری حکومت (طریقہ اس کا پارلیمانی ہو یا کوئی اور) کی کامیابی کے لیے دو شرطیں مسلمہ طور پر لازمی سمجھی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کے عوام میں سیاسی بیداری ہو، ان کو اپنے حقوق کا

اچھی طرح احساس ہو، وہ اپنے لیڈروں اور حکمرانوں کا احتساب کر سکتے ہوں اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے اور ان کو قائم رکھنے کے لیے جان اور مال کی قربانیاں دے سکتے ہوں۔

دوسری یہ کہ ملک میں ایک سے زیادہ ایسی منظم سیاسی پارٹیاں موجود ہوں جن کو اہلِ ملک کا اعتماد حاصل ہو، جن کے لیڈر مضبوط قومی کردار کے حامل ہوں اور ملک کے ساتھ جن کی وفاداری ہر شبہ سے بالاتر ہو۔

جن ملکوں میں یہ دونوں شرطیں موجود پائی گئی ہیں وہاں جمہوریت نہایت کامیابی کے ساتھ چلی ہے۔ لیکن جہاں یہ چیزیں موجود نہیں پائی گئی ہیں یا پائے جانے کے بعد کسی سٹیج میں آ کر ختم ہو گئی ہیں وہاں جمہوریت بھی یا تو پائی ہی نہیں گئی ہے یا پائی گئی ہے تو بعد کے مراحل میں آ کر ختم ہو گئی ہے۔

یہ تو اس سوال کا اصولی جواب تھا۔ اب پاکستان کے حالات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جب انگریز اس ملک کو چھوڑ کر رخصت ہوئے ہیں تو ان کے سپرد کردہ اقتدار کی وارث اس ملک میں مسلم لیگ ہوئی ہے۔ مسلم لیگ کو یہ وراثت بالکل جائز طور پر حاصل ہوئی۔ جس طرح بھارت میں کانگریس ہندو جنتا کی واحد نمائندہ تھی اسی طرح یہاں مسلم لیگ مسلمان قوم کی واحد نمائندہ تھی۔ اس کے اس بلاشرکت غیرے نمایندگی کے دعوے کو اس ملک میں کوئی پارٹی چیلنج کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ مسلم لیگ کے مسلمہ لیڈر قائدِاعظم محمد علی جناحؒ تھے۔ مسلمان قوم پر ان کا ایسا ہمہ گیر اثر تھا کہ ان کے مخالف خلوتوں میں تو ان کے اوپر تنقید کر لیتے رہے ہوں لیکن پبلک میں ایک سخت خطرہ مول لیے بغیر کوئی شخص ان پر تنقید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مسلم لیگ اور قائدِاعظم کو جو اثر و اعتماد قوم میں حاصل تھا اس کی بنا پر وہی جائز حقدار تھے کہ انگریزوں سے اس قوم کی طرف سے اختیارات

وصول کریں اور جب انہوں نے وصول کیا تو گویا بالواسطہ ان اختیارات کو پاکستان میں بسنے والی قوم نے وصول کیا۔ (۲)

اس اقتدار کے حاصل کرنے کے بعد اس ملک میں جمہوریت کے چلانے کی ساری ذمہ داری مسلم لیگ پر عائد ہوتی تھی لیکن مسلم لیگ کی بنیادی کمزوری یہ تھی کہ اس کی قیادت میں قومی کردار رکھنے والے لیڈر صرف دو تھے: ایک قائدِاعظم محمد علی جناح، دوسرے لیاقت علی خاں مرحوم۔ ان دو کے سوا لیگ کی پوری قیادت میں، (ایک آدھ مرنجاں مرنج قسم کے آدمیوں کو چھوڑ کر) ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کی سیرت اور اخلاق پر اعتماد کیا جا سکے۔ یہ قیادت زیادہ تر ایسے افراد پر مشتمل تھی جو بالکل خود غرض اور غیر ذمہ دار قسم کے لوگ تھے۔ یہ تو محض قائدِاعظم کا زور اور اقتدار تھا کہ انہوں نے ان بے کردار اور بگ ٹٹ قسم کے لوگوں کو قابو میں رکھ چھوڑا تھا۔ پاکستان کے قیام کے تھوڑے عرصہ بعد جب قائدِاعظم وفات پا گئے اور پھر کچھ مدت کے بعد لیاقت علی خاں مرحوم شہید کر دیے گئے تو مسلم لیگ کی قیادت بالکل کھوکھلی ہو کر رہ گئی۔

رہا قوم کا حال تو پاکستان اور اسلام کے نعرے کے ذریعہ سے مسلم لیگ نے اپنے پیچھے پوری قوم کو لگا تو ضرور لیا تھا لیکن اس قوم کی اس نے کبھی کوئی تربیت نہیں کی۔ اس کو یہ بتانے کی کوئی کوشش کبھی نہیں کی گئی کہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور یہ ذمہ داریاں اس کو کس طرح ادا کرنی ہیں۔ اس قوم سے نعرے تو بہت لگوائے گئے لیکن اس بات کی اس کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی

۲۔ بعض خوش فہم لوگوں نے یہ دھونس جمانے کی کوشش کی ہے کہ یہ اس قوم کا احسان ہے کہ اس نے اپنے حقوق کے غصب کرنے والوں کے خلاف بغاوت نہیں کی بلکہ شرافت کی راہ اختیار کی۔ ہم اس بحث میں پڑے بغیر کہ یہ قوم بغاوت کر سکتی تھی یا نہیں۔ اپنی قوم کی اس شرافت کی تحسین کرتے ہیں کہ اس نے مفسدین کی خواہشات کے علی الرغم کوئی غلط راہ نہیں اختیار کی لیکن دھونس جمانے والوں کی اس دھونس کو سن کر ہمیں ان بھولے بھالے لوگوں کی اس ترنگ پر ہنسی ضرور آتی ہے۔

گئی کہ اس کے اپنے حقوق کیا ہیں اور ان حقوق کو حاصل کرنے اور ان کے محفوظ رکھنے کے لیے اسے اپنے لیڈروں اور اپنے حکمرانوں کو کس طرح درست رکھنا چاہیے۔ اس سیاسی تربیت سے محروم رہ جانے کے سبب سے یہ قوم سیاسی شعور سے پہلے بھی محروم رہی ہے اور اب بھی محروم ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اپنے جذبات کے لحاظ سے یہ ایک نہایت قابلِ تعریف قوم ہے۔ (۳)

نتیجہ اس صورتِ حال کا یہ نکلا کہ مسلم لیگ کے لیڈر بالکل ہی بے قابو ہو گئے۔ نہ آگے سے ان کو کوئی روکنے والا رہ گیا اور نہ پیچھے سے کوئی ان کے احتساب کی جرأت کر سکا۔ یہ لوگ خدا اور آخرت سے تو پہلے ہی سے بے پروا تھے جب حالات نے انہیں اپنے دنیوی سربراہ اور اپنی قوم کے خوف سے بھی بالکل نچنت کر دیا، تو پھر تو یہ بالکل ہی مطلق العنان ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے پاکستان کی حکومت کو ایک خوانِ یغما بنا لیا اور ان کا مقصدِ زندگی صرف یہ رہ گیا کہ جائز اور ناجائز، جن طریقوں سے بھی ممکن ہو سکے اقتدار پر قائم رہیں اور ملک کو تباہ کریں۔

۳۔ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جب بھارت میں جمہوریت پوری کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے تو آخر ہم ان سے کس اعتبار سے پیچھے تھے کہ اگر ہمارے اقتدار کے غاصبین ہمیں اقتدار سونپ دیتے تو ہم جمہوریت کو کامیابی کے ساتھ نہ چلا سکتے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال محض خوش فہمی اور خود فریبی پر مبنی ہے۔ بھارت میں گاندھی جی اور متعدد چوٹی کے لیڈروں کے مر جانے کے باوجود آج بھی نصف درجن سے زیادہ ایسے لیڈروں کے نام لیے جا سکتے ہیں جو ہمارے اوپر اپنے نقطۂ نظر سے اچھے ہوں یا برے لیکن اپنی قوم اور اپنے ملک کے وہ نہایت قابلِ اعتماد لیڈر ہیں اور نہایت کامیابی کے ساتھ وہ حکومت کو چلا سکتے ہیں۔ برعکس اس کے ہمارا حال یہ ہے کہ لیاقت علی خاں مرحوم کے بعد کوئی شخص ان صلاحیتوں کا حامل بھی نہ اٹھا جو لیاقت علی خاں کے اندر تھیں، فخر کرنے کو تو جس کا جی چاہے کرلے کہ وہ جواہر لال، راج گوپال اچاریہ، راجندر پرشاد، پنت، جے پرکاش اور ماسٹر تارا سنگھ وغیرہ سب سے بڑا لیڈر ہے لیکن اس قسم کی خود فریبیوں سے قوموں کی مشکلیں نہیں حل ہوا کرتیں۔ پھر انگریزوں سے حقوق حاصل کرنے کی جنگ میں ان کے لاکھوں آدمیوں کو یہ تربیت بھی اچھی طرح مل ہوئی ہے کہ قومی حقوق کا تحفظ کس طرح کیا جاتا ہے۔

لیگ کی قیادت کی ناکامی کے بعد قوم تندرست ہوتی تو دوسری قیادت ابھر سکتی تھی لیکن قوم میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے، سیاسی بیداری بالکل مفقود تھی اس وجہ سے دوسری جماعتیں جو وجود میں آئیں کسی قومی خدمت کے پروگرام کے ساتھ وجود میں نہیں آئیں بلکہ ان کے وجود میں آنے کا واحد محرک صرف یہ چیز تھی کہ لیگ کے ساتھ ان کو ہاتھ رنگنے کے وہ مواقع حاصل نہیں تھے جن کی وہ متمنی تھیں۔ اس دوران میں جو لوگ حکومت کے سربراہ کار بنے بدقسمتی سے وہ بھی اپنے عہدہ کی حرمت برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اس گندے کھیل سے بالاتر رہ کر ملک کے آئین اور اس کے دستور کی حفاظت کرتے لیکن وہ خود بھی اسی کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ بالخصوص غلام محمد صاحب مرحوم کی روش بڑی ہی مایوس کن رہی۔ ان کے غیر آئینی اقدامات سے ملک کے وقار اور اس کی آئینی ترقی کو ناقابلِ تلافی نقصانات پہنچے۔ اگرچہ ہمارا یہ خیال نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، کہ ان کی سروسز کے ساتھ کوئی سازباز تھی۔ وہ نہ تو عام معنی میں سروسز کے آدمی تھے اور نہ ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت موجود ہے کہ ہم ان کے افعال کی ذمہ داری پاکستان کی سروسز کے لوگوں پر ڈالیں تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے طرزِ عمل نے اس ملک کے جمہوری اقدار کو بڑا شدید صدمہ پہنچایا۔

خربوزہ خربوزے سے رنگ پکڑتا ہے اور ایک فتنہ سے دوسرے فتنے کو راہ ملتی ہے۔ لیگ کا انتشار اور اس کی قیادت کی ناکامی نے بہت سے فتنوں کے دروازے کھول دیے۔ سرحد، بلوچستان اور مشرقی پاکستان میں کھلم کھلا ایسے نعرے بلند ہونے لگے تھے جو ملک کی وحدت کو پارہ پارہ کر دینے والے تھے۔ ملک کے اندر نہ کوئی ایسا معتمد علیہ لیڈر رہ گیا تھا جو لوگوں کو صحیح رہنمائی دے سکے اور نہ کوئی ایسی سیاسی پارٹی موجود تھی جو صحیح قومی نصب العین پر عوام کو جمع کر سکے۔ اس وجہ سے صاف نظر آ رہا تھا کہ علاقائی تعصبات بھڑکا کر انتشار پسند لیڈر جگہ جگہ ایسے فتنے کھڑے کر دیں گے جو

خدانخواستہ پاکستان ہی کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ ہونے والے انتخابات میں جو پارٹیاں میدان میں اتر رہی تھیں ان کا کردار، ان کا قول اور ان کا عمل سب کچھ آزمایا ہوا تھا، ان کے نعرے تمام تر جذباتی اور انتشار انگیز تھے لیکن عوام اپنی بے شعوری کے سبب سے انہی کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔ جو پارٹیاں مذہبی نعروں کے ساتھ اٹھی تھیں ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں بن سکتی تھی کہ یہ میدان کی غالب اور حاوی پارٹیوں کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں کہ شاید ان کی نظرِ کرم کے فیض سے ان کے خوانِ کرم کا کوئی ٹکڑا ان کی جھولی میں بھی پڑ جائے۔

یہ حالات تھے کہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کا وہ انقلاب ظہور میں آیا جس نے دستور کو منسوخ کر دیا اور اس ملک میں فوجی حکومت قائم ہوئی۔ (۳)

اس انقلاب کے پہلے مرحلہ میں سکندر مرزا صاحب ایسی نوعیت سے سامنے آئے کہ بظاہر یہ انقلاب ان کا کارنامہ نظر آیا لیکن معاً ان کا جو حشر ہوا اس نے واضح کر دیا کہ انقلاب کی بانی درحقیقت فوج تھی نہ کہ مرزا صاحب۔ ہمارے نزدیک فوج نے یہ اقدام محض ملک کو انتشار اور بدنظمی سے بچانے کے لیے کیا۔ اس کے اندر نہ تو قوم کے ہاتھوں سے اقتدار کو غصب کرنے کی کسی خواہش کو دخل تھا اور نہ سروسز کے لوگوں کے ساتھ اس مقصد کے لیے کوئی سازش یا جتھہ بندی کی گئی تھی۔ جو لوگ اس قسم کا گمان رکھتے ہیں ہمارے نزدیک ان کا یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے۔ جمہوریت بلاشبہ ایک مطلوب و محبوب چیز ہے، لیکن خود ملک کی سلامتی

۳۔ ہمیں ان حضرات کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے جو ملازمین سرکار کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ انہیں ''قوم کے نمایندوں'' کے ماتحت صرف نوکری کرتے رہنا چاہیے اگرچہ یہ نمایندے حضرات سارے ملک کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیں۔ اگر ملک میں جمہوریت وقار اور ایمان داری کے ساتھ چل رہی ہو تب تو سرکاری ملازمین کے لیے یہی زیبا ہے کہ وہ ملک کی سیاست سے بالاتر رہیں لیکن اگر وہ ملک کو تباہ ہوتے دیکھیں اور صرف قوم کے نمایندوں کے ماتحت نوکری کرتے رہنے پر قانع رہیں تو ہماری نظروں میں ایسے سرکاری ملازمین کی لکڑی کے کندوں سے زیادہ وقعت نہیں ہے۔

جمہوریت سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک فوج نے خطرہ کے آخر وقت میں ملک کو بچانے کا وہ فرض انجام دیا جو اس پر عائد ہوتا تھا۔ اگر اس وقت فوج یہ اقدام نہ کر گزرتی تو وہ ایک ایسی کوتاہی کی مرتکب ہوتی جس کی تلافی شاید پھر کبھی بھی نہ ہو سکتی۔ (۵)

سوال: ان اسباب یا ایسے ہی دوسرے اسباب کے پھر رونما ہونے کا سدِ باب کرنے کے لیے آپ کیا تدابیر تجویز کرتے ہیں؟

جواب: اس سوال کا ایک جواب تو یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ جب اس ملک کے عوام میں نہ صحیح قسم کی سیاسی بیداری ہی موجود ہے اور نہ یہاں قوم پرور سیاسی پارٹیاں ہی موجود ہیں تو بہتر تو یہی ہے کہ جس طرح آئین اور جمہوریت کی بساط لپیٹ کر رکھی جا چکی ہے اسی طرح یہ بساط لپٹی ہوئی پڑی ہی رہے۔ اور اگر جمہوریت کی نمائش کسی حد تک ضروری ہی سمجھی جائے تو اس کی کوئی ایسی معصوم سی شکل یہاں کے لیے تراشی جائے جس سے یہاں کے کم علم اور کم فہم عوام مانوس ہو سکیں۔

لیکن ہمارے نزدیک اس سوال کا یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ جن لوگوں نے دستور کو معطل کیا ہے ان کے پیشِ نظر انتشار کو ختم کرنا تھا نہ کہ جمہوریت کو۔ اس وجہ سے ان کا فرض ہے کہ اس ملک میں جمہوریت کو بحال کریں اور بالکل صحیح معنوں میں بحال کریں۔ آزادی اور جمہوریت ہمارے نزدیک دونوں ہم معنی حقیقتیں ہیں۔ اگر کسی ملک کے عوام آئین اور جمہوریت سے محروم کر دیے گئے ہیں تو بالفاظ دیگر وہ آزادی سے محروم کر دیے گئے ہیں اور آزادی سے محرومی کسی حال میں بھی برداشت کیے جانے کے لائق چیز نہیں ہے۔

۵۔ یہ امر واضح کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ دستور کے معاملہ میں ہم صرف بیسک ڈیموکریسی میں منتخب ہونے والے نمائندوں ہی کی منظوری کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس مسئلہ پر ہر بالغ کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملنا چاہیے۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں عوام میں نہ صحیح سیاسی شعور موجود ہے اور نہ کوئی صحیح قسم کی قیادت موجود ہے لیکن یہ دونوں چیزیں ایسی نہیں ہیں جن کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہوں۔ ایک ایسی قوم کے اندر جو آزاد ہو چکی ہو اور جو اپنی آزادی کو باقی بھی رکھنا چاہتی ہو، ان دونوں چیزوں کا پایا جانا اس کے سیاسی بقاء کے لیے ناگزیر ہے۔ گندم، لوہا، پانی اور بجلی ہر چیز کے بغیر ایک قوم اپنی آزادی کا تحفظ کر سکتی ہے لیکن صحیح سیاسی شعور اور بے غرض قیادت کے بغیر کوئی قوم دنیا میں اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس وجہ سے آئین کمیشن کو بہرحال ایک ایسے آئین کا نقشہ تیار کرنا ہے جو نہ صرف اس قوم کو صحیح جمہوری زندگی کی آزادیاں بخشے بلکہ ساتھ ہی ان چیزوں کا بھی اہتمام کرے جو اس جمہوری زندگی کو صحیح نہج پر چلائے اور اس کو ترقی دینے کے لیے اساس کار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مقصد مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے:

(۱) یہاں انگریزی نظام یا امریکی دستور کی نقالی کرنے یا سابق دستور کی طرح کفر اور اسلام دونوں کا ایک مرکب دستور بنانے کے بجائے سو فی صد ایک اسلامی دستور بنایا جائے۔ ایک خالص اسلامی دستور اپنی فطری سادگی کے سبب سے یہاں کے عوام کے لیے قابلِ فہم اور قابلِ عمل بھی ہو گا اور ان کے دل کی تمناؤں کے مطابق ہونے کے سبب سے ان کی عقیدت اور ان کے احترام کا مرجع بھی بن سکے گا۔ اس کے لیے ملک کے عوام کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو گا کہ خود بھی اس کے ہر اصول کا احترام کریں اور اپنے لیڈروں اور حکمرانوں سے بھی اس کا احترام کرائیں۔ یہ چیز قوم کے ایک بہت بڑے طبقہ کے اندر وہ مذہبی و سیاسی بیداری پیدا کر دے گی جو صحیح جمہوریت کے قیام و بقا کی پہلی شرط ہے۔

(۲) اگر کمیشن یہ معلوم کرنا چاہے کہ ایک صحیح اسلامی دستور کے بنیادی اصول کیا

ہیں تو اس کا آسان راستہ یہ ہو سکتا ہے کہ جنوری ۱۹۵۱ء میں اس ملک کے مختلف مکتبِ خیال کے علماء نے متفقہ طور پر جو اصول طے کر دیے تھے وہ ان کو اپنے سامنے رکھ لے۔ اگر اس کے بعد بھی کچھ مسائل باقی رہ جائیں تو وہ ملک کے جید اور صاحبِ فکر علماء سے تبادلہ ء خیال کر کے یا ایک سوال نامہ کے ذریعے سے اہلِ علم کی رائیں معلوم کر کے طے کیے جا سکتے ہیں۔

(۳) اس دستور میں نہایت وضاحت کے ساتھ وہ تدابیر معین کر دی جائیں جو اس ملک میں صحیح قسم کی اسلامی قیادت کی تربیت کے لیے اس ملک کی ریاست کو اختیار کرنی ہوں گی۔ یہ واضح رہے کہ ایک اسلامی ریاست کے فرائض انجام دینے یا اس کے اندر قیادت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے اس سے مختلف صفات مطلوب ہوا کرتی ہیں جو ایک عام ریاست کی خدمت کے لیے مطلوب ہوتی ہیں۔ اسلامی ریاست چلانے والوں کے لیے نمونہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی زندگی ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ریاست اس نمونے کے اشخاص پیدا کرنے کا اہتمام خود کرے تاکہ اس کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے اہل اشخاص اس کے اداروں سے برابر پیدا ہوتے رہیں۔

(۴) اس دستور کی عوام سے منظوری حاصل کی جائے تاکہ ان کے اندر یہ احساس پیدا ہو کہ یہ دستور ان کے اوپر حکمرانوں کی طرف سے لادا نہیں گیا ہے بلکہ اس کو انہوں نے خود منظور کیا ہے۔ یہ منظوری استصواب عام کے ذریعہ سے حاصل کی جا سکتی ہے جس میں انہیں اس بات کی پوری آزادی دی جائے کہ اگر انہیں یہ دستور بحیثیت مجموعی پسند ہو تو اس کو قبول کریں اور اگر بحیثیتِ مجموعی ناپسند ہو تو اس کو رد کر دیں۔

(۵) اس دستور کو پیش کرنے، اس کو پبلک سے منظور کرانے اور اس کو اس ملک میں نافذ کرنے کے ہر مرحلہ میں موجودہ حکمران اس دیانتداری اور بے لوثی کی عملی مثال پیش کریں جو ایک اسلامی مملکت کی قیادت کے شایانِ شان ہے، تاکہ یہ عملی نمونہ دوسروں کے لیے مثال بن سکے اور آئندہ کام کرنے والوں کو ماضی کی غلط روش کے بجائے ایک نیا نقطۂ آغاز پیروی کے لیے مل سکے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ چیزیں بہت سی خرابیوں کا سدِ باب کر دیں گی جو ماضی میں اس ملک میں پیدا ہوتی رہی ہیں اور جن کے سبب سے اس کی سیاسی زندگی تباہ ہوئی ہے۔

سوال: مذکورہ بالا سوالات کے بارے میں آپ جن نتائج تک پہنچے ہیں ان کی روشنی میں:

(۱) کیا آپ پارلیمانی نظامِ حکومت کو ترجیح دیتے ہیں یا صدارتی طرزِ حکومت کو؟

(۲) کیا آپ وحدانی طرزِ حکومت کے حق میں ہیں یا وفاقی طرزِ حکومت کے حق میں؟

جواب: اسلامی نظامِ حکومت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو پارلیمانی نظامِ حکومت ہو یا صدارتی طرزِ حکومت، ان میں سے کوئی نظامِ حکومت بھی ایسا نہیں ہے جس کو ہم بعینہٖ اپنے لیے اختیار کر سکیں۔ ان دونوں کے اندر خوبیاں بھی ہیں اور نقائص بھی۔ لیکن ہمارے لیے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کے ساتھ ان کا میل ہے یا نہیں۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کے ساتھ ان میں سے کسی کا بھی میل نہیں ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت کی روشنی میں ان پر مفصل تنقید کے لیے تو اس مختصر جواب نامہ میں گنجائش نہیں ہے

لیکن ان دونوں کے اندر اسلامی پہلو سے جو بڑے بڑے نقص ہیں، ہم بالاجمال ان کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں۔

پہلے پارلیمانی نظامِ حکومت کو لیجیے:

اس نظام میں عملاً تو تمام اختیارات وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو حاصل ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی لازماً اس میں ایک نمائشی (Titulor) صدر حکومت یا بادشاہ بھی ہوتا ہے جو وزراء کا تقرر اور ریاست کے بعض دوسرے رسوم ادا کرتا اور ادا کراتا ہے۔ اسلامی نظام میں اس قسم کے کسی نمائشی گڈے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو صدر ریاست یا خلیفہ ہوتا ہے اسی کو وہ تمام حقیقی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو حکومت کو چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ اسلامی نظام پارلیمانی نظام کی اس غیر فطری ھویت سے بالکل پاک ہے اور اس کا مزاج کسی شکل میں بھی اس چیز کو قبول نہیں کرسکتا۔

اس میں دوسری خرابی، اسلامی نقطہ نظر سے، یہ ہے کہ یہ نظام درحقیقت پارٹی گورنمنٹ سسٹم ہے جو پارٹی لیجسلیچر کے اندر اکثریت حاصل کر لیتی ہے ریاست کا نمائشی صدر یا بادشاہ اسی کے لیڈر کو حکومت بنانے اور چلانے پر مقرر کرتا ہے۔ اکثریت کی پارٹی کا لیڈر وزیر اعظم بنتا ہے اور وہ اس وقت تک حکومت کرتا ہے جب تک اس کو ایوان کی اکثریت کا اعتماد حاصل رہے۔ یہ پارٹی سسٹم نہ ہو تو یہ نظام حکومت نہیں چل سکتا۔ لیکن اسلامی نظام اس پارٹی سسٹم کا محتاج نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ یہ پارٹی سسٹم اصولاً اسلامی نظامِ حکومت کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرنے اور اس کو اپنے نظامِ حکومت کی بنیاد بنانے کے بجائے اس کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔

اسی طرح وہ صدارتی طرز حکومت بھی جو امریکا میں رائج ہے اسلام کے طرز حکومت کے بالکل خلاف ہے۔

اول تو عاملہ اور مقننہ کے درمیان اس قسم کی شدید حد بندی جس قسم کی حد بندی صدارتی نظام میں ضروری سمجھی گئی ہے اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام میں خلیفہ قانون سازی (جس حد تک قانون سازی میں انسانوں کا دخل جائز ہے) کے معاملات میں براہ راست حصہ (Direct Initiative) لے سکتا ہے۔ وہ جو قانون مفید سمجھے شرعی حدود کے اندر اس کو اپنی شوریٰ کے سامنے پیش کرسکتا ہے اور اگر ضرورت محسوس کرے تو وہ مجلسِ قانون ساز کے سامنے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں لمبی سے لمبی تقریر بھی کرسکتا ہے۔

ثانیاً صدارتی نظام میں ایک مرتبہ صدر کے منتخب ہو جانے کے بعد اس کی مقررہ مدت صدارت تک جو آزادی و بے قیدی او جو غیر مسئولیت اس کے لیے تسلیم کر لی گئی ہے اسلام اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم نہیں کرتا۔ صدارتی نظام میں صدر جب ایک مرتبہ صدر بن گیا تو اس کے عہدہ کی مدت کے اندر کوئی اس کو اس کی جگہ سے ہلا نہیں سکتا اگرچہ ملک کا ایک ایک ووٹر مطالبہ کر رہا ہو کہ اس کو ہٹایا جائے۔ مجلسِ قانون ساز اس کے غلط سے غلط اقدام پر بھی کوئی گرفت کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کرسکتی ہے تو بس یہ کہ اس کے راستے میں کچھ رکاوٹیں پیدا کرے اور اڑنگے ڈالے لیکن ان رکاوٹوں اور اڑنگوں سے صدر کی مطلق العنانی میں تو مشکل ہی سے کوئی فرق پیدا ہوتا ہے البتہ ملک کی سیاسی زندگی میں بہت سی ناہمواریاں اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اسلام خلیفہ کے لیے اس قسم کی غیر مسئولیت ایک لمحہ کے لیے بھی جائز تسلیم نہیں کرتا۔ اگر آج خلیفہ کا انتخاب ہو اور کل اس کے منتخب کرنے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص اس منصب کے لیے نااہل ہے تو وہ اس کو معزول کرسکتے ہیں۔ کم از کم قانون میں اس معزولی کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ چند باتیں ہم نے محض بطور اشارہ عرض کی ہیں ورنہ یہ دونوں نظام مختلف پہلوؤں سے اسلامی نظام سے اس قدر بے جوڑ ہیں کہ اگر پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا کوئی ارادہ ہو تو ان میں سے کسی کے اختیار کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

وفاقی یا وحدانی نظامِ حکومت کے جہاں تک جواز کا تعلق ہے، یہ دونوں ہی اسلام میں جائز ہیں۔ سوال جو کچھ ہے وہ صرف ہمارے مصالح کا ہے۔ ہمارے مصالح ان میں سے جس نظام کے لیے متقاضی ہوں وہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے لیے بربنائے مصالح ہمارا رجحان وحدانی طرزِ حکومت کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وفاقی طرزِ حکومت کے جو فوائد گنائے جاتے ہیں وہ تو یہاں مطلوب نہیں ہیں اور اس کے جو نقصانات ہیں ان کے نہایت تلخ تجربات ہم کر چکے ہیں۔ مقامی مفادات و رجحانات میں سے کوئی چیز بھی ایسی ہمارے علم میں نہیں ہے جس کی کوئی حقیقی اہمیت ہو۔ اس وجہ سے ملک کے استحکام کو مقامی میلانات و رجحانات پر ترجیح دینی چاہیے۔ اگر کچھ مقامی مفادات (Local Interests) ایسے نظر آئیں جو واقعی ہوں اور جن کو وحدانی طرزِ حکومت میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ان کے لیے وہ تدبیریں اختیار کی جائیں جو ایک وحدانی نظامِ حکومت میں بھی اختیار کی جا سکتی ہیں۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ جون ۱۹۶۰ء)

مقالہ ۸

علماء کے متفقہ جواب سے اختلاف کی نوعیت

ایک عزیز دوست نے اپنے گرامی نامہ میں یہ شکوہ کیا ہے کہ لاہور سے علماء کی ایک جماعت کی طرف سے آئین کمیشن کے سوال نامے کا جو جواب شائع ہوا ہے، اس پر میں نے صرف ضد اور انانیت کے سبب سے دستخط نہیں کیے۔ اگر ضد اور انانیت کا سوال نہ ہوتا تو میں اس جواب پر ضرور دستخط کر دیتا۔ میں اپنے نفس کو برائیوں اور کمزوریوں سے پاک قرار نہیں دیتا۔ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ، لیکن اس معاملے میں میں اپنے نفس کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لینے کے بعد اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اس میں ضد اور انانیت کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ صرف دیانت دارانہ اختلاف رائے کو دخل ہے۔ میں ایمانداری کے ساتھ غور کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس جواب کے اکثر حصہ سے چونکہ میں اتفاق نہیں کر سکتا اس وجہ سے مجھے اپنا جواب الگ بھیجنا چاہیے۔ اوّل تو یہی بات بڑی معیوب ہے کہ اگر کسی شخص سے کسی ایک معاملے میں مجھے اختلاف ہو تو میں اس کی ہر بات سے، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط، اختلاف کرنے کی بیماری میں مبتلا ہو جاؤں۔ اس بیماری میں کوئی شامت زدہ آدمی ہی مبتلا ہو سکتا ہے۔ جس شخص میں معقولیت کا ذرا بھی شائبہ ہوگا وہ خدا سے اتنا بے خوف کبھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن کوئی صاحب اگر مجھے ایمان اور دیانت سے اتنا

ہی خالی سمجھتے ہیں تو وہ للہ اس بات پر غور فرمائیں کہ یہ معاملہ کسی ایک شخص کا معاملہ نہیں تھا بلکہ اس اجتماع کی دعوت دینے والوں اور اس کے شرکاء میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو میری نگاہوں میں بڑی قدر و عزت کا مقام رکھتے ہیں۔ اس کے شرکاء اور داعیوں میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ تھے جن کی میں صرف عزت ہی نہیں کرتا بلکہ ان سے نہایت گہری عقیدت رکھتا ہوں اور وہ میرے حال پر بزرگانہ شفقت فرماتے ہیں۔ پھر اس کے شرکاء اور داعیوں میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تھے جن کی میں نہایت عزت کرتا ہوں اور انہوں نے مجھ پر ہمیشہ کرم فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے شرکاء اور داعیوں میں مولانا سید داؤد غزنوی صاحب تھے جن سے میرے دیرینہ نیاز مندانہ روابط ہیں۔ ان محترم بزرگوں کی کسی رائے سے اختلاف کرنا تو میرے لیے ممکن ہے، اس لیے کہ دینی اور سیاسی معاملات میں ایک آدمی اپنے بزرگوں اور مخدوموں سے بھی اختلاف کرسکتا ہے لیکن اگر ان کے خلاف میرے اندر ضد اور عناد کا کوئی جذبہ پیدا ہو جو مجھے ان کی صحیح باتوں سے بھی اختلاف کرنے پر آمادہ کردے تو میں اس چیز کو اپنی انتہائی بدقسمتی سمجھتا ہوں۔ میں ان حضرات کو مذہب اور قوم سے محبت کرنے والا سمجھتا ہوں، ان کے خلوصِ نیت پر اعتماد رکھتا ہوں لیکن اس کے باوجود اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئے تو میں اس کو تسلیم کرنے سے انکار کردوں اگرچہ دوسروں کی نظر میں ان کی رائے کے بالمقابل میری رائے کتنی ہی غلط اور کمزور ہو۔ میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں رکھتا کہ ان سوالوں کے جواب میں جو رائیں میں نے ظاہر کی ہیں وہ غلط نہیں ہوسکتیں۔ میں ان کو صرف اپنے علم اور اپنی عقل کی حد تک صحیح سمجھتا ہوں اور عنداللہ میری ذمہ داری یہی ہے کہ میں ہر حال میں صرف وہی بات کہوں جو میرے علم اور میری عقل کی کسوٹی پر پوری اترتی ہو۔ دوستوں کو چاہیے کہ وہ جس طرح اپنی کسی رائے کو نیک نیتی اور دیانت پر مبنی سمجھتے ہیں اسی طرح میری رائے کو بھی نیک نیتی اور دیانت پر محمول کریں اور اگر وہ کسی بات کو قبول کرسکیں تو اس کو قبول کرلیں اگر نہ قبول کرسکیں تو اس کو رد کردیں، بلاوجہ اپنے آپ کو بدگمانی کے فتنے میں مبتلا نہ کریں۔ کیا معلوم کہ میرے جیسا کمزور اور گناہ گار انسان بھی کل

کو خدا کے سامنے کسی معاملہ میں نیک نیت ثابت ہو جائے۔

اس سلسلے میں بعض دوستوں نے اتفاق و اتحاد کی اہمیت اور ضرورت پر بھی بہت زور دیا ہے۔ مجھے اتفاق و اتحاد کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں ہے لیکن میں نہایت ہی ادب کے ساتھ یہ کہوں گا کہ اگر اتفاق و اتحاد کی ضرورت و اہمیت ان بزرگوں کے سامنے بھی اتنی ہی ہوتی جتنی فی الواقع ہونی چاہیے تھی تو میں توقع کرتا ہوں کہ ان سوالوں کا ایک ایسا جواب نہایت آسانی سے تیار ہوسکتا تھا جس کو اس ملک کے تمام علماء کی اگر نہیں تو ان کی اکثریت کی تصدیق و تصویب تو ضرور حاصل ہو جاتی اور یہ چیز فی الواقع ایک مؤثر اور مفید چیز ہوتی۔ لیکن جب اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل رہی جنہوں نے اپنے اپنے جوابات اپنے ہی طور پر بھیجے اور گمان غالب ہے کہ ان کے جوابات اس جواب سے مختلف بھی ہوں گے تو آخر اس سے میرا ہی الگ ہوکر کوئی جواب لکھنا کیوں قابلِ اعتراض ٹھہرے، بالخصوص جبکہ میرے جوابات کسی پہلو سے دین کے محاذ کو کمزور کرنے والے نہیں ہیں؟ بلکہ میں نے بلالحاظ اس کے کہ آئین کمیشن کے ارکان کیا قبول کریں گے اور کیا نہیں قبول کریں گے، ہر سوال کے جواب میں بے کم و کاست وہ کچھ بیان کردیا ہے جو میرے نزدیک دین کا تقاضا ہے۔

ایک اور حقیقت بھی ظاہر کردینا ہم ضروری سمجھتے ہیں جس کے اظہار کا وقت شاید آگیا ہے وہ یہ کہ ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ اسلام کے بارے میں ہمارے اور ہمارے موجودہ حکمرانوں کے درمیان ایمان اور عقیدہ کا کوئی اختلاف ہے۔ وہ بھی بار بار اسلام کا نام لیتے ہیں اور ہم بھی اسلام چاہتے ہیں۔ بالخصوص صدر ریاست فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب نے تو نہ صرف اصولاً بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق تفصیلاً مختلف مواقع پر جو کچھ کہا ہے اس سے ہم نے یہی سمجھا ہے کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقی کے لیے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اسلام ہی کی رہنمائی میں کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے نوجوانوں کو الحاد و بے دینی سے روکنے، عورتوں کو بے پردگی اور بے حیائی سے احتراز کرنے اور اپنے

ملک کے عوام وخواص کو احکام اسلام کی پابندی کی جو نصیحتیں کی ہیں وہ سب ہمارے سامنے ہیں۔ اس ملک کے دستور سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ابھی کل کی بات ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی زندگی اور ان کی حکومت کا حوالہ دیا ہے۔ ان باتوں سے ہم اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس ملک کی اجتماعی زندگی کی تشکیل میں اسلام کو وہی اہمیت وہ بھی دینا چاہتے ہیں جو اس کو ہم دینا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے اسلام سے متعلق ہمارے اور ان کے عقیدہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اختلاف جو کچھ ہے وہ عملی مسائل میں اسلام کی تطبیق کے بارے میں ہے اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ اختلاف بہت نمایاں اور بین ہے۔ یہ اتنا نمایاں اور بین ہے کہ بعض اوقات یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید ہمارے اور ان کے مابین نظریہ کا اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختلاف بڑے دور رس نتائج رکھتا ہے۔ اس کے سبب سے ذہنوں اور دماغوں کے اندر ایک کشمکش پائی جاتی ہے جس کا دور ہونا حکومت، عوام اور ملک کے دینی طبقات کی یک جہتی کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ اس کشمکش کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہم ان کے خیال سے اتفاق نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ جتنی توجہ حکومت نے اس ملک کے دوسرے اہم مسائل کی طرف کی ہے اس سے کہیں زیادہ توجہ کا مستحق یہ مسئلہ ہے۔ اسی کے حل سے اس ملک کو حقیقی استحکام حاصل ہوگا، اسی سے یہ ملک صحیح معنوں میں ایک اسلامی ملک بنے گا اور ہمارے نزدیک کمیونزم کے سیلاب کو بھی اگر کوئی چیز روک سکے گی تو یہی چیز روک سکے گی۔ کمیونزم نے اپنی جو شکل اب جاپان میں دکھائی ہے اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی ہے کہ مضبوط ایمان کے بغیر کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

لیکن اس کشمکش کو دور کرنے کی شکل کیا ہے؟ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ کی ترقی اور حالات کی تبدیلی سے یہ کشمکش آپ سے آپ دور ہو جائے گی لیکن ہم اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے۔ اسلام کوئی وہم نہیں ہے کہ مزعومہ ترقیوں کی روشنی اس وہم کو دور کر

دے گی۔ اسی طرح ہم ان لوگوں کے خیال سے بھی اتفاق نہیں کرتے جو ثقافتِ اسلامیہ وغیرہ جیسے اداروں کے نو تصنیف مذہب سے لو لگائے بیٹھے ہیں کہ قدیم و جدید کے درمیان کی اس خلیج اختلاف کو وہ پاٹ سکے گا۔ اس قسم کے اداروں کی کوششیں کچھ خام قسم کے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شکوک میں ضرور مبتلا کر دیں گی لیکن اصل مسئلہ جوں کا توں رہے گا۔ طاقت کے استعمال کا ظاہر ہے کہ اس طرح کے معاملات میں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، دنیا کے تجربات گواہ ہیں کہ طاقت ذہنوں اور دلوں کی تبدیلی کے لیے سب سے زیادہ کمزور ہتھیار ہے۔

ہمارے نزدیک اس مسئلہ کا اگر کوئی صحیح حل ہے تو یہ ہے کہ ہماری حکومت کے ذمہ دار حضرات کوئی ایسی مناسب شکل اختیار کریں جس سے ایک مرتبہ اس ملک کے قابلِ اعتماد علماء سے انہیں براہ راست تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ان مسائل پر تبادلہ خیالات کا موقع ملے جن کے بارے میں ان کا اور دینی طبقات کا نقطہ نظر ایک دوسرے سے الگ الگ ہے۔ یہ مسائل تعداد میں زیادہ نہیں ہیں لیکن ایک ذہنی کشمکش کا باعث ہیں اور کشمکش ہی کو ان کے حل کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے یہ بہتر ہوگا کہ تفہیم و تفاہم کو ان کے حل کا ذریعہ بنایا جائے۔

یہ بات ہم اس حسن ظن کی بنا پر کہہ رہے ہیں کہ ہمارے نزدیک اسلام کے بارے میں حکومت اور مذہبی طبقات کے درمیان جو فرق ہے وہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، عقیدہ کا نہیں ہے بلکہ عملی زندگی میں اس کے انطباق کا ہے۔ اسی طرح ہم اس معاملہ میں نیت اور ارادہ کا بھی کوئی فساد نہیں محسوس کرتے۔ بلکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ چونکہ دونوں طبقات کی تعلیم و تربیت الگ الگ طریقوں پر ہوئی ہے اس وجہ سے دونوں کا زاویہ نگاہ مختلف مسائل میں الگ الگ ہوگیا ہے۔ ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ یہ اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہیں ہے جس کو آسانی سے دور کیا جاسکے۔ لیکن جہاں مذہب کے بارے میں اصولی طور پر اتفاق رائے موجود ہو اور نیتوں میں کوئی فساد موجود نہ ہو وہاں تفہیم و تفاہم کی

کامیابی کے بڑے امکانات ہیں بشرطیکہ یہ حقیقت ہر ایک پر واضح ہو کہ کشمکش کی راہ نہ ملک کے لیے مفید ہے نہ مذہب کے لیے، نہ حکومت کے لیے اور نہ جمہور کے لیے۔ علاوہ ازیں مذہب کے ترجمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ جن مسائل کا تعلق براہِ راست اسلام سے نہیں ہے ان کو وہ اپنی فہرست میں شامل کرنے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس سے بلاوجہ بدگمانیاں پیدا ہوں گی۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ جولائی ۱۹۶۰ء)

مقالہ ۹

۱۹۶۲ء کے نئے دستور کے تقاضے

ہمارے ملک میں جو دستور نافذ کیا گیا ہے وہ جیسا کچھ بھی ہے اس اعتبار سے بہرحال خوش آئند ہے کہ اس نے قوم کے لیے مارشل لاء سے نکلنے اور جمہوریت کی طرف بڑھنے کی ایک راہ کھولی۔ یہ راہ اگرچہ بہت کشادہ نہیں ہے تاہم ملک کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر غنیمت ہے۔ اگر کام کرنے والوں نے پچھلے تجربات سے فائدہ اٹھایا اور ذمہ داری کے صحیح احساس کے ساتھ کام کیا تو ان شاء اللہ یہ دستور ایک معیاری دستور کی تمہید ثابت ہوگا۔

اس دستور کی کامیابی اور ناکامی کا بہت کچھ انحصار بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کی فہم و بصیرت اور ان کے سیاسی کردار پر ہے۔ اگرچہ جس وقت ان کا انتخاب ہوا تھا یہ بات عوام کے حاشیہ، خیال میں بھی نہیں تھی کہ بالآخر یہی لوگ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے نمائندوں کا انتخاب بھی کریں گے۔ لیکن صدرِ ریاست نے یہ بارِ امانت انہی پر ڈالنا موزوں خیال فرمایا۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ لوگ اس امانت کے کس حد تک اہل ثابت ہوتے ہیں اور صدرِ ریاست نے جو امیدیں ان سے باندھی ہیں وہ کہاں تک پوری ہوتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان لوگوں نے اپنے ووٹوں کی صحیح قدر نہ پہچانی اور اس قسم کے نمائندے اوپر نہ آسکے جس قسم کے نمائندے اس دستور کے پیش کردہ نصب العین کے لحاظ سے اس ملک

کی اسلامی وسیاسی ترقی کے لیے مطلوب ہیں تو اس سے صرف وہ نظام ہی نہیں متاثر ہوگا جو اس دستور کے تحت اس ملک میں قائم ہونے والا ہے بلکہ اس اعتماد کو بھی بڑا صدمہ پہنچے گا جو صدر ریاست نے بنیادی جمہوریتوں کے نظام پر قولاً وعملاً بار بار ظاہر فرمایا ہے۔ یہ امتحان بنیادی جمہوریتوں کے لیے بڑا ہی سخت ہے۔ خدا کرے وہ اس امتحان میں پوری اتر سکیں۔

ہم اس پہلو سے بھی اس دستور کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس میں اسلام کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے بلکہ قانون سازی کے معاملے میں بھی اور تمدنی وتہذیبی دائروں میں بھی اس کے حدود وقیود کو ملحوظ رکھنے کا عہد واقرار کیا گیا ہے۔ اس باب خاص میں ہمارے نزدیک اصلی اہمیت دستور کے الفاظ کی نہیں بلکہ دستور کو چلانے والوں کے نیت وارادہ کی ہے۔ اگر ان کے اندر یہ ارادہ موجود ہو کہ وہ پاکستان کو ایک صحیح قسم کی اسلامی ریاست بنائیں تو ان کی رہنمائی کے لیے وہ الفاظ کافی ہیں جو دستور میں رکھے گئے ہیں اور اگر خدانخواستہ یہ ارادہ موجود نہ ہو تو یہ الفاظ تو درکنار واضح سے واضح اور قطعی سے قطعی الفاظ اور فقروں سے بھی اسلام کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ ہمیں توقع یہی کرنی چاہیے کہ ان شاء اللہ یہ الفاظ بامعنی ثابت ہوں گے اور اس ملک کی ترقی اسلامی خطوط ہی پر ہوگی۔

دستور کا یہ پہلو تقاضا کرتا ہے کہ ووٹ دینے والے حضرات ووٹ دیتے وقت امیدواروں کے اسلامی ذہن وکردار پر ضرور نگاہ رکھیں۔ اگر اسلامی ذہن وکردار رکھنے والے لوگ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں نہ پہنچے تو دستور کے وہ الفاظ بالکل بے معنی اور بے اثر ہو کر رہ جائیں گے جو اسلام کے حق میں ہیں۔ ووٹروں کو اس حقیقت پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی کہ اسلامی ذہن وکردار صرف دعویٰ کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی شہادت دعویٰ کرنے والے کی عملی زندگی فراہم کرتی ہے۔ ووٹ مانگنے والوں میں سے تو شاید ہی کوئی شخص ایسا نکلے جو اس بات کا مدعی نہ ہو کہ اس نے ووٹ مانگنے کا یہ دردِ سر صرف اسلام کے لیے اختیار کیا ہے لیکن ووٹ دینے والے اگر چاہیں گے تو اس کی زندگی کے پچھلے اوراق پر

ایک نظر ڈال کر بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ مدعی اپنے دعوے میں سچا ہے یا جھوٹا۔

ہم نے اگرچہ اقامتِ دین کے اس نصب العین کے لیے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے پیش نظر رہا ہے انتخابات کی راہ کو کبھی وقعت نہیں دی ہے اور اب بھی ہم پورے شرح صدر کے ساتھ اپنی اسی رائے پر قائم ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری یہ رائے بھی ہے کہ اگر ہونے والے انتخابات میں اسلامی ذہن وفکر اور اسلامی کردار رکھنے والے قابل اور ذہین افراد کی ایک معتدبہ تعداد منتخب ہو کر نیشنل اسمبلی میں نہ پہنچ سکی تو اس سے اسلام کے مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ موزوں نمائندوں کا انتخاب اگرچہ صحیح طریقہ پر سیاسی پارٹیاں ہی کر سکتی تھیں لیکن اس وقت جبکہ وہ موجود نہیں ہیں اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسلامی فکر رکھنے والے قابل اور ذی اثر اشخاص خود اپنے مناسب حلقوں سے کھڑے ہوں۔ ان شاء اللہ ان کا یہ کام خدمتِ اسلام میں محسوب ہوگا۔

مشاورتی کونسل سے متعلق صدر ریاست کی خدمت میں ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ اس کے لیے ایسے اشخاص کا انتخاب فرمائیں جو اپنی دینی بصیرت کے لحاظ سے ممتاز بھی ہوں اور جن کے فکر ونظر پر عامہ مسلمین کو اعتماد بھی ہو۔

ہماری قوم کے نئے اور پرانے دونوں گروہوں میں متوازن ذہن وفکر کے ارباب بصیرت موجود ہیں۔ اگر ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا تو شاید اس خلیج اختلاف کو پاٹا جا سکے جو اسلام سے متعلق یہاں متجددین اور علماء کے درمیان حائل ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی پہلو سے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوئی جو اسلام کو ایک بازیچہ اطفال بنائے ہوئے ہیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ یہ خلیجِ اختلاف وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے گی اور نہیں معلوم کہ آئندہ یہ کس انجام پر منتج ہو۔ ہم اس سے پہلے بھی اس اختلاف کی سنگینی پر ان صفحات میں لکھ چکے ہیں اور اب اس موقع پر بھی اس کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ معروضات لائقِ اعتناء سمجھی جائیں گی۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اپریل ۱۹۶۲ء)

٤

سیاسیات

عرب حکومتوں میں خونیں انقلابات

ہمارے عرب ممالک میں پچھلے چند سالوں سے حالات جس رخ پر جا رہے ہیں وہ حد درجہ تشویش انگیز ہے۔ فوجی اور خونیں انقلابات ان ملکوں میں روزمرہ کے معمول بن گئے ہیں۔ ہر صبح کے اخبارات عرب کے کسی نہ کسی حصہ سے متعلق ایسی وحشت ناک خبریں لے کر آتے ہیں کہ انسان کلیجہ پر ہاتھ رکھے بغیر ان کا مطالعہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ خونیں انقلابات کے ابتلاء میں تو اس وقت تقریباً سارے ہی مسلمان ممالک گرفتار ہیں لیکن عرب ممالک کے حالات پڑھ کر تو اس عذاب الٰہی کی تصویر سامنے آجاتی ہے جس کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ

> اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ۔ (انعام: ۶۵)
>
> (کہ خدا تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک دوسرے سے ٹکرا دے اور پھر ایک کو دوسرے کی خون آشامیوں اور سفاکیوں کا مزا چکھائے)

یا پھر حضور ﷺ کا وہ ارشاد یاد آتا ہے جو آپؐ نے اسی قوم کو مخاطب کر کے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا کہ اب یہ اندیشہ تو نہیں ہے کہ تم اس سرزمین پر پھر سے بتوں کو پوجنے لگو گے لیکن میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تم ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو! آج کے حالات کو سامنے رکھ کر قرآن و حدیث کی ان باتوں پر غور کیجیے تو آپ ان کے

ایک ایک حرف کی تصدیق کریں گے۔ جو قوم دوزخ کے کنارے پر کھڑی تھی اور خدا نے اپنی کتاب اور اپنے پیغمبر ﷺ کے ذریعہ سے اس کو اس دوزخ سے بچایا تھا، آج وہ اپنی شامت اعمال سے پھر اسی دوزخ کے دہانے پر جا کھڑی ہوئی ہے۔ اور جو قوم وحوش اور بہائم کی طرح ایک دوسرے کی دشمن تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے نبی رحمت ﷺ کے واسطہ سے ایک دوسرے کا بھائی بھائی بنایا تھا وہ پھر ایک دوسرے کے لیے درندوں سے بھی زیادہ سفاک اور سنگ دل بن گئی۔

یمن، حجاز، عراق، اردن، شام، مصر ہر جگہ ایک ہی قسم کی ہلچل برپا ہے۔ جہاں انقلاب ہو چکا ہے وہاں جوابی انقلاب کے لیے رات دن سازشیں اور سرگرمیاں جاری ہیں۔ جہاں اب تک انقلاب نہیں ہو سکا ہے وہاں ہر لحہ ہر شخص پر انقلاب کا خوف مسلط ہے کہ معلوم نہیں کس وقت یہ کوہ آتش فشاں پھٹے اور زندگی کا سارا نقشہ ہی زیرو زبر ہو جائے! ان حالات کے اندر کسی نئی تعمیری اور فلاحی سکیم کے بروئے کار آنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو کام ہو رہے تھے وہ بھی بالکل درہم برہم ہو کر رہ گئے ہیں۔ سب سے زیادہ دردانگیز پہلو، ان روز روز کے خونیں انقلابات کا یہ ہے کہ ان ملکوں کے ذی صلاحیت افراد بڑی تیزی سے ختم ہوتے جا رہے ہیں حالانکہ ان ملکوں میں حکومت کی ضروریات کے لیے موزوں اشخاص پہلے بھی بہت کم تھے۔ آج ایک فوجی پارٹی اپنے مخالفوں کے کشتوں کے پشتے لگا کر اپنے اقتدار کی عمارت اس پر کھڑی کرتی ہے اور اپنے حریفوں کے ایک ایک نمایاں آدمی کو چن چن کر گولی مارنا شروع کرتی ہے لیکن ابھی وہ اپنے اس انقلابی شغل سے فارغ نہیں ہو پاتی کہ ایک دوسرا انقلابی ریلا آتا ہے اور آگ وخون کا یہی انقلابی کھیل اس کے سورما کھیلتے ہیں اور وہ اپنے حریفوں کو چن چن کر انتقامی گولیوں کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چکر اگر یوں ہی چلتے رہے اور ملک کے ذی صلاحیت افراد اسی طرح کتوں اور بلیوں کے مانند شکار ہوتے رہے تو چند چکروں کے بعد اگر یہ ممالک بچ بھی رہے تو ان کی حکومتیں سنبھالنے والے آدمی تو سب ٹھکانے لگ چکے

ہوں گے۔

بعض لوگ اس تمام کشت وخون اور اس سارے اکھاڑ پچھاڑ کی ذمہ داری جمال عبدالناصر پر ڈالتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جمال عبدالناصر کتنے ہی بڑے انقلابی اور کیسی ہی مؤثر شخصیت کے مالک کیوں نہ ہوں لیکن سارے عرب میں انقلاب کی آگ بھڑکا دینا ان کے بس میں نہیں ہے۔ پھر مان بھی لیجیے کہ عرب اور شام میں ان کی ریشہ دوانیاں کام کر رہی ہیں لیکن دوسرے مسلمان ملکوں میں جو اضطراب اس وقت نمایاں ہے یہ کس کا کرشمہ ہے؟ ترکی، ایران، افغانستان ہر جگہ کے حالات کم وبیش ایک ہی طرح کے ہو رہے ہیں، آخر جمال عبدالناصر کہاں کہاں دخیل ہیں؟ ہمیں تو اس بات میں بھی شک ہے کہ خود جمال عبدالناصر مامون ہیں۔ بظاہر تو انہوں نے اپنے تمام حریفوں کا کم از کم مصر میں صفایا کر دیا ہے لیکن فوجی انقلابات تو بغیر کسی نوٹس کے اس طرح دبے پاؤں آتے ہیں کہ جب تک وہ دروازے پر دستک نہیں دے دیتے بڑے بڑے شاطران انقلاب کو بھی ان کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔

ہمارے نزدیک ان تمام انقلابات کی تہ میں چند عوامل ہیں جو کام کر رہے ہیں اور وہ چونکہ تمام مسلمان ممالک میں کم وبیش ایک ہی سطح پر موجود ہیں اس وجہ سے ان پر نگاہ رکھنا سب کے لیے ضروری ہے۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اب بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں سے ہر جگہ کے عوام میں اپنے حقوق کا شعور بڑی شدت سے بیدار ہو رہا ہے۔ لوگوں میں جمہوریت کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں کا شعور ہو یا نہ ہو لیکن جمہوریت کا نعرہ ہر زبان پر ہے۔ یہ چیز وقت کا فیشن بن گئی ہے اس وجہ سے اس سے الگ ہو کر کچھ سوچنا یا لکھنا یا بولنا اب کسی کے لیے بھی ممکن نہیں رہا۔ حقوق کے اس عام احساس نے مطلق العنان بادشاہتوں یا ریاستوں کے لیے لوگوں کے دلوں میں کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے۔ مصر کے شاہ

فاروق اگرچہ کچھ سمجھ دار بادشاہ نہیں ثابت ہوئے لیکن ایک بات وہ بڑے پتے کی کہہ گئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اب دنیا میں صرف پانچ بادشاہ باقی رہیں گے، چار تاش کے اور پانچواں برطانیہ کا! ہمارے نزدیک انہوں نے یہ بات زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھ کر کہی تھی اور بڑی عارفانہ کہی تھی۔ واقعہ یہی ہے کہ اب لوگوں کے دلوں میں بادشاہوں اور بادشاہتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ انگریزوں کے ہاں بادشاہ صرف ایک مقدس نشان کی حیثیت رکھتا ہے، حقوق و اختیارات سب عوام کے ہاتھ میں ہیں، اس وجہ سے اس کی موت و زندگی کا سوال تو خارج از بحث ہے لیکن دوسروں کے لیے اب دو ہی راستے باقی رہ گئے ہیں — یا تو وہ خود اپنے آپ کو یک قلم بدل کر حقیقی معنوں میں عوام کے خادم بن جائیں یا پھر زمانہ خود ان کو بدل دے۔ تیسری کوئی اور راہ اب زمانہ کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔

دوسری وجہ اس کشمکش کی یہ ہے کہ ہمارے ملکوں میں جمہوریت کا مطالبہ تو پیدا ہو گیا ہے لیکن جمہوریت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے جس احساسِ ذمہ داری، جس فرض شناسی، جس قومی کردار، جس عوامی بیداری اور جس جمہوری قیادت کی ضرورت ہے وہ ابھی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قومی معاملات کی باگ آتی ہے وہ بڑے بودے ثابت ہوتے ہیں جس سے اجتماعی و سیاسی حالات سدھرنے کے بجائے ان میں پہلے سے بھی زیادہ انتشار اور بدنظمی کی کیفیت رونما ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ استبداد سے حقیقی جمہوریت تک پہنچنے کے لیے اس قسم کا ایک عبوری دور ناگزیر ہے لیکن ساتھ ہی پھر اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ جب تک کسی ملک میں مضبوط عوامی قیادت وجود میں نہیں آئے گی اس وقت تک فوجی انقلابات ناگزیر ہیں۔ اجتماعی زندگی نہ خلا کو برداشت کر سکتی نہ انتشار کو؟ اگر عوام جمہوریت کو صحیح طریقہ پر چلانے سے قاصر ثابت ہوتے ہیں تو انہیں آمریت کی تلخیاں گوارا کرنی پڑتی ہیں۔ اور پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس طرح کے حالات سے بھی سابقہ انہیں پیش آتا ہے جس طرح کے حالات یمن، عراق، شام اور ترکی وغیرہ میں آئے دن پیش آ رہے ہیں۔

تیسری وجہ اس کشمکش کی ہمارے مسلمان ممالک کے اندرونی معاملات میں بیرونی طاقتوں، بالخصوص امریکا اور برطانیہ کی ہر قدم پر ناروا مداخلت بھی ہے۔ ہر ملک میں ان کی مفاد پرستی نے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں، اس وجہ سے یہ ہر اس تبدیلی کی راہ میں کھلی یا چھپی مزاحمت کرتے ہیں جو ان کے گڑے ہوئے پنجے کمزور کرنے والی ہو اگرچہ وہ تبدیلی ملک اور اہلِ ملک کے لیے کتنی ہی نافع کیوں نہ ہو۔ عرب ممالک میں اس وقت جو ہلچل برپا ہے اور ان کی سیاست کا اونٹ کسی کروٹ جو بیٹھنے نہیں پا رہا ہے تو اس میں بہت کچھ دخل انہی کی سامراجی ریشہ دوانیوں کو ہے۔ یہ اپنے تیل کے مفادات اور رخاص کر اپنے خود کاشتہ پودے اسرائیل کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے اس بیداری کو بہت خطرناک سمجھتے ہیں جو عرب اتحاد کے نام سے پورے عرب کے عوام میں پیدا ہو رہی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جمال عبدالناصر کی تحریک اتحاد، عرب کو متحد اور منظم کر سکتی ہے اور یہ اتحاد ان کے مفادات اور اسرائیل کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن سکتا ہے۔ سویز کے معاملہ میں جمال عبدالناصر نے ان لوگوں کو جو چرکا دیا ہے اس کے سبب سے وہ اور بھی ان کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں۔ اس وجہ سے یہ سامراجی طاقتیں نہ تو عرب کے اتحاد کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں اور نہ اس بات کو کہ اس کی سربراہی جمال عبدالناصر کو حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس اتحاد کی مزاحمت کے لیے واحد تدبیر، جو وہ اختیار کر سکتے ہیں، یہی ہے کہ ملک کی بادشاہتوں اور ریاستوں کو اکسائیں یا مفاد پرست پارٹیوں کو استعمال کریں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ انگریز اور امریکہ اس فن کے بڑے ماہر ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جمال عبدالناصر اور عرب قومیت کے خلاف ان کی پوری مشینری نہ صرف اندرون ملک پوری طرح متحرک ہے بلکہ دوسرے مسلمان ملکوں میں بھی متحرک ہے لیکن فیصلہ تقدیر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عرب اتحاد وجود میں آ کر رہے گا اگرچہ سامراجیوں کی سازشوں کی وجہ سے اس کو آگ اور خون کے کتنے ہی مراحل سے گزرنا کیوں نہ پڑے!

جمال عبدالناصر کے نعرۂ قومیت کا ذکر آ گیا ہے تو اس کے متعلق بھی ہم چند باتیں

ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ قومیت کا نعرہ ہے تو ایک غیر اسلامی نعرہ! ایک مسلمان حکمران کی حیثیت سے جمال عبدالناصر کے شایانِ شان بات یہی تھی کہ وہ اسلامی اتحاد کی دعوت بلند کرتے، یہی ان کے ایمان کا تقاضا تھا اور اسی میں ان کے لیے، قومِ عرب کے لیے، تمام مسلمانوں کے لیے بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے حقیقی خیر و برکت تھی، لیکن اس نعرہ کے لیے اس سے کہیں زیادہ بلند عزم و ہمت کی ضرورت ہے جو جمال عبدالناصر صاحب کے اندر موجود ہے۔ وہ عرب کے موجودہ حالات میں اسرائیل اور سامراجی طاقتوں کی چیرہ دستیوں کے مقابلہ کے لیے عرب قومیت کو تو جگا سکتے ہیں لیکن اسلامی روح کو بیدار کرنا ان کے بس کا کام نہیں ہے۔ تاہم یہ خیال بالکل غلط ہے کہ عرب قومیت کا یہ نعرہ کسی درجے میں بھی اسلام یا مسلمانوں کے ملی اتحاد کے خلاف ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہونا تو الگ رہا اس کا مزاج دوسری اقوام کے خلاف جارحانہ بھی کسی درجے میں نہیں ہے۔ جمال عبدالناصر اس قومیت کے ذریعہ سے نہ تو مصر کے فرعون اور مکہ کے ابوجہل کو زندہ کرنا چاہتے اور نہ کسی قوم یا علاقہ پر فتح و تسخیر کی کمند پھینکنا چاہتے ہیں! وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ پوری قوم عرب کے سینہ پر اسرائیل کو جو مسلط کر دیا گیا ہے اس کے عذاب سے اور سامراجی سازشیوں کے فتنوں سے عرب قوم کو بچائیں۔ یہ فیصلہ تو مستقبل کرے گا کہ وہ اپنے اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں لیکن ہے یہ مقصد نہایت عظیم! اس مقصد کے حصول کے لیے مقدم شے یہی ہے کہ پوری قوم ایک جھنڈے کے نیچے آجائے۔ اس کے بغیر اس میں شبہ نہیں ہے کہ عرب قوم کا مستقبل نہایت تاریک ہے۔ خدا کرے کہ یہ قوم اپنی زندگی اور موت کے اس مسئلہ کو سمجھ جائے اور جس خانہ جنگی کی حالت میں اس کو سامراجیوں اور ان کے ایجنٹوں نے اس وقت مبتلا کر دیا ہے ایک مرتبہ اس سے نکل کر وہ پھر دنیا کو اپنے اتحاد اور اپنی سطوت کا تماشا دکھا سکے۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ جون ۱۹۶۳ء)

مقالہ ۱۱

سیاسی قتل

قتلِ ناحق خواہ کسی محرک کے تحت بھی ظہور میں آئے، خدا اور انسان دونوں کے قانون میں سب سے بڑا جرم ہے، لیکن اگر اس کا محرک سیاسی ہو تو پھر تو اس کی سنگینی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بسا اوقات اس کے نتیجے میں نہ صرف پوری قوم کی قوم خطرے میں پڑ جاتی ہے بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ پورے عالمِ انسانی کے لیے اس سے تباہی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ایک سیاسی قتل ہی سے ہوا تھا جس کے نتیجے میں ساری دنیا آگ اور خون میں ڈوب گئی!

سیاسی قتل کے وجوہ و اسباب کیا ہوتے ہیں؟ یہ مسئلہ بڑا تفصیل طلب ہے۔ اس پر اگرچہ بہت سی باتیں ہمارے سامنے ہیں اور شاید کبھی ان کے کہنے کی نوبت آئے بھی لیکن اس وقت ہم سوال کے علمی و نفسیاتی تجزیہ کے بجائے اپنے ملک کی حکومت کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ہاں اس رجحان کے ختم کرنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا دے۔ یہ فتنہ ایک ایسا فتنہ ہے جس میں بڑھنے کی بڑی غیر معمولی صلاحیت ہے اور اس سے ہمارے ملک کا امن و عدل ہی نہیں بلکہ بالآخر اس کی آزادی تک خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ہمارے مشرقی ممالک کا مزاج جن بیماریوں کے قبول کر لینے کے لیے سب سے زیادہ مستعد ہے ان میں سے یہ بیماری شاید سرفہرست ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس معاملے

میں ضرورت سے زیادہ احتیاط برتی جائے۔

سر چشمہ شاید گرفتن بہ بیل
چو پر شد نہ شاید گزشتن بہ پیل

ہمارے ملک میں سیاسی قتل کے محرکات ابھی زیادہ گہرے نہیں ہیں، لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے ذہنوں میں یہ رجحان نشوونما پا رہا ہے کہ پستول کی گولی بھی سیاسی مسائل کا کوئی حل ہے۔ یہ رجحان بڑی مستعدی سے ختم کرنے کی ضرورت ہے اور اس کو ختم کرنے کے لیے حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف دونوں کا پورا پورا تعاون ضروری ہے۔ اس نقطے پر دونوں صدقِ دل کے ساتھ اتفاق کریں کہ سیاسی قتل دنیا میں کبھی بھی کسی قوم کے مسائل کے حل کا ذریعہ نہیں بن سکا ہے۔ اس سے صرف انتشار، بدامنی اور آمریت یا غلامی کے راستے کھلتے ہیں۔ ہمیں کسی صورت میں بھی اپنی قوم کو اس راستے پر نہیں جانے دینا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر قوم کے لیڈروں کے اندر یہ عقیدہ پختہ ہو جائے گا تو یہ فتنہ زیادہ بڑھنے نہیں پائے گا۔

دوسری چیز اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ انتخابی سرگرمیوں کو یا تو شرعی حدود و قیود اور اسلامی ضابطہ اخلاق کا پابند کیا جائے یا کم سے کم اس امر کو لازم قرار دیا جائے کہ پارٹیاں اپنی پالیسی، پروگرام اور منشور کے سوا کسی دوسری ایسی چیز کو زیرِ بحث نہ لائیں جو اشتعال اور ہیجان انگیزی کا باعث بنے۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ الیکشن کے شیطانی کھیل میں ان چیزوں کا سدِباب ممکن نہیں ہے لیکن جب تک لوگوں کے اندر کھلاڑیوں کا ذہن نہیں پیدا ہوتا اس وقت تک ان چیزوں پر قدغن ضروری ہے جو قتل و خون تک نوبت پہنچا دینے والی ہیں۔ اس مسئلے پر صدر ایوب کو بھی غور کرنا چاہیے اور مختلف پارٹیوں کے لیڈر حضرات کو بھی۔

ایک چیز یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں گنڈوں کو بالتدریج شہ حاصل ہوتی جا رہی

ہے۔ یہی عنصر ہے جو سیاسی قتل کے خوفناک اقدامات کے لیے کرایہ پر حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر اس عنصر کو ختم کر دیا جائے یا دبا دیا جائے تو ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس فتنہ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ کام بہرحال حکومت کے کرنے کا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں ہے کہ گنڈوں کی یہ آزادی جو اس وقت نظر آ رہی ہے یا تو حکومت کی کمزوری کی دلیل ہے یا اس کی سہل انگاری کی اور ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو حکومت کے شایانِ شان ہو۔ ملک کے امن پسند شہری ہر قیمت پر اپنے تحفظ کے حقدار ہیں اور یہ چیز ان کے لیے مہیا کرنا حکومت کی اوّلین ذمہ داری ہے۔

(ماہنامہ **میثاق** لاہور۔ مارچ ۱۹۶۵ء)

ارکانِ بنیادی جمہوریت سے چند گزارشات

[صدر محمد ایوب خان نے اپنے دور میں بنیادی جمہوریت کے نظام کا تجربہ کیا تھا اور وہ اس نظام کے تحت منتخب ہونے والے ارکان کے ووٹوں سے صدرِ پاکستان منتخب ہوئے۔ اس انتخاب سے قبل دسمبر ۱۹۶۴ء میں یہ مضمون لکھا گیا۔]

انتخابات کے نئے پروگرام کے مطابق چونکہ صدر کے انتخاب کا مرحلہ اب بالکل سامنے ہے اس وجہ سے اس موقع پر چند باتیں ہم بنیادی جمہوریتوں کے ارکان سے کہنا چاہتے ہیں جن کے فیصلے ہی پر اب اس ملک کی قسمت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلے ہمارے ان نمائندوں کو یہ بات پیشِ نظر رکھنی ہے کہ سیاست میں بے جا عقیدت ایک غیر فطری مداخلت ہے۔ اگر مس فاطمہ جناح[1] کا آپ احترام کرتے ہیں تو یہ احترام سر آنکھوں پر لیکن صدر کا انتخاب کرتے وقت آپ اس احترام کو بالائے طاق رکھ کر معاملے کو اس پہلو سے دیکھیں کہ آپ ملت کے لیے ماں کا انتخاب نہیں کرنے چلے ہیں بلکہ ریاست کے لیے صدر کا انتخاب کرنے چلے ہیں۔ اس منصب کی عظیم ذمہ

۱۔ صدارتی انتخاب میں ایوب خان کا مقابلہ مس فاطمہ جناح نے کیا تھا۔

داریوں کے لحاظ سے دونوں شخصیتوں میں سے جس شخصیت کو آپ موزوں تر پائیں اس کو ووٹ دیں۔ اپنی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں اپنے ذاتی جذباتِ عقیدت کو مزاحم نہ ہونے دیں۔ ورنہ اس کا خمیازہ آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی بھگتنا پڑے گا اور صرف ۸۰ ہزار ممبروں ہی کو نہیں بلکہ ۱۰ کروڑ پاکستانیوں کو بھگتنا پڑے گا۔ اس معاملے میں آپ کی غلطی اس بات کا بھی ثبوت ہوگی کہ ابھی ہم پاکستانیوں میں جمہوریت کی ذمہ داریوں کا شعور نہیں پیدا ہوا ہے۔ جو قومیں آج جمہوری نظام کامیابی سے چلا رہی ہیں ان کی یہ مشترک صفت ہے کہ وہ اپنے عہدوں اور مناصب کے لیے اشخاص ان عہدوں کے تقاضوں کے مطابق منتخب کرتی ہیں۔ افسوس ہے کہ متحدہ محاذ نے ایک خالص سیاسی و انتظامی معاملے میں آپ کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور آپ کو ایک سخت امتحان میں ڈال دیا ہے۔ یہ درحقیقت حصولِ اقتدار کے لیے ایک سازش ہے جس کو اگر آپ نے ناکام نہ بنا دیا تو آپ کا ملک سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس اندیشے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ سیاسیات میں سازشی ہتھکنڈوں کے استعمال کا ردِعمل بعض اوقات نہایت خطرناک نتائج پر منتج ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ یاد رکھیے کہ اس ملک میں اسلام نہ صدر ایوب کے ہاتھوں آئے گا نہ مس فاطمہ جناح کے! صدر ایوب اگر اسلام سے بعید ہیں تو مس فاطمہ جناح بعید تر! علیٰ ہذا القیاس مسلم لیگ اور متحدہ محاذ سے بھی اسلام کے لیے کسی خیر کی امید نہ رکھیے۔ عملاً یہ دونوں ہی دین سے دور ہیں۔ بس یہ فرق ہے کہ متحدہ محاذ میں ایسی پارٹیاں بھی شامل ہیں جو عقیدۃً بھی اسلام کی باغی ہیں جبکہ مسلم لیگ میں کم از کم اسلامی نظام کے کھلم کھلا مخالفت کرنے والے موجود نہیں ہیں۔ متحدہ محاذ کے ساتھ اسلامی نظام کی مدعی جو جماعتیں شامل ہیں اوّل تو محاذ کے اندر ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، یہ حقیقت بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات سے اچھی طرح واضح ہو چکی ہے۔ ثانیاً ان میں سے کم از کم ایک جماعت — جماعت اسلامی — کے متعلق تو ہماری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے لیے

اس ملک میں اس سے زیادہ مضر جماعت کوئی نہیں ہے۔ متحدہ محاذ کی اسلام دشمن جماعتیں اسلام کی مخالفت بے دلیل کریں گی اور جماعت اسلامی کے امیر صاحب ان کے اتباع کے لیے اپنی نرالی فقاہت سے شرعی دلیلیں ایجاد کریں گے۔ جہاں تک مس فاطمہ جناح کا تعلق ہے نہ وہ مذہب کی مدعی ہیں نہ فکراً وعملاً ان کو مذہب سے کبھی کوئی واسطہ رہا ہے۔ ان کی طبعی مناسبت دین بیزاروں سے جتنی ہو سکتی ہے، دینداروں سے نہ اتنی ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ آپ اگر ان کو اپنے ووٹ سے برسر اقتدار لاتے ہیں تو اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ آپ نے ان کی دین بیزاری کو بھی اپنے اوپر مسلط کر لیا۔ بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ آپ نے ہر شعبہ زندگی میں مرد وزن کی کامل مساوات کے خالص مغربی نظریے کو اعتقاداً وعملاً تسلیم کر لیا۔ اس کا قدرتی ردِعمل جو آپ کے معاشرے پر ہوگا وہ یہ ہوگا کہ ان کے اقتدار کے چند دنوں کے اندر اندر آپ کا معاشرہ اتنا تبدیل ہو جائے گا کہ پھر قیامت تک اس کے اسلام کی طرف مڑنے یا موڑنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جائے گا۔ یہ جنگ جو آج اسلامیت ومغربیت میں ہو رہی ہے وہ مغربیت کی فتح پر ختم ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ صدر ایوب کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ اسلام سے ناواقف ضرور ہیں لیکن اسلام سے بیزار نہیں ہیں۔ ان کا مزاج سپاہیانہ اور ان کے اندر حمیت ملی وقومی ہے۔ انہوں نے غلطیاں ضرور کی ہیں لیکن ان کی اصلاح کی راہ مسدود نہیں ہوئی ہے۔ ان سے لڑنے کے لیے میدان کھلا ہوا ہے اور انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں اصلاح پذیری کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ کوئی سوکھی ہوئی لکڑی نہیں ہیں جو ٹوٹ تو سکے لیکن لچک نہ سکے۔ وہ چند سال میں بہت بدلے ہیں اور آئندہ بہت بدل سکتے ہیں۔ اس انتخاب میں وہ کامیاب ہو گئے تو ہمیں امید ہے کہ وہ عوامی آدمی بھی بن جائیں گے اور مذہبی پہلو سے بھی ان میں مفید تبدیلیاں آئیں گی۔

تیسری بات یہ یاد رکھیے کہ آپ کو صرف جمہوریت ہی کی نہیں بلکہ مستحکم حکومت کی بھی ضرورت ہے۔ آپ کے ملک کے عوام برطانیہ کے عوام کی طرح تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور نہ

آپ کی سیاسی پارٹیاں وہاں کی پارٹیوں کی طرح اپنے حقوق وفرائض کے معاملے میں تربیت یافتہ ہیں۔ اس امر کو نظر انداز نہ کیجیے کہ یہاں عوام کو آسانی سے گمراہ کیا جا سکتا ہے اور سیاسی پارٹیاں بسا اوقات مفاد ملک کے خلاف سرگرمیوں میں منہمک ہو جاتی ہیں۔ پھر ہمارے ملک کے دو بازو ہیں اور دونوں میں ہزار میل کا فاصلہ بھی ہے اور بدقسمتی سے مفسد پارٹیوں نے دونوں کے اندر شدید قسم کی غلط فہمیوں کی تخم ریزی بھی کر رکھی ہے۔ علاوہ ازیں بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کیا صورت پیش آ جائے۔ ایسے حالات میں آپ کے لیے جمہوریت کی وہ شکل جس کی علم بردار مس فاطمہ جناح ہیں، نہایت خطرناک ہے۔ مس فاطمہ جناح کے پیچھے جو پارٹیاں جمع ہوئی ہیں ان کے درمیان کوئی رابطہ ایوب دشمنی کے سوا نہیں ہے۔ صدر ایوب اگر خدانخواستہ ہٹ گئے تو ان کا یہ رابطہ بھی ٹوٹ جائے گا اور پھر یہ ایک دن کے لیے بھی کوئی مضبوط حکومت نہ بنا سکیں گی۔ چودھری محمد علی صاحب نے یہ مینڈکوں کی پنسیری باندھی ہے جس کو باندھے رکھنے پر مس فاطمہ جناح قادر نہ ہو سکیں گی اور خود چودھری صاحب کا تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ اندرونِ خانہ سیاست کے تو ماہر ہیں لیکن میدان میں نکل کر حالات کا مقابلہ کرنے کے معاملے میں سخت بودے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ ابتری اور انتشار کی شکل میں ظاہر ہوگا اور پھر دو ہی امکانات سامنے ہیں — یا تو کوئی انقلاب ظہور میں آئے یا خدانخواستہ ہم آزادی ہی سے محروم ہو بیٹھیں! ان دونوں میں سے کوئی امکان بھی گوارا کیے جانے کے لائق نہیں ہے۔ اس وجہ سے صدر ایوب کو ووٹ دیجیے تاکہ آپ جمہوریت کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کو بھی مضبوط بنا سکیں۔ انگریزوں کا نظام بالکل غیر فطری اور غیر عقلی ہے۔ یہ تو ان کے مخصوص قسم کے ٹھنڈے سیاسی مزاج کی برکت ہے کہ وہ ان کے ہاں چل رہا ہے۔ اس کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے مضبوط عوامی قیادت اور ہمہ گیر عوامی سیاسی شعور ناگزیر ہیں۔ ہمارے ہاں یہ چیزیں مفقود ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لیے ان کی ریس خطرناک ہوگی۔ ہم اپنے ملک کے سیاسی استحکام کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے۔ ہمیں کمزور قوم کی حیثیت سے

جینے کا ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کرنا چاہیے۔

یہ حقیقت بھی یاد رکھیے کہ حکومت کا مزاج فاعلانہ ہونا چاہیے نہ کہ منفعلانہ۔ اس کی اصلی سرشت مردانہ ہے نہ کہ زنانہ۔ عورت کا مزاج منفعلانہ ہوتا ہے اور اس کے اصل فطری فرائض کے لحاظ سے اس کا یہی مزاج اس کے لیے موزوں ہے۔ اپنے اس مزاج کے لحاظ سے عورت حکومت کے لیے فطرتاً ناموزوں ہے۔ اگر حکومت عورت کے سپرد کر دی جائے تو حکومت کا مزاج بھی اس کے اثر سے بگڑ کر زنانہ ہو جاتا ہے جس سے اس کی صلاحیت کار بالکل برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ علم السیاست کے مشہور ماہر بلنچلی نے تاریخی اور فلسفیانہ دونوں ہی پہلوؤں سے ثابت کیا ہے کہ حکومت کے معاملات میں عورت کی مداخلت حکومت کے مزاج کو بگاڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہی رمز ہے کہ امریکا کے لوگوں نے جمہوریت اور مساواتِ مرد وزن کے نظریہ پر ایمان رکھنے کے باوجود آج تک اپنے ہاں کسی عورت کو صدر نہیں بنایا۔ انگریز وراثت اور ولی عہدی کے نظام کی مجبوریوں کی وجہ سے کبھی کبھی کسی عورت کو بادشاہ بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں بادشاہ محض ایک مقدس نشان ہے، حکومت ان کے ہاں چرچل، اٹیلی، ایڈن، میک ملن اور ولسن جیسے لوگوں ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اس وجہ سے اس نے قوامیت اور سربراہی کا منصب مرد کے سپرد کیا ہے۔ عورت کو نہ گھر کا قوام بنایا ہے نہ باہر کا! ہمارے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جو اپنی باگ ایک عورت کے ہاتھ میں پکڑائے گی! آپ کس طرح یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اپنی حکومت کا مزاج و کردار زنانہ بنا کر اور اپنے پیغمبر ﷺ کی ہدایت کی مخالفت کر کے فلاح پا سکیں گے؟ ہمیں اپنی حکومت کے مردانہ مزاج و کردار کو نہ صرف باقی رکھنا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کو ترقی دینا ہے۔ اس وجہ سے اس انتخاب کے موقع پر ان لوگوں کی کوششوں کو ناکام بنا دیجیے جو ہماری حکومت کے مزاج کو نسوانی اور نامردانہ بنانا چاہتے ہیں۔

اس نازک موقع پر اس بات کو بھی یاد رکھیے کہ دین اور عقل دونوں سے بعید تر جماعت

اس ملک میں اگر کوئی ہے تو جماعت اسلامی ہے! یہ جماعت اب صحیح فکر اور صحیح عمل کی توفیق سے محروم ہو چکی ہے۔ اس کی ہر بات الٹی ہوتی ہے اور جو قدم بھی یہ اٹھاتی ہے اس سے اپنی بے راہ روی اور ضلالت کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ اس جماعت نے مس فاطمہ جناح کی حمایت میں جو دلیل پیدا کی ہے اس کی بنیاد ملک کے موجودہ حالات کی نزاکت پر رکھی ہے۔ یعنی حالات بہت پیچیدہ اور نازک ہیں اس وجہ سے اسے مس فاطمہ جناح کی صدارت کی حمایت پر مجبور ہونا پڑا۔ غور کیجیے کہ نازک اور پیچیدہ حالات دنیا میں مردوں کے حل کرنے کے ہوتے ہیں یا عورتوں کے؟ جس قوم کے مرد ملکی مسائل کی گتھیاں سلجھانے سے قاصر ہو جائیں گے، کیا اس کے مسائل ایک عورت حل کرے گی؟ پھر اس سے زیادہ قابلِ ماتم بات یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ لوگ مجبوری کا عذر پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اضطرار میں کوئی جان بچا لینے کے لیے خنزیر کھا لیتا ہے اسی طرح انہوں نے مس فاطمہ جناح کی صدارت گوارا کر لی ہے، دوسری طرف یہ حال ہے کہ ملتان میں اس جماعت کے قیم نے مس فاطمہ جناح کو 'نورِ خدا' سے تشبیہ دی۔ بتائیے، ہے ان دونوں باتوں میں کوئی مناسبت؟ جن لوگوں کو مس فاطمہ جناح کے اندر بھی نورِ خدا نظر آئے انہیں کہاں نورِ خدا نظر نہیں آ سکتا؟ یہ مس فاطمہ جناح کی خوبی نہیں ہے کہ آج ان کے اندر نورِ خدا پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ صرف ان حضرات کی آنکھوں کی خیرگی کا کرشمہ ہے کہ انہیں، ان کے اندر بھی نورِ خدا نظر آنے لگا ہے۔ جب کسی کی غیرتِ ایمانی مردہ اور بصیرتِ روحانی سلب ہو جاتی ہے تو اس کو اسی طرح کے عجائب نظر آتے ہیں۔ آخر دنیا نے گایوں اور بچھڑوں کی پوجا اور پتھروں اور مورتوں کی پرستش یوں ہی تو نہیں کی ہے!

یہ امر بھی یاد رکھیے کہ جو لوگ اپوزیشن میں ہوتے ہیں ان کے لیے جھوٹے سچے وعدے کرنے اور امیدوں کے سبز باغ دکھانے کے بڑے مواقع ہوتے ہیں۔ وہ انتظام کی ذمہ داریوں اور حکومت کی زیر باریوں سے بالکل فارغ ہوتے ہیں، اس لیے بڑی آسانی سے لوگوں کو بے وقوف بنا سکتے ہیں۔ یہ راتوں رات دودھ اور شہد کی نہریں جاری کر سکتے

ہیں، جمہوریت کی بہار لا سکتے ہیں، کتاب و سنت کے انوار سے ملک کے کونے کونے کو جگمگا سکتے ہیں اور معلوم نہیں کیا کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ادھار ہوتا ہے اور اس کے لیے انہیں الفاظ کے سوا اور کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ جو برسر اقتدار ہو اس کو یہ آسانیاں حاصل نہیں ہوتیں، اس کو سارا معاملہ نقد نقد کرنا پڑتا ہے اور نقد اور نسیہ میں جو فرق ہے وہ معلوم ہے۔ اپوزیشن کے بزرگوں میں سے جن لوگوں کے اقتدار کا ابھی آپ نے تجربہ نہیں کیا ہے ان کے بارے میں ابھی کچھ کہنا تو قبل از وقت ہے، لیکن ان میں سے جن جن حضرات کے اقتدار کا تجربہ آپ صوبوں یا مرکز میں کر چکے ہیں ان کے دور اقتدار کو حافظے پر ذرا زور ڈال کر یاد کیجیے کہ جب ان کے ہاتھ میں حکومت کی باگ تھی، تب انہوں نے کیا بنایا ہے اور پھر اسی سے اندازہ کیجیے کہ آئندہ اگر انہیں آپ نے اقتدار کی امانت سونپی تو وہ کیا بنائیں گے!

یہاں اپوزیشن کے تمام آزمودہ افراد کا تذکرہ تو بہت طوالانی ہو جائے گا جس کے لیے گنجائش نہیں ہے اس لیے ہم صرف چودھری محمد علی صاحب کے حوالے پر کفایت کرتے ہیں۔ چودھری صاحب اپوزیشن کے گل سرسبد ہیں اور ہم بھی ان کی قابلیت کے مداحوں میں ہیں۔ یہ حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل بھی رہ چکے ہیں، وزیر مالیات بھی رہ چکے ہیں اور وزیراعظم بھی! دل میں ان کے لیے چونکہ ایک احترام ہے اس وجہ سے ان کے دور کی بعض باتیں حافظہ میں محفوظ ہیں۔ چودھری صاحب مالیات کے ماہر ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ چودھری صاحب کے دور کے لحاظ سے آج پاکستان کی مالی پوزیشن بہت مستحکم ہے۔ چودھری صاحب شہری آزادیوں اور جمہوریت کے بڑے دلدادہ ہیں، لیکن چودھری صاحب کے دور میں جو سیفٹی قوانین نافذ رہ چکے ہیں، میں ذاتی تجربے کی بنا پر پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ آج کے قوانین ان سے ہزار درجے لبرل ہیں۔ چودھری صاحب نے ایک 'اسلامی دستور' بھی بنوایا تھا جس میں 'لاء کمیشن' نامی ایک چیز بھی تھی۔ میں اس کے متعلق بھی ذاتی تجربے کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ موجودہ مشاورتی کونسل کی

پوزیشن آئینی لحاظ سے اس کمیشن سے کہیں زیادہ باوقار اور مضبوط ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ کونسل کوئی کام کرے یا نہ کرے۔ مجھے یاد ہے کہ چودھری صاحب نے اپنے دور میں کشمیر کے مسئلے کو بھی زندہ کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کی مسیحائی ذرا کارگر نہ ہوئی۔ لیکن صدر ایوب نے نہ صرف کشمیر کے مسئلے کو ایک زندہ مسئلہ بنا دیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بھارت کے لیے ایک اور مستقل دردِ سر بھی پیدا کر دیا -- ان باتوں کے ذکر سے مقصود چودھری صاحب کی صلاحیتوں کی تحقیر نہیں ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ آج اپوزیشن میں ہونے کی وجہ سے وہ جس بے دردی سے تنقید اور جس فیاضی سے وعدے کر رہے ہیں اس کے متعلق ان کے ماضی کو دیکھ کر فیصلے کیجیے۔ ان کے بارے میں شروع سے ہماری ایک رائے ہے جو آج ہم بلا کسی ارادۂ تحقیر کے ظاہر کر رہے ہیں کہ ان میں ایک سگھڑ بیوی کی تو ساری صفات موجود ہیں لیکن وہ قوامیت کی صفات سے بالکل عاری ہیں!

محترمہ مس فاطمہ جناح کا اب تک اس کے سوا کوئی تجربہ نہیں ہوا ہے کہ وہ سال میں چند مخصوص مواقع پر ایک خاص ڈھنگ کے بیانات دیتی رہی ہیں۔ انہیں سیاسی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ان میں کسی مذہبی خدمت کا تو درکنار کسی سماجی خدمت کا بھی کوئی ذوق و شوق کبھی محسوس نہیں ہوا۔ جمہوریت کا لفظ وہ بار بار دہراتی ہیں لیکن اس کے لیے جس مزاج اور جس جذبہ، خدمت کی ضرورت ہے وہ ان کے اندر مفقود ہے۔ ملک کی صدارت جیسے منصب کے لیے اگر آپ نے محض ان کی انتخابی تقریروں پر اعتماد کر کے ان کا انتخاب کر لیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اس کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔ صدارت کے منصب کی ذمہ داریوں کے لیے قوت، قابلیت اور ساتھ ہی صبر اور پتہ ماری کی ضرورت ہے، وہ ان اوصاف سے بالکل خالی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ متوقع اس بات کی ہوں گی کہ ان کے احکام کی تعمیل کن فیکون کی طرح کی جائے اور لوگ ان کا احترام قائداعظم کی طرح کریں۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوگی۔ پھر کیا ہوگا، اس کے نتائج کا اندازہ آپ خود کر لیجیے!

جنرل اعظم فطرتاً ایک ڈکٹیٹر ہیں۔ ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں جو مارشل لاء جاری ہوا تھا اس میں ان کا اصلی مزاج بے نقاب ہو چکا ہے۔ وہ جب جمہوریت کا نام لیتے ہیں تو واقعی ہمیں حیرانی ہوتی ہے۔ یہ ان کے اپنے فکری انقلاب کا کرشمہ ہے یا صدر ایوب کی مخالفت کا جوش ان کو اس نیک راہ پر لایا ہے، اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم صرف یہ عرض کر سکتے ہیں کہ ان کے اوپر اعتماد کرنے میں جلدی نہ کیجیے۔ ہو سکتا ہے کہ جمہوریت کا یہ عشق ان کے اندر ایوب دشمنی کی راہ سے پیدا ہوا ہو۔ اگر خدانخواستہ بات یہی نکلی تو ان کے اوپر آپ کا اعتماد نہایت مہلک نتائج کے دروازے کھول سکتا ہے۔ اگر فی الواقع ان کے اندر کوئی نظریاتی تبدیلی ہوئی ہے تو اس کو انہیں کچھ عرصہ سماجی خدمات میں مصروف رہ کر پختہ کرنا چاہیے۔ بغیر اس ریاضت کے اگر وہ 'مادرِ ملت' کی آڑ میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے زور لگائیں گے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ ان کے ہاتھوں جمہوریت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ یہ چیز خود ان کے بھی سوچنے کی ہے اور وہ نہ سوچیں تو بی۔ ڈی کے ممبروں کے سوچنے کی ہے!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ دسمبر ۱۹۶۳ء)

آزادانہ انتخابات

ہمارے ملک میں اب انتخابات کی گہما گہمی شروع ہونے والی ہے جس کے ابتدائی آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ انتخابات جمہوریت کی جان ہیں اور ان کی قدر و قیمت کا انحصار اس امر پر ہے کہ یہ ہر قسم کے سرکاری اور غیر سرکاری اثر و اقتدار کی ناروا مداخلت سے آزاد ہوں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ذمہ داروں کی طرف سے بار بار یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ اس میں کوئی مداخلت نہ ہونے دی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ اطمینان دہانی بالکل سچی ثابت ہو گی اور صدر ایوب جس طرح پچھلے انتخابات کے معاملے میں نیک نام رہے ہیں اس سے زیادہ وہ ہونے والے انتخابات میں نیک نام رہیں گے۔ مملکت کے سربراہ ہونے کے پہلو سے انہی پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس ملک کو، جو بدقسمتی سے گزشتہ ادوار میں جمہوریت کے آداب و رسوم سے آشنا نہ ہو سکا، اس چیز سے آشنا کریں اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ اس ملک میں جو انقلاب وہ لائے اس سے مقصود ملک کے عوام کو اختیار و آزادی سے محروم کرنا نہیں بلکہ اختیار و آزادی سے ہم کنار کرنا ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جمہوریت کی کوئی ایک ہی متعین شکل نہیں ہے بلکہ اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ اس وجہ سے ہم یہ مانتے ہیں کہ اس راہ سے بھی جمہوریت کے نصب العین تک پہنچا جا سکتا ہے جو ہمارے ملک میں صدر ایوب نے اختیار فرمائی ہے۔ لیکن اس کے لیے یہ شرط ضروری ہے کہ انتخابات اپنے ہر مرحلے میں آزادانہ ہوں اور

حکومت اپوزیشن پارٹیوں کے معاملہ میں فراخ دلانہ رویہ اختیار کرے۔ اگرچہ اپوزیشن پارٹیوں پر بھی یہ بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے فکر وعمل میں سنجیدہ ہوں اور ملک وملت کے مفاد کو ہر چیز پر مقدم رکھیں اور مخالفت برائے مخالفت کی کورانہ روش سے احتراز کریں۔ لیکن حقیقی جمہوریت کی پسندیدہ روایت یہی ہے کہ حزب اقتدار ان معاملات میں اپوزیشن کو بہت دور تک گنجائش دیتی ہے اور اس چیز کو ملک میں جمہوریت کے فروغ کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے۔

اسی معروف روایت کے تحت ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ حزب اقتدار فیاضانہ روش اختیار کرے گی۔ رواداری سے رواداری اور فیاضی سے فیاضی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح ملک میں صحت مندانہ رجحانات کو ترقی ہوتی ہے۔ ہم صدر ایوب سے یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ اگر وہ کالعدم جماعت اسلامی سے پابندی اٹھا کر اس کو بھی انتخابات میں حصہ لینے کا موقع دیں تو اس سے ہونے والے انتخابات کی قدر و قیمت میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔ ہمیں اس معاملے کے قانونی پہلوؤں سے بحث نہیں، کسی امر کے قانونی پہلوؤں کو طے کرنا عدالتوں کا کام ہے، ہم اس کے سیاسی پہلو کو سامنے رکھ کر یہ عرض کرتے ہیں کہ اگر جماعت اسلامی کو بھی انتخابات میں حصہ لینے کا موقع دے دیا جائے تو اس طرح ان لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی جو ملک کے اندر اور باہر لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہیں گے کہ یہ انتخابات اپوزیشن پارٹیوں کو جیلوں میں بند کر کے کرائے گئے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ اس وقت ملک میں صدر ایوب کو اور ان کے واسطہ سے ان کی پارٹی کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں کوئی بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات دانشمندی کے بالکل خلاف ہوگی کہ کسی جماعت کو پابند رکھ کر انتخابات کے متعلق لوگوں میں خواہ مخواہ ایک غلط تاثر پھیلنے اور پھیلانے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ہر شخص جو ملک کے حالات پر نظر رکھتا ہے اندازہ کر سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں اگر جماعت اسلامی میدان انتخابات میں آ بھی جائے تو اس سے

صورت حال میں کسی قابل ذکر تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہائیکورٹ کے فل بنچ کے فیصلہ کے بعد حکومت کی پوزیشن تہمت اور شبہ سے بھی بری ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اگر حکومت جماعت کے معاملہ میں فیاضانہ رویہ اختیار کرے گی تو اس کا ملک کے ہر طبقہ پر نہایت اچھا اثر پڑے گا اور ہونے والے انتخابات سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، نہایت خوشگوار توقعات قائم ہوں گی۔

ہم نے یہ جو کچھ عرض کیا ہے محض حکومت کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت عرض کیا ہے۔ ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہمیں جماعت کے نظریات، اس کے طریقہ کار اور اس کے لب ولہجہ ہر چیز سے اختلاف ہے۔ اس اختلاف کے باوجود، جہاں تک ہمارا علم ہے، اس کی بنا پر ہماری رائے یہی ہے کہ یہ لوگ ملک وملت کے خیر خواہ ہیں اور اپنے فہم وبصیرت کے حد تک ملک وقوم ہی کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت کی فیاضی کا ان لوگوں کے ذہنوں پر بھی اچھا اثر پڑے گا اور یہ حالات کا حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے از سر نو جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ جولائی ۱۹۶۴ء)

صدارتی انتخابات میں
صدر ایوب کی کامیابی

اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ صدارتی انتخاب کا ہنگامہ بڑے اچھے نتائج پر ختم ہوا۔ صدر ایوب نہ صرف یہ کہ کامیاب ہوئے بلکہ بڑی واضح اکثریت سے کامیاب ہوئے اور اس کامیابی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس ملک میں پہلی مرتبہ چند ایسی مثالیں قائم کر دی ہیں جو امید ہے ہماری سیاسی زندگی میں آئندہ روایت کا درجہ حاصل کر لیں گی اور ان سے جمہوریت کے نصب العین کو بڑی تقویت حاصل ہو گی۔

صدر ایوب پہلے شخص ہیں جو فی الواقع عوام کے ووٹ سے منتخب ہو کر اس ملک کے صدر بنے ہیں۔ اس سے پہلے کوئی صاحب بھی یہ شرف حاصل کرنے کی ہمت نہ کر سکے تھے۔ صدر ایوب نے نہ صرف یہ کہ اس ملک میں پہلی مرتبہ عام انتخاب کرایا بلکہ نہایت واضح طور پر اپنے دستور، اپنی پالیسی، اپنے پروگرام، بلکہ اپنی پوری زندگی کو لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور ہر شخص کو کھلی چھٹی دے دی کہ جو شخص جس طرح اور جن لفظوں میں چاہے ان کی زندگی اور ان کی پالیسی اور پروگرام پر تنقید کرے۔ جو لوگ پچھلے چند مہینوں میں متحدہ محاذ کے لیڈروں اور اخباروں کی تحریریں، تقریریں اور بیانات پڑھتے رہے ہیں وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ اس دوران میں جو کچھ صدر ایوب کے متعلق کہا گیا

ہے، جو افواہیں ان کے متعلق پھیلائی گئی ہیں، نیز جو لب ولہجہ ان پر تنقید کا رہا ہے وہ ساری چیزیں نہایت صبر آزما تھیں جن کو ایک نہایت منجھا ہوا مضبوط سیاسی آدمی ہی برداشت کر سکتا تھا۔ صدر ایوب نے نہ صرف یہ کہ ان چیزوں کو برداشت کیا بلکہ ایسی رواداری اور بلند حوصلگی کے ساتھ برداشت کیا کہ یہ حقیقت انہوں نے آفتاب کی طرح واضح کر دی کہ ہمارے لیڈر حضرات میں سے کوئی صاحب اس وصف میں ان کے پاسنگ ہونے کا درجہ بھی نہیں رکھتے۔

پولنگ کے لیے جو قواعد وضوابط اختیار کیے گئے وہ ہمارے ملک میں پہلی مرتبہ اختیار کیے گئے۔ ان قواعد وضوابط نے ممکن حد تک دھاندلی اور دھونس کے امکانات کا سدِ باب کر دیا۔ انسانی کاموں میں جو احتیاط ممکن تھی وہ اختیار کی گئی۔ اگر اس کے باوجود اکا دکا کوئی واقعہ قابلِ اعتراض پیش آیا تو اس وجہ سے نہیں پیش آیا کہ اس کے پیش آنے کے لیے کوئی رخنہ قصداً کھلا چھوڑ دیا گیا تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ الیکشن کے کھیل میں ان رخنوں کے سدِ باب کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ یہ نہیں گمان کرنا چاہیے کہ ان سے فائدہ کسی ایک ہی فریق نے اٹھایا ہوگا۔ بلکہ فریقین میں سے جس کا داؤ بھی جہاں چل گیا ہوگا وہاں اس نے اس سے فائدہ اٹھا لیا ہوگا۔ حکومت جو احتیاطیں کر سکتی تھی وہ اس نے کی ہیں۔ جن باتوں کا تعلق عوام کے شعور و احساس سے ہے ان میں اگر کوئی خرابی ظاہر ہوئی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی ہمارے عام ووٹروں میں وہ شعورِ شہریت پختہ نہیں ہوا ہے جو جمہوری ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس راہ میں قدم آگے کی طرف بڑھا ہے یا پیچھے کی طرف ہٹا ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ الیکشن کمیشن اور حکومت نے انتہائی کوشش اس بات کے لیے کی ہے کہ لوگوں کے لیے اپنے ووٹ آزادانہ استعمال کرنے کا موقع فراہم کیا جائے اور ووٹر اپنے ووٹ کی اخلاقی و سیاسی قدر و قیمت سمجھیں۔ عام انتخاب کے ساتھ ساتھ اس چیز کا تجربہ بھی ہمارے ملک نے بالکل پہلی ہی بار کیا ہے اور یہ جمہوریت کے حق میں ایک نیک فال ہے۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو اقتدار پر ہو اس کو انتخاب کا معرکہ سر کرنے میں بڑی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اقتدار کے سبب سے جتنی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں، اس سے کئی گنا مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ امریکا اور انگلستان جیسے ملکوں میں، جہاں ہمہ جہت ترقی کی وجہ سے ترقی اور عزت کے حصول کی بے شمار راہیں کھلی ہوئی ہیں، لوگ سرکاری مناصب کو بہت لالچ کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ وہاں کے حوصلہ مند کامیابی و ترقی کے دوسرے میدانوں میں اپنے ارمان پورے کر لیتے ہیں۔ ہمارے پس ماندہ ممالک میں صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں حوصلہ مندوں کے لیے قسمت آزمائی کا ایک ہی میدان — اسمبلیوں، وزارتوں اور صدارتوں کا ہے۔ اس وجہ سے ہمارے ہاں کرسی نہایت محسود چیز بن گئی ہے۔ جو شخص اقتدار حاصل کر لیتا ہے وہ تمام محرومین کا محسود بن جاتا ہے۔ جس کے سبب سے اس کے ہنر بھی لوگوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگتے ہیں، اس کی ہجو اور بدگوئی کو لوگ شعار بنا لیتے ہیں، اس کے عیوب گنانا، اس کی تحقیر کرنا، اس کو خائن، ظالم اور بددیانت ثابت کرنا جرأت، حق گوئی اور جمہوریت پسندی کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ اور اس کی کسی نمایاں سے نمایاں خوبی کا بھی اگر کوئی راستباز آدمی اظہار کر دے تو بہت سے لوگ اس کو تملق، خوشامد اور وظیفہ خواری پر محمول کرتے ہیں۔ ایسے ماحول میں کسی کا اقتدار پر ہوتے ہوئے لوگوں کا ووٹ حاصل کرنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ایسے ماحول میں ان لوگوں کو زیادہ آسانی ہے جو اپوزیشن میں ہوں، جو بے محابا تنقید اور بے تحاشا وعدے کر سکتے ہوں۔ ایسے لوگ بڑی آسانی سے غازی بن جاتے ہیں اگرچہ گز بھر کی زبان کے سوا ان کے اندر کوئی بھی ہنر نہ ہو۔ اسلامی نظام اور حکومتِ الٰہیہ قائم کر دینا بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہوتا ہے اگرچہ بھول کر بھی کبھی ان کو پچھم طرف گرنے کی توفیق نہ ہوئی ہو۔ اس کے برعکس کسی صاحبِ کرسی کے خلاف ہمارے ہاں لوگ بڑی آسانی کے ساتھ بے دلیل سے بے دلیل دعوے اور غلط سے غلط الزام قبول کر سکتے ہیں۔ ایسے ماحول میں صدر ایوب نے اگر منصفانہ الیکشن کرا کے بھاری اکثریت سے فتح حاصل کی تو ہمارے نزدیک یہ ایک تاریخی

بات ہوئی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو اس ملک میں کیسی عظیم مقبولیت حاصل ہے۔ اگر صدر ایوب کی اس کامیابی کو بھی کچھ لوگ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور وہ انتخابات کو نامنصفانہ سمجھتے ہیں تو وہ جا کے کسی قبرستان میں الیکشن کرائیں تاکہ انہیں کسی مزاحمت سے سابقہ پیش نہ آئے، سو فی صد کامیابی انہی کی رہے۔

صدر ایوب نے اب تک انتخابات کے سلسلہ میں جتنے وعدے کیے خدا کے فضل سے وہ وعدے پورے کرنے کی انہوں نے توفیق پائی۔ اپوزیشن نے ہر قدم پر ان کے وعدوں کو مشکوک ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اپنے عمل سے اپوزیشن کے پھیلائے ہوئے سارے شبہات بے بنیاد ثابت کر دیے۔ ہمارے نزدیک کسی لیڈر کی ایک بہت بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ قول و قرار کا پکا ہو۔ ہمیں امید ہے کہ صدر ایوب قول و قرار کی یہی پختگی اپنے ان وعدوں کے مقابلے میں بھی دکھائیں گے جو انہوں نے اس ملک میں اسلامی زندگی کے نشوونما اور خلاف شریعت قوانین کی اصلاح سے متعلق کیے ہیں۔ یہ وعدے صرف اسی پہلو سے اہمیت نہیں رکھتے کہ دستور میں ان کا اقرار کیا گیا ہے یا صدر ایوب نے جگہ جگہ اپنی انتخابی تقریروں میں ان کا حوالہ دیا ہے۔ ہمارے نزدیک تو ان کی اصلی اہمیت اس پہلو سے ہے کہ صدر ایوب ماشاء اللہ خود ایک باحمیت مسلمان ہیں، ایک باحمیت مسلمان، جبکہ وہ بااختیار بھی ہو، کس طرح یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے جانتے بوجھتے اس ملک میں ایسی باتیں آزادی سے ہوتی رہیں جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف ہیں۔ صدر ایوب کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہاں اسلامی زندگی اور اسلامی تہذیب کے پیدا کرنے میں جو دخل ان کو حاصل ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کے بننے بگڑنے میں جتنا دخل بڑوں کا ہوتا ہے کسی کا نہیں ہوتا۔ مشہور ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکھم۔ لوگ اپنے حکمرانوں کے طریقے پر چلتے ہیں۔ صدر ایوب اگر یہاں اسلامی تہذیب و روایات کا احیاء اور اسلامی احکام و قوانین کا اجرا چاہیں گے تو صبح و شام میں یہ چیزیں یہاں فروغ پا جائیں گی اور دیکھتے دیکھتے ہر چیز فیشن بن جائے

گی۔ ہمارے ملک میں زبان سے اسلام اور اسلامی تہذیب و احکام کی تلقین کرنے والے بہت سے لیڈر آچکے ہیں، ان کی باتوں سے کچھ بھی نہیں بنا بنایا اس لیے کہ لوگ کہی ہوئی باتوں پر نہیں چلتے بلکہ کیے ہوئے کاموں کی تقلید کرتے ہیں۔ صدر ایوب چونکہ ایک سپاہی آدمی ہیں، اس وجہ سے ہم ان سے دوسرے لیڈروں کی نسبت بالکل مختلف طرزِ عمل کی امید رکھتے ہیں۔ یعنی یہ امید کرتے ہیں کہ وہ اسلامی زندگی خود اختیار کریں گے تاکہ ان کو دیکھ کر ان کے رفقاء بھی ان کی تقلید کریں اور پھر درجہ بدرجہ یہ برکت تمام عمالِ حکومت او رپھر عام لوگوں میں پھیلے۔ دنیا میں تہذیبیں احکام و قوانین سے نہیں بلکہ بڑوں کے عملی نمونوں ہی سے پھیلا کرتی ہیں۔ پھر قوانین کا اجرا و نفاذ بھی آسان ہو جاتا ہے اس لیے کہ فضا بدل جانے کی وجہ سے لوگ ان قوانین کا نہایت اچھی سپرٹ میں خیر مقدم کرتے ہیں۔

صدر محترم نے منتخب ہونے کے بعد جو پہلی تقریر کی وہ ہمیں نہایت پسند آئی۔ اس تقریر میں اپوزیشن کے لیے انہوں نے جس رواداری بلکہ فیاضی کا اظہار کیا ہمیں ان سے اسی کی توقع تھی۔ اب وہ ساری تلخیاں دلوں سے نکال دینے ہی میں خیر و برکت ہے جو بدقسمتی سے الیکشن کے دوران میں نہایت شدت کے ساتھ پیدا ہو گئیں۔ اس الیکشنی ہنگامہ کے متعلق ہماری ناچیز رائے تو یہ ہے کہ یا تو اس کو اسلامی حدود و قیود کا پابند کیا جائے اور اس کے لیے ضابطۂ اخلاق کتاب و سنت کی روشنی میں معین کیا جائے یا لیڈر حضرات اپنے اور اپنی قوم کے اندر وہ اسپرٹ پیدا کریں جو کھلاڑیوں کے اندر ہوتی ہے اور جس کا مظاہرہ امریکہ اور برطانیہ کے لوگ اپنے ہاں انتخابات کے موقع پر کرتے ہیں۔ اس کے بغیر اگر یہ کھیل یونہی جاری رہے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ شیطانی کھیل بن جائیں گے اور یہ جمہوریت ہمیں بڑی مہنگی پڑ جائے گی۔ ہمارے شہروں اور دیہاتوں میں مختلف قسم کی گروہی، خاندانی، قبائلی، طبقاتی اور مذہبی رقابتیں پہلے سے موجود تھیں اور یہ سخت اصلاح کی محتاج تھیں لیکن ان کی اصلاح تو درکنار، اس ہنگامہ انتخابات نے ان میں بڑا اضافہ کر دیا ہے۔ گاؤں گاؤں میں ایک نہایت افسوسناک قسم کی کشمکش پیدا ہو چکی ہے جس سے

بہت سے مقامات میں نہایت ناگوار صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ کتنی عزیز جانیں انتخابی ادارہ کے انتخابات کے موقع پر ضائع ہوئیں اور اب صدر کے انتخاب کے بعد کراچی میں جو کچھ ہوا ہے اس پر جتنا بھی غم کیا جائے کم ہے۔ ذمہ داری کسی کی بھی ہو، لیکن ہمارے نزدیک تو اصل ذمہ داری حکومت کی ہے۔ پولنگ کے روز امن قائم رکھنے کے لیے جو مضبوط انتظام ہوا تھا اس سے بڑا اطمینان ہوا تھا کہ جذبات کے انتہائی ہیجان کے باوجود ملک کے کسی حصے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی لیکن کراچی کے واقعہ سے وہ سارا اطمینان تشویش سے بدل گیا۔ ابھی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات باقی ہیں جن میں انتقامی جذبات کے ابھرنے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ان میں مقامی رقابتیں زیادہ شدت کے ساتھ ابھریں گی۔ اس وجہ سے ان کے سدِ باب کے انتظامات سے حکومت کو غافل نہیں رہنا چاہیے۔

اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ انتخابی سرگرمیوں کو اسلامی حدود و قیود کا پابند کیا جائے تو یہ بات یوں ہی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سارا ہنگامہ شیطانی ہے۔ اسلام اس کے دس فی صد کا بھی روادار نہیں ہے۔ ہم تو اس کے متعلق مرزا غالب کا یہ شعر اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔

تھا عشق کا موجد بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

ہم ملک و قوم کی قسمت کے ذمہ داروں سے، لیڈروں سے، علماء سے اور اخباروں سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس مسئلے پر نہایت سنجیدگی سے غور کریں۔ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں کچھ حدود و قیود متعین کی ہیں۔ اس شعبے سے متعلق جو حدود و قیود ہیں اسلام کے دوسرے اصولوں کی طرح وہ بھی نہایت زرّیں ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ہر چیز میں مغرب کی نقالی کے عادی ہیں بلکہ مغرب کی چیزیں ہم اپنے سوءِ استعمال سے کچھ اور بگاڑ لیتے ہیں جس کے سبب سے ان کے شر میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر ان کے اندر

خیر کا کوئی پہلو ہوتا بھی ہے تو ہم اس سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

اس الیکشن کے دوران میں صدر ایوب کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے کہ ملک کے کن کن طبقات میں ان کے خلاف آزردگی پائی جاتی ہے۔ ان آزردہ طبقات نے جو روش اختیار کی اگرچہ ہمیں اس سے بالکل اتفاق نہیں، انہوں نے ایک نہایت نازک موقع پر ایک ایسے فتنے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی جس سے ملک کی بچی کھچی اسلامی روایات اور ملک کی سالمیت ہر چیز خطرے میں پڑ گئی تھی لیکن اس کے باوجود ہم یہی گزارش کریں گے کہ صدر ایوب ان تمام طبقات کی آزردگی کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کریں اور ان کی شکایات میں سے جو شکایات بھی جائز ہوں ان کو دور کر دیں۔ علماء ہوں یا وکلاء، طلبہ ہوں یا اساتذہ، ہر ایک کے باب میں ہماری یہی گزارش ہے۔ اور اس گزارش کی بنیاد ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ آئندہ کے انتخابات کے لیے ان کو ہموار کرنا ضروری ہے۔ اس پہلو سے اب ہمارے نزدیک ان کی کچھ زیادہ اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ ہماری گزارش کی بنیاد صرف یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے صدر ایوب کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ وہ ملک کے ہر طبقہ بلکہ ہر فرد کی جائز شکایت دور کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی شکایات اس وجہ سے ناقابلِ اعتناء نہیں قرار دی جا سکتیں کہ وہ اپنے منشاء کے مطابق تبدیلی لانے میں ناکام رہے۔ اگر ان کی کوئی بات بھی حق ہے تو وہ ہر حال میں حق ہے، وہ اس وجہ سے ناحق نہیں ہو جائے گی کہ انتخاب کے معاملے میں ان کی روش غلط رہی۔

پاکستان مسلم لیگ کے ذمہ داروں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ آپ کی پارٹی کو اللہ تعالیٰ نے جو شاندار فتح عطا فرمائی اس فتح کو اس ملک کے استحکام اور اس کے اندر اسلامی احکام اور اسلامی روایات کے فروغ کے لیے استعمال کیجیے۔ آپ کی ہر چیز کی طرح یہ اقتدار بھی اللہ کی امانت ہے۔ قرآن میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ اقتدار کی امانت اللہ تعالیٰ جس کو سونپتا ہے تو اس لیے سونپتا ہے کہ دیکھے کہ اقتدار پا کر کون اللہ کی راہ پر چلتا ہے اور کون شیطان کی راہ پر! یہ چیز آپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ آپ خود خدا کی شریعت کی

پابندی کریں اور اسی شریعت کو اس ملک میں نافذ کریں جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اقتدار بخشا ہے۔ پاکستانی قوم کا شروع سے من حیث القوم، اللہ سے یہ عہد ہے کہ ہم اس خطۂ زمین میں شریعت کا قانون جاری کریں گے۔ اس وعدے کے امین اور مسئول عنداللہ اور عندالخلق آپ ہیں۔ اس وعدے پر ۱۷ سال کی مدت گزر چکی لیکن ہنوز روزِ اول ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ آپ حضرات کی بے پروائی یا غلط روی کی وجہ سے اس ملک میں جو گمراہی بھی پھیلے گی وہ سب آپ کے اعمال نامے میں لکھی جائے گی۔ حکومت کے حقوق جتنے زیادہ ہیں اس سے زیادہ اس کی ذمہ داریاں ہیں — دنیوی بھی، اخروی بھی۔ یہ آپ حضرات کی ذمہ داری ہے کہ اپنے آپ کو بھی ٹھیک رکھیں، اپنی قوم کو بھی ٹھیک رکھیں اور اپنے صدر اور اپنی حکومت کو بھی ہر لغزش سے بچانے کی کوشش کریں۔ آپ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کیجیے کہ آپ کا کام صرف صاحبِ اقتدار کی رضا جوئی نہیں ہے بلکہ کائنات کے مقتدرِ حقیقی کی رضا جوئی ہے اور مقتدرِ حقیقی کی رضا جوئی کے لیے یہ پہلی شرط ہے کہ آدمی ہر ایک کو وہی مشورہ دے جو حق ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اس کو اچھا لگتا ہے یا برا۔ مسلم لیگ کے ہر فرد کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اس ملک میں دو چیزوں کا ذمہ دار ہے — ایک اسلامیت، دوسری سالمیت۔ اگر مسلم لیگ نے ان دونوں چیزوں کو مضبوطی سے پکڑا تو اس ملک کے بچے بچے کی دعائیں اور خدا کی نصرت اس کے ساتھ ہیں۔ ہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ فتح کا احساس آپ حضرات کے اندر مخالف کے لیے انتقام کا جذبہ نہ ابھارے بلکہ ہمدردی اور خیر سگالی کا جذبہ ابھارے۔ اسی سے آپ اس ملک میں ایک مضبوط قوم ابھار سکیں گے۔

چند معروضات ہم اپوزیشن کے بزرگوں کی خدمت میں بھی پیش کرنا چاہتے ہیں:

اپوزیشن اگرچہ جمہوریت، خاص طور پر پارلیمانی جمہوریت، کے ناگزیر لوازم میں سے سمجھی جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں اپوزیشن نے جس طرح کا مظاہرہ کیا ہے اس سے تو ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ یہ چیز عقل، فطرت اور اسلام سب کے خلاف

ہے۔ اپوزیشن کا کام اگر اقتدار کی ہر بات کی مخالفت کرنا ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد اور رائی کا پربت اور سوئی کا پھاوڑا بنانا ہے تو پھر کون ذی ہوش آدمی اس کے جواز کو تسلیم کر سکتا ہے۔ اگر اس کے سوا اس کا کوئی اور مقصد ہے، جس میں خیر کا بھی کوئی پہلو ہے، تو ہم اپوزیشن کے سربراہوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ اس کو جلد سے جلد سامنے لائیں اس لیے کہ خود انہوں نے اس کی جو مثال پیش کی ہے اس کو دیکھ کر تو اس ملک کا خدا ترس اور محتاط طبقہ اپوزیشن کے وجود سے سخت اندیشوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ہم تو اس اپوزیشن کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کا کام صرف اقتدار حاصل کرنا ہے اگرچہ اس کے لیے اسے ملک کے دشمنوں سے بھی ساز باز کرنا پڑ جائے اور اگرچہ اس اقتدار کو حاصل کر کے ایک صبح و شام کے لیے بھی وہ اس کو نہ سنبھال سکے۔ ہم اس امر سے انکار نہیں کرتے کہ اپوزیشن نے جس طرح کا گٹھ جوڑ کیا ہے اس کی مثال ہمیں جمہوری پارٹیوں کی تاریخ میں اگر ملتی ہے تو بس اپنے ہی ملک میں ملتی ہے۔ اس کے سوا کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اقتدار حاصل کرنے کے لیے بھی اپنے سامنے کچھ اصول رکھتے ہیں جن کی پیروی ضروری سمجھتے ہیں اور ان کے درمیان اتحاد و اختلاف کی بنیاد انہی اصولوں پر استوار ہوتی ہے۔ برعکس اس کے ہمارے ہاں اقتدار کے حصول کے معاملے میں عزیز صرف مقصد ہوتا ہے، اصول کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اگر اس راہ میں فرشتے حائل ہوں تو ان سے بھی جنگ کی جا سکتی ہے اور اگر شیطان بھی ساتھی بن جائے تو اس سے بھی دوستی گانٹھی جا سکتی ہے!

ہم ایک مسلمان کی حیثیت سے جب اس مسئلے پر غور کرتے ہیں تو یہ کہنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں کہ اسلام میں اپوزیشن کے اس خلاف عقل تصور کا کوئی وجود نہیں ہے۔ کسی کافرانہ حکومت کی بات تو الگ ہے لیکن اگر حکومت اسلامی یا کم از کم مسلمانوں کی اپنی قومی حکومت ہے تو اس کے اندر ایک ایسی پارٹی قائم کرنا جس کا مقصد محض اختلاف برائے اختلاف ہو، ایک ایسی اجنبی بات ہے جس کو ایک مسلمان کا ذہن آسانی سے قبول نہیں کر

سکتا۔ ہم نے اسلام کے اجتماعی مسائل کا جس حد تک مطالعہ کیا ہے اس سے ہم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان پر اپنی حکومت کی خیر خواہی لازم ہے۔ احادیث میں اس کے لیے نصیحت کا لفظ آیا ہے جس کے معنی خیر خواہی کے ہیں۔ اس خیر خواہی کے قرآن و حدیث میں بہت سے تقاضے بھی بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان تمام کاموں میں، جو ترقی و بہبود کے ہوں، اس کے ساتھ تعاون کیا جائے، اس کو مشورے دینے میں اخلاص و خیر خواہی کو مدِ نظر رکھا جائے، مشکلات و خطرات میں اس کی پوری پوری مدد کی جائے، اس کے عمدہ کاموں پر اس کی تحسین کی جائے، اگر وہ کوئی غلطی کرے تو اس پر اس کو ٹوکا جائے۔ اگر حکمران نااہل یا بے دین ہو اور اس بات کا امکان ہو کہ پرامن طریقے سے اس کو اس سے زیادہ اہل اور دین دار حکمران سے تبدیل کیا جا سکتا ہے تو اس کو بدل دیا جائے۔ اسلام میں اپوزیشن کا بس یہ تصور ہمیں ملتا ہے لیکن اس بات کا جواز ہمیں کہیں نہیں ملتا کہ کچھ لوگ حکومت کی مخالفت کو اپنا پیشہ بنا لیں، اس کی اچھی باتوں کو بھی عیب کے رنگ میں پیش کریں، عوام میں جھوٹ، مبالغہ آرائی اور افسانہ طرازی سے اس کو بدنام اور ذلیل کرنے کی کوشش کریں۔ اقتدار کی طلب کے سوا کوئی اصول بھی ان کے درمیان مشترک نہ ہو، خود تجربے کی کسوٹی پر کھوٹے ثابت ہو چکے ہوں، دین یا دنیا کے کسی پہلو سے بھی قابل ترجیح نہ ہوں لیکن دعوے کریں کہ اگر اقتدار ان کے سپرد کر دیا جائے تو وہ ملک کو بہشت بریں بنا دیں گے۔ پھر مزید ستم یہ کہ دین، ملک، قوم اور حکومت کے جتنے مخالف ان کو مل سکیں سب کو جمہوریت کے نام پر جمع کر کے ملک پر یلغار کر دیں اور ایک ایسی محترمہ کو حکومت پر مسلط کر دینے کی کوشش کریں جن کے ہاتھوں دین اور دنیا دونوں کا بیڑا غرق ہو جائے۔ جمہوریت ہو یا اسلام ہم نہیں سمجھتے کہ ان میں سے کسی میں بھی اس نوع کی کسی اپوزیشن کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

ہم بجائے خود اپوزیشن کے مخالف نہیں ہیں۔ موجودہ زمانے میں جس طرح مروجہ جمہوریت ایک ناگزیر برائی کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے مفر نہیں ہے، اسی طرح اس

جمہوریت کے 'بچہ شتر' اپوزیشن سے بھی مفر نہیں ہے۔ لیکن ہم اپوزیشن کے علمبرداروں سے درخواست کرتے ہیں کہ یا تو وہ اپوزیشن کو خالص اسلامی اصولوں پر مرتب کریں جس کا مقصد برّ وتقویٰ میں تعاون اور اثم وعدوان کی مزاحمت ہو، اس پارٹی میں انہی لوگوں کو لیں جو اسلام کے اصولوں پر عقیدہ رکھتے ہوں اور جو اپنے اختلاف و اتفاق کو اسلام کے ضابطہ اخلاق کا پابند بنا سکتے ہوں۔ اور اگر اس کی ہمت یہ حضرات اپنے اندر نہیں پا رہے ہیں تو پھر دین جمہوریت کے لحاظ سے بھی ادنیٰ درجہ ایمان یہ ہے کہ امریکا اور انگلستان کی اپوزیشن پارٹیوں کے اسوہ کی پیروی کریں۔ اس سے نیچے جمہوریت میں بھی کوئی درجہ ایمان نہیں ہے۔ ہم نے اس اپوزیشن کو مینڈکوں کی پنسیری سے جو تشبیہ دی تھی تو یہ بات یوں ہی نہیں تھی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس تشبیہ کی حقیقت ہر شخص کے سامنے واضح ہو جائے گی۔ چودھری محمد علی صاحب ایک مینڈک کو پلڑے میں رکھیں گے تو دوسری پھدک جائے گی، دوسری کو رکھیں گے تو تیسری پھدک جائے گی۔ اب اس پنسیری کو باندھے رکھنا ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی فطرت میں انتشار تھا۔ اور اب اس فطرت کا بروز شروع ہو گیا ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مس فاطمہ جناح ہار گئیں۔ تصور کیجیے کہ خدانخواستہ وہ جیت جاتیں اور اس کے بعد یہ انتشار ہوتا (اور ضرور ہوتا) تو اس وقت ملک کا کیا بنتا؟

جماعت اسلامی کے حضرات ہم سے بہت برہم ہیں اور برہمی میں ایک اعصابی جنگ ان حضرات نے ہمارے خلاف پورے زور و شور کے ساتھ شروع کر دی ہے۔ ہر ڈاک سے ہمیں ان کے بکثرت خطوط موصول ہو رہے ہیں جن میں سے اکثر تو گمنام ہوتے ہیں، لیکن بعض بانام بھی ہوتے ہیں۔ مضمون سب کا ایک، انداز بیان و استدلال ایک، گالیوں اور طعنوں کی تراش خراش ایک۔ ہر چیز ایک ہی کارخانے بلکہ ایک ہی سانچے کی ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ صدر ایوب کا تو یہ حضرات کچھ بگاڑ نہ سکے اب اس محاذ سے جو فوج ظفر موج فارغ ہوئی ہے تو ہم پر پل پڑی ہے۔ آخر میگزین میں جو گولہ و بارود بچا کھچا موجود ہے وہ ضائع کیوں جائے۔ دشمن کا قلعہ نہ مسمار ہو سکا تو نہ سہی ایڈیٹر 'میثاق' کا

جھونپڑا ہی سہی۔ مقصود تو جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

دامن اس کا تو بہت دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

اکتوبر کا 'میثاق' جب نکلا تو بعض شہروں سے مجھے میثاق کے قدردانوں کی طرف سے یہ شکایات موصول ہوئیں کہ ہم میثاق مقامی ایجنٹ سے خریدتے رہے ہیں لیکن اس مرتبہ ایجنٹ سے معلوم ہوا کہ سارے پرچے پارسل موصول ہوتے ہی ایک ہی صاحب خرید کر لے کر چلے گئے۔ ہم نے اس واقعہ کو میثاق کی قدردانی پر محمول کیا اور خاموش رہے۔ نومبر میں یہی شکایت متعدد شہروں سے پھر موصول ہوئی اور ساتھ ہی اس حقیقت کا انکشاف بھی ہوا کہ یہ نیک کام 'صالحین' کر رہے ہیں۔ اور مقصود اس سے یہ ہے کہ میثاق اپنے قدردانوں تک نہ پہنچ سکے اور اس میں جو مضامین صدارت کے مسئلہ پر نکل رہے ہیں وہ پردۂ اخفا میں رہ جائیں۔ ان حضرات کی خواہش تو یہی تھی اور شاید وہ اس خواہش میں حق بجانب بھی ہوں لیکن افسوس ہے کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ جن مضامین کو چھپانے کے لیے ان حضرات نے یہ سعادتِ دارین کمائی وہ لاکھوں کی تعداد میں چھپے اور ملک کے دونوں بازوؤں میں ہر پڑھے لکھے تک پہنچے۔ تمام بڑے اخبارات نے ان کی پورے اہتمام سے اشاعت کی۔ لوگوں نے ان کے ایک ایک پیرے کو پوسٹروں اور اشتہاروں کی صورت میں گلی گلی میں پھیلایا۔ مقرروں نے ان کے جلسوں کو اپنی تقریروں میں دہرایا۔ لاکھوں کی تعداد میں یہ پمفلٹ کی شکل میں ہوائی جہازوں سے مختلف شہروں میں پھینکے گئے۔ بنگالی میں بھی ان کا ترجمہ ہوا اور وہ اردو نہ جاننے والوں تک پہنچائے گئے۔ اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک ہر طبقہ، ہر درجہ، اور ہر مکتبِ فکر کے لوگوں سے جو داد مجھے ان مضامین پر ملی ہے اس سے پہلے کسی چیز پر بھی نہیں ملی۔ حد یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے حلقوں سے بھی مجھے ان پر اتنی داد ملی ہے کہ عجب نہیں کہ وہ مقدار میں ان کی گالیوں کے برابر نکلے۔ میں دونوں کا حساب کر رہا ہوں اگر دعائیں گالیوں سے کم ہوئیں

تو مزید دعاؤں کا مطالبہ کروں گا اور اگر حساب برابر سرابر ہو گیا تو دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کے صلے میں ان کی گالیوں کو معاف کر دے۔

گالیاں دینے والے حضرات میں سے بعض نے مجھے 'بزدل' لکھا ہے۔ درآنحالیکہ خود ان کی اپنی بہادری کا یہ عالم ہے کہ خط پر اپنے نام لکھنے کی جرأت نہیں فرمائی ہے۔ حالانکہ انہیں خوب علم ہے کہ اگر وہ اپنے نام ثبت فرما دیتے جب بھی ان کو کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں ان کو کوئی نقصان پہنچانے کے پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں ایسے لوگوں کو مجرم سمجھتا بھی نہیں جو گمنام خطوط میں گالیاں لکھتے ہیں۔ میں تو ان کو فتور عقل کا مریض سمجھتا ہوں اور ان پر ترس کھاتا ہوں۔

بعض حضرات نے مجھ کو تملق اور خوشامد کا طعنہ دیا ہے کہ میں صدر ایوب کی خوشامد کر کے اس کے صلے میں کسی عہدے یا انعام کا آرزو مند ہوں اور بشارت دی ہے کہ ان مضامین کے بعد اب کوئی نہ کوئی انعام ضرور مل کے رہے گا۔ بلکہ بعض 'اہلِ خبر' نے تو یہ بھی لکھ دیا ہے کہ 'اب روپوں کی تھیلیاں پہنچ رہی ہوں گی۔' ان دوستوں کو کون بتائے کہ نہ ہم اتنے خوش قسمت ہیں اور نہ صدر ایوب شاہ سعود کی طرح ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے ہیں کہ ہمارے دو مضمونوں پر ریجھ کر تحفے اور عہدے بخشنے شروع کر دیں۔ پھر ان دوستوں کو شاید پتا نہیں ہے کہ اپنی اصلی محرومی یہ نہیں ہے کہ دنیا ملی نہیں ہے بلکہ اصلی محرومی یہ ہے کہ اس کو سنبھالنے اور برتنے کا سلیقہ اپنے اندر نہیں ہے۔ رب کریم نے اپنے خزانہ جود سے جو کچھ دے رکھا ہے وہی بہت ہے۔ جب اسی کے سنبھالنے اور برتنے کا سلیقہ نہیں ہے تو مزید کی آرزو کیوں کریں؟

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ طالب ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

افسوس ہے کہ یہ طعنہ دینے والے حضرات یہ نہیں سوچتے کہ جب وہ دوسرے کی

نسبت یہ گمان رکھنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ اس نے صدر ایوب کی حمایت کسی لالچ ہی سے کی ہے تو آخر وہ لوگ حق بجانب کیوں نہ سمجھے جائیں جو اعلانیہ ان حضرات کو بیرونی طاقتوں کا ایجنٹ سمجھتے ہیں۔

اس دوران میں جو لوگ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے ہیں ان میں سے دو بزرگوں نے اس بات کی وضاحت ضروری سمجھی ہے کہ وہ میرے مضامین سے متأثر ہو کر نہیں علیحدہ ہوئے ہیں، بلکہ خود اپنی اندرونی تحریک سے علیحدہ ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں ان حضرات کو یہ غلط فہمی کیوں ہوئی کہ میں ان کے اس نیک اقدام کا کریڈٹ خود لینا چاہتا ہوں۔ ان دونوں حضرات میں سے ایک صاحب سے میری واقفیت سرسری ہے، میں ان کی صلاحیتوں اور ان کے احساسات سے زیادہ باخبر نہیں ہوں۔ دوسرے صاحب سے البتہ دیرینہ روابط اخلاص و محبت رکھتا ہوں اور ان کے احساسات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ اللہ کے فضل سے خود صاحبِ علم و نظر ہیں، میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی معاملے میں مجھ جیسے کسی ہیچ میرز کی رہنمائی کے محتاج ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے جو قدم بھی اٹھایا ہے یقیناً اپنے ہی علم اور اپنے ہی ضمیر کی رہنمائی میں اٹھایا ہوگا۔ ویسے وہ میرے ان مضامین کے چوٹی کے قدردانوں میں رہے ہیں جو میں نے جماعت اسلامی کے نظریہ حکمت عملی کی تردید میں لکھے ہیں۔ میں ان کو اور اس دوران میں جماعت سے علیحدہ ہونے والوں کو یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ میں نے جو مبارک باد دی تھی وہ ان حضرات کو سامنے رکھ کر نہیں دی تھی بلکہ جماعت کے بہت سے دوسرے وابستگان تھے جن کے تأثرات اور عزائم خطوط یا پیغامات کی صورت میں میرے پاس یا میرے علم میں ہیں۔ یہ ساری چیزیں اپنے وقت پر لوگوں کے سامنے آ جائیں گی۔ یہ بات بھی ظاہر کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جماعت سے جو لوگ علیحدہ ہو رہے ہیں ان کی علیحدگی میرے لیے کچھ اس وجہ سے باعثِ مسرت نہیں ہے کہ میں اس ملبے سے کوئی عمارت بنانا چاہتا ہوں بلکہ صرف اس پہلو سے ہے کہ یہ حضرات ایک عظیم فتنہ سے علیحدہ ہو گئے۔ اب جماعت اسلامی کے معاملات سے مجھے کچھ

زیادہ تعلقِ خاطر نہیں رہ گیا ہے۔ اس جماعت نے متحدہ محاذ کا جو پھندا اپنی گردن میں ڈالا تھا، ۲ جنوری ۱۹۶۵ء کی شام کو اس نے اس پھندے سے خود اپنے ہاتھوں خودکشی کر لی۔

اب جو حضرات مجھے گالیاں دے رہے ہیں، بہتر ہے کہ وہ خود اپنے سر پیٹیں اور اپنی بدبختی پر ماتم کریں۔ میری جان اب خدا کے واسطے چھوڑیں!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ جنوری ۱۹۶۵ء)

مقالہ ۱۵

قومی انتخابات کے بعد!

ملک کی قومی اسمبلی کا انتخاب بھی ختم ہو گیا اور صدارت کے انتخاب کی طرح اس انتخاب میں بھی متحدہ محاذ کو ناکامی ہوئی۔ متحدہ محاذ کے تمام نمایاں اشخاص جو کھڑے ہوئے تھے ہار گئے۔ جو لوگ کامیاب ہوئے ہیں اوّل تو ان میں کوئی ایسا شخص نہیں جو ان بقیۃ السیف اشخاص کو مجتمع کر کے ان کے وجود کو کچھ مؤثر بنا سکے۔ ثانیاً ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ اسمبلی کے موجودہ قواعد کے تحت اتنی مختصر تعداد کوئی مؤثر رول ادا کرنے تو درکنار کسی تحریکِ التوا کے پیش کرنے کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔

سب سے زیادہ خاص بات یہ ہے کہ جو لوگ مذہب کے نام پر اٹھے تھے ان میں سے کسی صاحب کو بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ بعض جماعتوں کو اپنی تنظیم پر بڑا ناز تھا لیکن ان کا حال بھی یہ ہے کہ ملک کے دونوں بازوؤں میں سے کسی میں بھی ان کا کوئی امیدوار سرخرو نہ ہو سکا۔ مغربی پاکستان میں تو خیر ان کا کوئی نمائندہ کھڑا ہی نہیں ہوا۔ جس واحد نشست کے لیے انہوں نے درخواست کی تھی وہ متحدہ محاذ ہی نے نامنظور کر دی تھی۔ البتہ مشرقی پاکستان میں ان کے کچھ امیدوار کھڑے ہوئے تھے لیکن ان کو بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں نے قبول نہیں کیا۔ ان حضرات کو نہ صرف اپنی تنظیم کی فعالیت پر بڑا ناز تھا بلکہ اپنے سیاسی اندازوں پر بھی بڑا اعتماد تھا۔ دعویٰ تھا کہ تین انتخابات میں ان کی جماعت

ملک کے اقتدار پر قابض ہو جائے گی۔ یہ انتخاب غالباً ان تین کا تیسرا تھا۔ پوری چوتھائی صدی کی جدوجہد کے بعد اس کا جو تجربہ سامنے آیا ہے وہ روز روشن کی طرح سب نے دیکھ لیا۔ معلوم ہوتا ہے اس تنظیم کی ساری فعالیت رسائل بیچنے اور شریف آدمیوں کو گالیوں کے خطوط لکھنے ہی تک محدود ہے۔ اس سے آگے صرف لاف زنیاں اور لن ترانیاں ہی ہیں۔ ملک کے جمہور پر ان کا اتنی مدت کے اندر جو اثر قائم ہو سکا ہے اس کا راز بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات نے کھول دیا، شاید بنیادی جمہوریتوں کے ۸۰ ہزار ممبروں میں ان کے ۸۰ ممبر بھی نہ آسکے ہوں۔ حد یہ ہے کہ جہاں ۱۸ سال سے ان کا مرکز خلافت قائم ہے اس کے دس دس گز کے فاصلے پر ان کے جو 'صالحین' کھڑے ہوئے تھے بلا استثناء وہ سب کے سب رہ گئے بلکہ عجب نہیں کہ اپنی ضمانتیں بھی ضبط کرا بیٹھے ہوں۔ متحدہ محاذ کے اندر ان کو جو اثر و رسوخ حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس نے ان کو ایک سیٹ کا بھی اہل نہیں سمجھا حالانکہ اسی متحدہ محاذ کے پیچھے انہوں نے دنیا بھی برباد کی اور دین بھی اور ایسے ایسے لوگوں کی حمایت میں اپنی قوتیں اور صلاحیتیں برباد کیں جن کی تائید و حمایت الحاد، اباحیت اور شراب کے لائسنس بانٹنے سے کم جرم نہیں ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس شرعی دلیل کے ساتھ ہوا ہے کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور از روئے قرآن اس پر مسلمانوں سے وصول کی ہوئی صدقات و زکوٰۃ کی رقوم خرچ کرنا جائز ہے۔

ہم کو اس متحدہ محاذ اور اس کے ان دیندار حلیفوں کی اس عبرت انگیز شکست پر ذرا بھی ان کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے۔ ایسے بے اصول لوگوں سے آخر کس خیر کی امید تھی کہ ان کی شکست پر افسوس ہو۔ ہمارا یہ خیال بھی نہیں ہے کہ یہ شکست حکومت اور پولیس کے جبر اور دباؤ کا نتیجہ ہے۔ غالباً متحدہ محاذ نے بھی یہ محسوس کر لیا ہے کہ اس الزام کے پردے میں شکست کے حقیقی اسباب کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ اس وجہ سے اس مرتبہ اس الزام کے پھیلانے میں اس نے زیادہ سرگرمی بھی نہیں دکھائی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مقامات میں دباؤ کے واقعات بھی پیش آئے ہوں گے لیکن انتخابات کا جو نتیجہ سامنے آیا ہے اس

میں دباؤ کا حصہ آخر کتنا ہو سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک اس شکست کی اصلی وجہ وہ خرابی ہوئی ہے جو خود متحدہ محاذ کی تعمیر ہی میں مضمر تھی۔ بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں نے انتخاب صدارت کے موقع ہی پر اس خرابی کو بھانپ لیا تھا اور مس فاطمہ جناح کی شکست کے بعد تو یہ خرابی اتنی نمایاں ہو کر سامنے آگئی تھی کہ صرف اندھے ہی اس کو دیکھنے سے قاصر رہ سکتے تھے۔ پھر بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کے متعلق یہ بدگمانی کیوں کی جائے کہ وہ اس کو خود نہیں دیکھ سکتے تھے کہ اس کو دکھانے کے لیے حکومت کو جبر اور دباؤ استعمال کرنا پڑتا۔ آخر ہم اپنی قوم کے ۸۰ ہزار ممبروں کو اتنا برگشتہ قسمت کس طرح خیال کر لیں کہ وہ یہ اندازہ بھی نہ کر سکتے کہ جو لوگ اپنی تنظیم کی وحدت کو تین دن بھی برقرار نہ رکھ سکے وہ ملک کی وحدت کو کس طرح برقرار رکھ سکیں گے؟

صدر ایوب قوم سے جس اعتماد کے طالب تھے قوم نے ان کو وہ دے دیا۔ ان کا یہ مطالبہ بھی قوم نے پورا کر دیا کہ ان کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں تاکہ وہ آزادی اور اطمینان کے ساتھ اپنے منصوبے پورے کر سکیں۔ ان کو جو اسمبلی ملی ہے وہ ایسی ہم آہنگ و ہم رنگ ہے کہ اگر وہ کبھی ذائقہ بدلنے کے لیے کوئی مخالف آواز سننے کے آرزومند بھی ہوئے تو اس کا سامان انہیں شاید خود ہی کرنا پڑے۔ اس قسم کا اعتماد جہاں بہت بڑی خوش قسمتی ہے وہیں ایک عظیم قومی امانت بھی ہے۔ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ ہم اس خوش قسمتی پر صدر محترم کو مبارکباد دیں یا اس عظیم ذمہ داری کی آزمائشوں پر ان کے ساتھ ہمدردی کریں۔ بحیثیت ایک مسلمان کے ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ یہ امانت صرف قوم ہی کی طرف سے نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے بھی ہے اور اب خدا اور خلق دونوں ہی یہ دیکھیں گے کہ صدر ایوب اس امانت کا حق کس طرح ادا کرتے ہیں۔ کسی مؤثر حزب اختلاف کے نہ ہونے کی وجہ سے صدر محترم کو اپنا احتساب بھی خود ہی کرنا ہے اور اصل احتساب ہے بھی وہی جو آدمی خود اپنا کرے اور ساتھ ہی اس حقیقت کو ہر آن اپنے سامنے مستحضر رکھے کہ سب سے بڑا احتساب کرنے والا خدا ہے جس کے حضور سب کی پیشی ہونی ہے، جس کی

نظر سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں اور جس کی پکڑ سے کوئی بھی بچنے والا نہیں! زمین پر اس حکمران سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں ہو گا جو اس حقیقت کو یاد رکھے اور آسمان پر خدا کے حضور اس حکمران سے بڑھ کر بدقسمت کوئی نہیں ہو گا جو اس حقیقت کو فراموش کر دے۔

ہمیں اس بات سے بڑی خوشی ہے کہ صدر ایوب نے اپنے منشور میں جن اقتصادی و سماجی اصلاحات کا وعدہ کیا تھا ان کے متعلق انہوں نے اپنے وزراء اور حکام کو ہدایت کر دی ہے کہ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پروگرام بنائیں۔ خدا کرے جلد سے جلد یہ پروگرام بنیں اور ان پر عمل ہو! صدر ایوب کی اصلی کامیابی یہ نہیں ہے جو انہیں صدارت اور نیشنل اسمبلی کے انتخابات میں ہوئی ہے۔ یہ کامیابی تو درحقیقت ملک و قوم کی ہے کہ ملک ایک شدید قسم کے انتشار میں مبتلا ہونے سے بچ گیا۔ صدر ایوب کی کامیابی تو جب ہے کہ وہ ان وعدوں کو پورا کریں جو انہوں نے قوم سے کیے ہیں اور ان توقعات پر پورے اتریں جو قوم نے ان سے باندھی ہیں۔ اب تک اس پہلو سے قوم کا ہر لیڈر ناکام رہا ہے۔ سب نے ایک سے ایک بڑھ کر وعدے کیے لیکن عمل میں سب کھوٹے نکلے۔ صدر ایوب سے ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس ملک کے لیڈروں کی اس معروف سنت کے خلاف ایک نئی مثال قائم کریں گے اور اپنے تمام چھوٹے بڑے وعدے ضرور پورے کریں گے۔

یہ عرض کر دینا بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نیاز مندوں کو تو نہ صدارتی نظام سے کوئی خاص لگاؤ ہے نہ پارلیمانی نظام سے کوئی شغف ہے۔ ہماری طلب و آرزو تو بس اچھی حکومت کے لیے ہے۔ اچھی حکومت کیا ہوتی ہے اس سوال کا واحد جواب یہ ہے کہ وہ حکومت جو خدا کی شریعت کو نافذ کرنے والی ہو۔ اس حکومت کی عملی مثال حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی حکومت تھی۔ جس کی اساس کو واضح کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ میں کوئی نئی بدعت ایجاد کرنے والا نہیں ہوں بلکہ جو کچھ اللہ و رسولؐ نے فرمایا ہے اسی کو نافذ کرنے والا ہوں اور ساتھ ہی قوم سے یہ درخواست کی تھی کہ اگر میں اس راہ سے بال برابر بھی ہٹوں تو مجھے سیدھا کر دینا۔ حضرت عمرؓ نے اس

حکومت کے عدل اور اس کی قانونی مساوات کو واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میری حکومت میں ایک زورآور سے زیادہ بے اثر کوئی نہیں جب تک میں اس سے دوسرے کا چھینا ہوا حق واپس نہ لے لوں اور ایک کمزور سے زیادہ زورآور اور بااثر کوئی نہیں ہے جب تک میں اس کا چھینا ہوا حق واپس نہ دلا دوں۔ اس حکومت میں حکمرانوں کے احساس ذمہ داری کا یہ حال تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا (اور یہ فرمانا استعارے کی زبان میں نہیں بلکہ حقیقت کی زبان میں تھا) کہ تم جانتے ہو کہ جس دن سے میں خلیفہ بنایا گیا ہوں اس دن سے ٹانگیں پھیلا کے نہیں سویا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ان ہمدردوں کو مخاطب کر کے، جو انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیتے تھے، فرمایا کہ آرام کس وقت کروں؟ اگر دن کو آرام کروں تو رعیت تباہ ہو جائے اور اگر رات کو آرام کروں تو میں تباہ ہو جاؤں! حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ حال تھا کہ رات کو روتے روتے ان کی ڈاڑھی تر ہو جاتی۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی نے اس بے قراری کا سبب دریافت کیا تو بولے کہ کیوں نہ روؤں؟ بعید سے بعید علاقے میں بھی اگر رعایا کا کوئی فرد مظلوم و ستم رسیدہ اور بھوکا ننگا ہو گا تو کل کو اس کی پرسش مجھ سے ہونی ہے!

ہم صدر ایوب کے جس وعدے کے ایفاء کے منتظر ہیں وہ یہی اسلامی حکومت ہے۔ یہ انتظار صرف ہمیں کو نہیں بلکہ ان تھوڑے سے لوگوں کے سوا جن کے اندر سرے سے ایمان ہی باقی نہ رہ گیا ہو، اس ملک کے ہر باشندے کو ہے اگرچہ وہ اپنے دل کی اس آرزو کو الفاظ میں ظاہر کر سکتا ہو یا نہ ظاہر کر سکتا ہو۔ دلوں کے اندر جو بے اطمینانی ہے وہ خود پتا دیتی ہے کہ لوگوں کو اپنی کوئی چیز کھوئی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن ان میں اکثریت اپنی بے زبانی کے سبب سے بتا نہیں سکتی کہ کیا چیز کھوئی ہوئی ہے۔ جب دستور کی دفعات میں یا انتخابی تقریروں میں ان کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ درحقیقت اسلامی حکومت ہے جس سے ان کی مشکلیں حل ہوں گی اور اب یہ چیز آ رہی ہے تو وہ اس کے انتظار میں ہو جاتے ہیں اور یہ امید باندھ لیتے ہیں کہ جب اسلامی حکومت آ جائے گی تو ان کے سارے دلدر دور ہو

جائیں گے۔ لیکن یہاں ہر چیز آتی ہے، اگر نہیں آتی ہے تو یہی چیز نہیں آتی جس کا ہر دل میں انتظار ہے۔ مجرد دستور کے الفاظ اور انتخابی تقریروں سے لوگوں کو کیا تسلی ہو جب لوگ کوئی عملی قدم اسلام کی طرف اٹھتا ہوا نہیں دیکھتے! صدر محترم یہ خیال فرماتے ہوں گے کہ دستور کے اسلامی تقاضوں کی تکمیل کے لیے انہوں نے ایک اسلامی مشاورتی کونسل بنا دی ہے اور اس کی علمی رہنمائی کے لیے ایک اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنا دیا ہے، اب اور کیا چاہیے؟ اس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں چیزیں موجود ہیں لیکن سوال ان کے عملی فوائد و نتائج سے متعلق ہے کہ وہ کیا ہیں؟ اسلامی مشاورتی کونسل نے بلاشبہ جہاں تک اخباری اطلاعات سے علم ہو سکا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت کو جوئے، شراب، سود اور تعزیرات سے متعلق بعض صحیح مشورے دیے ہیں لیکن کیا اب تک اس کے کسی ایک مشورے پر بھی کوئی عمل ہوا ہے؟ ظاہر ہے کہ مجرد اس کے مشوروں ہی سے تو کوئی اصلاح واقع نہیں ہو جائے گی۔ اصلاح تو ہو گی جب کہ حکومت اور متعلق ادارے اس کے مشوروں کو درخور اعتناء سمجھیں۔ اگر درخور اعتناء نہ سمجھیں تو دفتری فائلوں کے انبار تو اونچے ہوتے رہیں گے لیکن بات وہیں رہے گی جہاں ہے۔ مشاورتی کونسل اپنی زندگی کا ایک دور پورا کر چکی، یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اس پوری مدت میں اس کے ہاتھوں اسلام کا ایک شوشہ بھی قائم نہ ہو سکا، اب کون فیصلہ کرے کہ اس میں حکومت کا قصور ہے یا کونسل کا؟ ایک عام آدمی تو نتائج و ثمرات کو دیکھتا ہے۔ وہ تو اس صورتِ حال کو دیکھ کر یہی رائے قائم کرے گا کہ مقصود اس سے محض عوام کو تسلی دینا ہے، اس میں سنجیدگی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

جہاں تک اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا تعلق ہے، اس کے 'تحقیقی' کاموں کو دیکھنے کے بعد ہم یہ رائے ظاہر کرنے پر مجبور ہیں کہ اس ادارے کی تحقیقات اور اس کے نظریات پر مسلمان قوم کو کبھی اعتماد نہیں ہو سکتا۔ اس ادارے کی جو لوگ سربراہی کر رہے ہیں ان کے پاس زیرِ بحث مسائل میں رائے زنی کے لیے نہ شریعت کا کافی علم ہی ہے اور نہ وہ دیانت ہی ہے جو ان کی رایوں پر عام مسلمانوں اور مذہبی طبقات کے اندر حسنِ ظن اور

اعتماد پیدا کر سکے۔ حالانکہ مذہبی پہلو سے قطع نظر سیاسی پہلو سے بھی اس اعتماد اور حسن ظن کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر یہ چیز نہ پیدا ہو سکی تو اس ادارے سے جو مقصد پیش نظر ہے وہ بالکل فوت ہو جائے گا اور وہ انتشارِ فکر جو آج موجود ہے اس میں اور زیادہ اضافہ ہو گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ علماء میں عام طور پر تقلید اور جدید حالات و مسائل سے بے تعلقی نے ایک قسم کا جمود پیدا کر دیا ہے اور یہ چیز مذہب کے لیے نہایت مضر ہے لیکن ہمارے متفرنجین کی بے راہ روی بھی علماء کے اس جمود سے کم خطرناک نہیں ہے۔ صدر محترم کو اس جمود اور اس بے راہ روی دونوں پر نظر رکھنی چاہیے اور کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہماری قوم کے اندر معتدل و متوازن ذہن و فکر پیدا ہو۔ اس کا واحد طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے ادارے جدید و قدیم دونوں سکولوں کے ایسے اشخاص پر مشتمل ہوں جن کے اندر علم اور کردار کے ساتھ ساتھ اعتدال و توازن ہو۔ ایسے اشخاص ہماری قوم میں زیادہ تو نہیں ہیں لیکن موجود ہیں اگر صرف کام کی اہمیت پیش نظر ہو، وہمی اندیشے مانع نہ ہوں تو ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

نئے انتخاب کے بعد وزراء کی جو نئی ٹیم میدان میں اتری ہے خاصی وزن دار ہے۔ اس میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو تجربہ اور قابلیت کے ساتھ ساتھ دینی ذہن بھی رکھتے ہیں۔ یہ چیز خوش آئند ہے۔ ہمارے نزدیک تو اس کے وزن میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اگر صدرِ ریاست اس میں بعض ایسے لوگوں کو بھی لیتے جو اپنی قابلیت، کردار اور اسلامی ذہن کے اعتبار سے ممتاز ہیں اگرچہ بعض اعتبارات سے ان کا نقطۂ نظر کچھ مختلف بھی رہا ہو۔ ایسے لوگوں کے تعاون سے (اگر وہ تعاون کے لیے آمادہ ہوتے) ملک کی ترقی اور قوم کی یک جہتی کے نصب العین کو بڑی تقویت حاصل ہوتی اور شاید اس سے دینی رجحانات کو فروغ دینے میں بھی مدد ملتی۔ صدارتی نظام میں چونکہ پارٹی ڈسپلن کی وہ غیر عقلی و غیر فطری مجبوریاں نہیں ہوتیں جو پارلیمانی نظام میں ہوتی ہیں اس وجہ سے صدر کے لیے بڑا موقع ہوتا ہے کہ وہ تھوڑے سے کسرِ انکسار کے ساتھ ملک کے تمام اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے

لوگوں کے تعاون سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ بہرحال جو لوگ بھی آئے ہیں اور آئندہ جو لوگ بھی آئیں ان سے ہماری یہ گزارش ہے کہ وہ جس سرگرمی کے ساتھ صدر کے اقتصادی اور سماجی منصوبوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں اس سے زیادہ نہیں تو اس کے برابر ہی سرگرمی کے ساتھ دستور کے ان الفاظ کو معنی پہنانے اور صدر محترم کے اِن وعدوں کو عملی شکل دینے کی کوشش کریں جو کتاب و سنت کے قوانین کے نفاذ اور اسلامی زندگی اور اسلامی تعلیم و تہذیب کے فروغ دینے سے متعلق کیے گئے ہیں۔ کوشش سے ہماری مراد ایسی عملی کوشش ہے جس کے کچھ نتائج، بالتدریج سہی، عماشا کو بھی محسوس ہوں۔ صرف زبانی کوشش تو ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی، اس سے نہ اب تک کچھ بنا ہے نہ آئندہ کچھ بن سکے گا۔ صدر ایوب اور ان کے رفقاء سے لوگوں کی توقعات کچھ اور ہیں اور ان توقعات میں اس بات سے بڑا اضافہ ہوگیا ہے کہ اب صدر ایوب کی راہ میں کوئی مزاحمت باقی نہیں رہی ہے، وہ دستور کے تقاضوں اور اپنے وعدوں کو بے دھڑک پورا کر سکتے ہیں۔

ہمارے نئے وزیر قانون نے غالباً اپنے پہلے ہی انٹرویو میں اطمینان دلایا ہے کہ ملک کے قوانین کو کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے مشاورتی کونسل کام کر رہی ہے۔ یہ مژدہ اس سے پہلے ہم اپنے سابق وزیر قانون کی زبانی بھی بارہا سن چکے ہیں۔ اب آرزو اور انتظار اس بات کے لیے ہے کہ کوئی چیز عملی شکل میں آئے۔ قانون کا معاملہ تو خیر ایک وقت طلب معاملہ ہے، اس کے لیے انتظار کیا جا سکتا ہے لیکن حکومت اپنے دوسرے شعبوں اور گوشوں میں تو بڑی آسانی کے ساتھ اپنے اسلامی رجحانات کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ اگر فی الواقع اس ملک میں کتاب و سنت اور اسلامی تہذیب و تمدن کو فروغ دینا مطلوب ہے تو اس نقطۂ نظر سے اپنے تعلیمی اداروں کا، ریڈیو کا، ٹیلی وژن کا، اخبارات کا، سینماؤں کا ذرا جائزہ لیجیے تو بیک نظر یہ چیز معلوم ہو سکتی ہے کہ اس نصب العین کے لحاظ سے ان کا کتنا حصہ مفید ہے اور کتنا مضر اور شاید کسی قانون سازی کے بغیر ان کو ہدایات جاری کی جا سکتی ہیں کہ چند متعین خطوط کو سامنے رکھ کر وہ اپنے مزاج کو اسلامی بنانے کی

کوشش کریں اور ان چیزوں سے احتراز کریں جو اس نصب العین کے منافی ہیں۔ انہی چیزوں پر کیا منحصر ہے، اگر فی الواقع اسلام اور اسلامی زندگی مطلوب ہے تو صدر محترم اور گورنر صاحبان اپنے اپنے سیکرٹریٹ سے لے کر پولیس اور فوج تک کو بہت سی ایسی ابتدائی ہدایات دے سکتے ہیں جن سے ہر شعبے میں ایک اسلامی حرکت پیدا ہو سکتی ہے اور اس کے لیے ذمہ داروں کے ارادے اور اہتمام کے سوا کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ارادہ ہی نہ ہو تو جو چیز ۱۸ سال کی طویل مدت میں بھی زبانی جمع خرچ کے حد سے آگے نہ بڑھ سکی، اگر وہ اب بھی آگے نہ بڑھ سکے تو اس کو کون آگے بڑھا سکتا ہے! اس ملک کے عوام بے چارے تو ابھی اس طرح کے معاملات میں تمنا کے مقام سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔

پاکستان میں مسلم لیگ پر بھی اس کامیابی کا شکر واجب ہے جو اس کو حاصل ہوئی ہے اور وہ شکر یہی ہو سکتا ہے کہ اس نے پاکستان کے قیام سے پہلے اور اس کے بعد مسلسل اس قوم سے اسلام اور اسلامی قانون کے لیے جو وعدے کیے ہیں وہ پورے کرے۔ اب یہ ملک اس موڑ پر پہنچ چکا ہے جہاں پہنچ جانے کے بعد اس کو اسلام کی طرف موڑنا جوئے شیر کے لانے سے کم دشوار نہیں رہا لیکن اس امر کا امکان، آخری درجے میں سہی، اب بھی ہے کہ اس کو یک قلم تبدیل ہو جانے سے بچایا جا سکے۔ مسلم لیگ کو اسمبلی میں جو بھاری اکثریت حاصل ہوئی ہے اس کے بعد اس کا ہر عذر ختم ہو چکا ہے۔ اس کے ہر ممبر نے اپنے اپنے حلقے میں اپنے ووٹروں سے اسلام قائم کرنے کا وعدہ کیا ہوگا۔ اب یہ وعدہ پھر امتحان کی کسوٹی پر ہے۔ اگر یہ وعدہ بھی وعدہ ہی رہا تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد کیا چیز ظہور میں آئے گی۔ ویسے اللہ کی سنت ایسے لوگوں کے بارے میں ہے بہت سخت! ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے وعدے پورے کرنے کی توفیق دے۔ مسلم لیگ میں ایسے عناصر بہت سے ہوں گے جنہیں اللہ کے دین سے صرف ووٹ ہی کی خاطر نہیں بلکہ نجات کے نقطۂ نظر سے بھی تعلق ہوگا۔ ہم ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اسمبلی میں اسلام کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے بلکہ ہر قیمت پر اس کا ساتھ دیں گے اگرچہ اس کے لیے انہیں

پارٹی کا ساتھ بھی چھوڑنا پڑ جائے۔ ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آخرت میں کام آنے والی چیز یہ پارٹیاں نہیں بنیں گی بلکہ اللہ کا دین بنے گا۔ ہمارے نزدیک تو پارٹی ڈسپلن کی وہ جکڑ بند جو آدمی کو جانتے بوجھتے اظہار حق سے روکے حرام ہے۔ اسلام نے ہر مسلمان پر فرض عائد کیا ہے کہ وہ جہاں بھی ہو صرف حق اور سچائی کا ساتھ دے۔ صدارتی نظام کے پارٹی سسٹم میں تو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ جکڑ زیادہ ہے بھی نہیں۔ اور یہ اس نظام کی ایک خوبی ہے۔ اس کو باقی بھی رکھنا چاہیے اور اس سے ارکان کو فائدہ بھی اٹھانا چاہیے۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ مئی ۱۹۶۵ء)

مقالہ ۱۶

صدر ریاست کے ارشادات

۱۳ جولائی ۱۹۶۰ء کو صدر ریاست فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کا افتتاح کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کے گورنروں کے بورڈ کے سامنے جو تقریر فرمائی ہے، وہ مختلف اعتبارات سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس تقریر کا پورا متن کسی اخبار میں ہماری نظر سے نہیں گزرا، صرف اس کا خلاصہ ہی ہمارے سامنے آیا ہے، لیکن اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام کو ایک متحرک طاقت بنانے کے اسی طرح خواہش مند ہیں جس طرح ایک سچے اور پکے مسلمان کو ہونا چاہیے۔

انہوں نے جمود اور عامیانہ تقلید کی سخت مذمت کرتے ہوئے زندگی کے تقاضوں کو سمجھنے، ان کا ساتھ دینے اور ان کے مطالبات پورے کرنے پر پورا زور دیا ہے، لیکن ساتھ ہی نہایت ہی پرزور الفاظ میں یہ تنبیہ بھی کی ہے کہ یہ کام مذہب کے اعلیٰ اصولوں کو قربان کر کے نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تنبیہ ان لوگوں کے لیے بہت ضروری تھی جو سمجھتے ہیں کہ مذہب تو مولویوں کے جمود کے سبب سے اپنے اصولوں سے منحرف ہو گیا ہے لیکن زندگی کے طور طریق میں ان کے نزدیک کوئی انحراف واقع نہیں ہوا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ زندگی تو صحیح شاہراہ پر مارچ کر رہی ہے البتہ مذہب پیچھے رہ گیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ ہماری زندگی

کا ساتھ دے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ پوری بیدردی کے ساتھ مذہب کے اصولوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں، حالانکہ انصاف یہ ہے کہ جس طرح اجتہاد کے تعطل نے ہماری زندگی کو جمود میں مبتلا کیا ہے، اسی طرح مغرب کی کورانہ تقلید نے ہمیں بے راہ روی اور آوارہ گردی میں مبتلا کیا ہے۔ اس وجہ سے ایک طرف اگر اس بات کی ضرورت ہے کہ مذہب زندگی کے تقاضوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرے تو دوسری طرف اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری زندگی مذہب کے ساتھ مطابقت پیدا کرے۔ جب یہ بات پیدا ہوگی تب ہی اعتدال و توازن کی وہ صحیح حالت وجود میں آئے گی جس کی طرف صدرِ ریاست نے اشارہ فرمایا ہے، ورنہ زندگی کے مطالبات اور تقاضوں کے ساتھ مذہب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں مذہب کا تیا پانچہ ہو کے رہ جائے گا۔ کیونکہ اس زمانہ میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، زندگی کے ہر گوشہ میں مغربیت کا فساد گھس چکا ہے اور یہ فساد مذہبی جمود کے فساد سے کہیں زیادہ ضررناک ہے۔ اس وجہ سے اگر ایک طرف مذہب میں حرکت پیدا کرنے کی ضرورت ہے تو دوسری طرف، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، زندگی کے موجودہ رخ کو بھی موڑنے کی شدید ضرورت ہے۔

صدرِ ریاست نے اسلام کے اعلیٰ اصولوں کا صرف اجمالاً ہی ذکر نہیں فرمایا ہے بلکہ بڑی وضاحت کے ساتھ قرآن مجید اور حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو کر سامنے آگئی ہے کہ اسلامی اصول و مبادی اور اسلامی قانون و احکام کے ان دونوں ماخذوں پر ان کا اسی طرح ایمان ہے جس طرح پوری امت ان پر ایمان رکھتی ہے۔ وہ اس زمانہ کے منکرین سنت کی طرح اللہ اور اس کے رسول، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ قرآن مجید کے متعلق انہوں نے فرمایا ہے کہ جب وہ اس کو پڑھتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ان کی یہ حالت خود ان کے لیے بھی قابلِ مبارک باد ہے اور اس مملکت کے لیے بھی قابلِ مبارک باد ہے جس کے وہ سربراہ ہیں! جن کے دلوں میں

قرآن کی یہ عزت و عظمت ہوگی ان سے یہ اندیشہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اس خداداد مملکت میں خدا کے قانون کے سوا کوئی اور قانون جاری و نافذ کریں گے۔

سنتِ رسول اللہ کا ذکر انہوں نے قرآن کے بعد اسلامی اصول و مبادی کے دوسرے ماخذ کی حیثیت سے کیا ہے۔ یہ بات فرما کر انہوں نے اس زمانے کے سب سے بڑے فتنے کی سرکوبی کی ہے۔ جو لوگ قرآن! قرآن! پکارتے ہیں اور سنت رسول اللہ کا انکار کرتے ہیں وہ درحقیقت پورے دین کے دشمن ہیں اور اس امت کے اندر وہ ایسی تفریق کا بیج بو رہے ہیں جو اگر خدانخواستہ برگ و بار لائے تو پھر اس امت کے بنیان مرصوص بننے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ وہ ذات جو امت کے اندر سب کی عقیدت کا مرجع ہے، جس کے ذکرِ محبوب سے ہر دل کے اندر جوشِ ایمان اور جذبہ خدا پرستی پیدا ہوتا ہے، جس کے تعلق نے دلوں کو جوڑا ہے اور جس کی نسبت نے باہمدگر یگانگی پیدا کی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، اس ذات کو اس امت کے اندر جو جگہ حاصل ہے اگر وہاں سے اس کو ہٹا دیا جائے تو اس امت کی عمارت کی بنیاد ہی اکھڑ جائے گی۔ اسی وجہ سے جو لوگ آج نبی ﷺ اور آپؐ کی سنت کی مخالفت کر رہے ہیں وہ ہمارے مذہب اور ہمارے ملک دونوں کی جڑیں کھودنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس غلط فہمی کے سبب سے ان کے حوصلے بہت بڑھتے جا رہے تھے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کے کار فرماؤں کا خیال بھی وہی ہے جو ان کا ہے اور اس غلط فہمی کے لیے فی الواقع کچھ اسباب بھی تھے۔ لیکن صدرِ ریاست کی اس تقریر نے واضح کر دیا کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی کی تشکیل میں آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور آپ کی سنت کو وہی اہمیت دیتے ہیں جو اہمیت فی الواقع ان کی ہے۔

صدرِ ریاست نے اس امر کو بھی اپنی اس تقریر میں واضح فرمایا ہے کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کو جو چیز باہمدگر جوڑتی ہے وہ درحقیقت دین ہی کا عنصر ہے۔ یہی چیز ہے جس نے چٹاگانگ سے لے کر درۂ خیبر تک کے مسلمانوں کو پاکستان کے نصب العین پر مجتمع

کیا ہے اور یہی چیز ہے جو ان کو اس نصب العین پر مجتمع رکھ سکتی ہے۔ یہ راز اگرچہ معلوم عوام ہے، اس ملک کا ہر باشندہ، جس کو اس ملک کی تاریخ کا کچھ پتا ہے، اس امر واقعی سے واقف ہے، لیکن ہمارے اندر ایک طبقہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو دین کو اس ملک کی ترقی میں حارج سمجھتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے صدر ریاست کی یہ تنبیہ شاید مفید ثابت ہو۔ وہ دین کی ہمدردی کے پہلو سے نہیں تو اپنے ملک کی سالمیت کے پہلو سے اس مسئلہ پر غور کرنے پر آمادہ ہوں کہ پاکستان میں بے دینی اور الحاد کی اشاعت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ جو چیز اس کے مختلف اجزا کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھے ہوئے ہے اسی کو ختم کر دیا جائے۔

صدر ریاست کی تقریر کے یہ پہلو روشن ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام کے مستقبل سے جو لوگ دلچسپی رکھتے ہیں (اور الحمد للہ اس ملک کی عظیم اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہے) انہوں نے اس تقریر سے نہایت اچھا اثر لیا ہوگا لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اس قسم کی مفید تقریروں کے اچھے اثرات کو یا تو دلوں سے زائل کر دیتی ہیں یا انتہائی حد تک کم کر دیتی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان باتوں پر بھی نگاہ رکھی جائے تاکہ لوگ ان تقریروں کو محض سیاسی تقریروں کا درجہ نہ دیں بلکہ ان سے پورا پورا فائدہ حاصل کریں اور اس راہ پر بڑھنے کے لیے ان کے اندر حوصلہ پیدا ہو جس کی طرف صدر ریاست نے اشارہ فرمایا ہے۔

اس قسم کی باتوں میں سے ایک قابلِ توجہ چیز تو خود اس بورڈ کی تشکیل کی نوعیت ہے۔ اس بورڈ کا جو مقصد صدر ریاست نے واضح فرمایا ہے اور جس کی مزید وضاحت وزیر تعلیم کی اسی موقع کی تقریر سے ہوتی ہے اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ بورڈ صرف کچھ اکیڈمک قسم کے مسائل پر بحث و تحقیق کے لیے وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ اس کے پیشِ نظر وہ عظیم کام ہے جس کے لیے صحیح تعبیر ہمارے ہاں تجدید دین و احیائے اسلام کی ہے۔ اگر ہم نے یہ مقصد سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس عظیم اور مقدس

کام کی انجام دہی کے لیے جو لوگ منتخب کیے گئے ہیں وہ شاید ہی اس کی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکیں۔ ہمیں ان حضرات کے علم و فضل سے انکار نہیں ہے لیکن موجودہ دور کے تقاضوں اور کتاب و سنت کے تقاضوں میں ایسی سازگاری پیدا کرنا کہ نہ کتاب و سنت کے اصول مجروح ہوں نہ وقت کے مطالبات نظر انداز ہوں، ایک نہایت نازک کام ہے جس کو وہی لوگ بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں جن کو دین میں بھی پوری پوری بصیرت حاصل ہو اور جو وقت کے تقاضوں کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں اور ساتھ ہی ان میں تقویٰ اور احتیاط بھی ہو تاکہ مسلمان ان کے اجتہادات اور ان کی رایوں پر اعتماد کریں۔

ہمارے سامنے ابھی اس بورڈ کا پورا طریقۂ کار نہیں آیا ہے اس وجہ سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ اپنے مشکل اور عظیم کام کو کس طرح انجام دے گا۔ تاہم اتنی بات ہم ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر اس بورڈ نے اسی قسم کے اداروں کو اپنے مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جو مختلف کارناموں سے ہمارے ملک میں ہر غالب ہو جانے والی برائی کو دین کی سند فراہم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں تو یہ چیز اس بورڈ کی خدمات کی طرف سے لوگوں کو بہت مایوس کرے گی۔ ان اداروں نے جس نظریہ پر اب تک کام کیا ہے وہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی انہوں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں مغربی تہذیب اور مغربی علوم کے زیر اثر جو برائیاں داخل ہو چکی ہیں وہ سب اچھائیاں ہیں اور بالکل وقت کے تقاضوں کے تحت داخل ہوئی ہیں۔ اب اگر مذہب ان کا ساتھ نہیں دیتا تو یہ مذہب کا قصور نہیں ہے بلکہ مولویوں کا جمود ہے۔ اس کے بعد وہ مغربی زندگی کے ان فتنوں کو دین ثابت کرنے کے لیے دین کے ساتھ جو معاملہ کر رہے ہیں اس کو ہر انصاف پسند دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ دین کی اور اسلامی معاشرہ کی خدمت ہے یا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ بدترین قسم کی دشمنی۔

جہاں تک دین کی تجدید اور اسلام کے احیاء کے ارادہ کا تعلق ہے ہم دل سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ چیز پاکستان کے قیام کے مقاصد میں سے ہے اور

ہمیں دلی خوشی ہو گی اگر پاکستان اس راہ میں عالمِ اسلامی کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے۔ لیکن یہ عظیم کام صحیح طور پر اسی صورت میں انجام پاسکتا ہے جب اس کو دین اور دنیا دونوں کے تقاضوں کو سمجھنے والے دلی تعاون کے ساتھ انجام دیں اور ان کے پیشِ نظر صرف اللہ کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی ہو۔ اگر یہ کام خام قسم کے نوجوانوں سے محض اس اعتماد پر لینے کی کوشش کی گئی کہ ان کے پاس ڈاکٹریٹ یا ایم اے کی سند ہے تو اس سے نہ صرف یہ کہ وہ مقصد نہیں حاصل ہو گا، جس کی طرف صدرِ ریاست نے اشارہ فرمایا ہے، بلکہ ان خام تحقیقات سے ایک سخت قسم کا ذہنی اور فکری انتشار پیدا ہو گا جو ہماری قوم کے لیے موجودہ فکری جمود سے بھی زیادہ مضر ہو گا۔

اس بورڈ سے علماء کا بالکل الگ رکھا جانا ایک ایسا معاملہ ہے جس کی معقول توجیہ سے ہمارا ذہن بالکل قاصر ہے۔ ہمارے ملک میں خدا کے فضل سے ایسے علماء موجود ہیں جو اس مقصد کی نہایت بہتر طریقہ پر خدمت کر سکتے ہیں جو اس بورڈ کا بتایا گیا ہے۔ ان کی علمی و مذہبی خدمات اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ دین اور دنیا دونوں کے تقاضے سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو ان کے کام پر اعتماد ہے۔ ایسے لوگوں کو بالکل نظر انداز کر کے صرف ایک ہی طرزِ فکر کے لوگوں پر مشتمل جو بورڈ بنایا گیا ہے وہ دین و دنیا کی ہم آمیزی کے اس مشکل کام میں وہ اعتدال و توازن کس طرح قائم رکھ سکے گا جس کے قائم رکھنے پر صدرِ ریاست نے اس قدر زور دیا ہے۔ اس بورڈ کے اصل مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس میں دین کے ماہرین صرف بطور تبرک شامل نہ ہوتے بلکہ بورڈ کی اکثریت انہی پر مشتمل ہوتی لیکن اگر علماء کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ دنیا کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے تو کم از کم دین کے جاننے والوں کی حیثیت سے تو اس میں ان کی مؤثر نمائندگی ضروری تھی۔ ہم صدرِ ریاست سے گزارش کریں گے کہ وہ اس بورڈ کی اس کمی کی اصلاح فرمائیں۔ یہ گزارش ہم اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ اس بورڈ میں شمولیت علماء کا کوئی حق ہے جو انہیں ملنا چاہیے بلکہ صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ جو کام پیشِ نظر ہے وہ علماء کی شمولیت کے بغیر مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔

آخر میں ہم وہ گزارش پھر کریں گے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ جس طرح ضرورت اس وقت مذہب کو متحرک بنانے کی ہے اسی طرح ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ زندگی کو اسلام کی طرف موڑا جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس کے برعکس رجحان پایا جاتا ہے۔ جو برائیاں ہمارے یہاں محتاجِ اصلاح تھیں ہم ان کو کلچر اور ثقافت وغیرہ کے مہذب ناموں سے مزید چمکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگ ان کو شریعت کی سند بھی عطا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح کی باتیں ہیں جو ذہنوں میں الجھن پیدا کر دیتی ہیں اور جن سے نہایت مفید تقریروں کے اثرات بالکل زائل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اگست ۱۹۶۰)

اسلامی مشاورتی کونسل کی تشکیل

نئے دستور کے نفاذ کے بعد سے اس ملک میں جو حالات پیش آئے ہیں وہ ہمارے نزدیک کسی پہلو سے بھی خوش آئند نہیں ہیں۔ اجتماعی و سیاسی زندگی میں ہمارے جو عناصر حصہ لیتے ہیں ان میں سے بلا استثناء سبھی کا رول نہایت مایوس کن رہا ہے۔ جو لوگ اہلِ سیاست کے نام سے معروف ہیں انہوں نے اس دوران میں جس غیر ذمہ داری اور ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا ہے اور برابر دیئے پر مصر ہیں اس سے ایک عام آدمی بھی اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ اس ملک میں جمہوریت کا مستقبل بہت تاریک ہے۔ اربابِ اقتدار نے جو روش اختیار کی ہے اس سے ان توقعات کی قریباً کمر ٹوٹ گئی ہے جو صدر ریاست کی طرف سے ازخود ایک دستور کے نفاذ اور مارشل لاء کے ختم کیے جانے سے بہت سے دلوں میں پیدا ہو گئی تھیں۔ بالخصوص اسلامی مشاورتی کونسل کی تشکیل جس شکل میں ہوئی ہے اس کو دیکھنے کے بعد تو ان حضرات سے اسلام کے باب میں کوئی اچھی توقع کرنا محض خوش فہمی ہی ہوگی۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس کونسل کی تشکیل کرتے وقت بہت دور تک سوچ کر اس بات کے لیے پیش بندی کی گئی ہے کہ مبادا اس کی وجہ سے ان کو اسلام کی کوئی بات قبول کرنے کی زحمت میں مبتلا ہو جانا پڑے۔ اگر یہ انتخاب صدر ریاست کی اپنی ہی صواب دید پر مبنی ہے تو ہم اس پر ان کو مبارکباد نہیں دے سکتے۔ ہمیں ان سے اس سے کہیں بہتر انتخاب کی امید تھی۔ اور اگر اس انتخاب میں دوسروں کے مشورے کو دخل ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے اس مشورے سے صدر ریاست کے وقار و اعتماد اور ملک کے مستقبل کو بڑا

نقصان پہنچایا ہے۔ جو لوگ منتخب کیے گئے ہیں ہم ان شریف آدمیوں کو زیرِ بحث لا کر بے ضرورت ان کو مجروح نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پیشِ نظر مقصد کے لیے ان میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کوئی شخص بھی اپنے اندر کوئی موزونیت نہیں رکھتا۔ اس کونسل کے قیام سے مقصود بہرحال اسلام کے خلاف کوئی سازش کرنا نہیں ہے بلکہ ملک کے سامنے پیش آنے والے پیچیدہ مسائل میں اس سے فتویٰ حاصل کرنا ہے۔

ان مسائل میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے؟ اگر خوفِ خدا نہیں تو کم از کم دنیا کو دکھانے ہی کے خیال سے اس میں کچھ ایسے لوگوں کو شامل کرنا ضروری تھا جو اس کام کے اہل تھے تاکہ دستور کی اتنی اہم چیز، جس سے نہ جانے کتنی امیدیں وابستہ تھیں، لوگوں کی نظروں میں بالکل مذاق بن کے نہ رہ جاتی۔ اپنے اس انتخاب کی تصویب میں محترم صدر ریاست اور ہمارے وزیرِ خارجہ صاحب نے یہ جو فرمایا ہے کہ ایسے لوگ کہاں مل سکتے ہیں جن پر کسی کو اعتراض نہ ہو۔ یہ ایک بالکل ہی پادر ہوا بات ہے جو محض لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کہی جا رہی ہے۔ ورنہ آخر یہ مطالبہ کس نے کیا تھا کہ اس کونسل میں وہ لوگ لیے جاتے جن پر کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ لوگوں کا مطالبہ معصوم صفت انسانوں کے لیے نہیں تھا بلکہ ایسے اشخاص کے لیے تھا جو اسلامی شریعت میں بصیرت رکھنے والے، حالات و مسائل کو سمجھنے والے اور ملک کی اکثریت کے نزدیک قابلِ اعتماد ہوں۔ اگر اربابِ اقتدار کو اصل ضرورت کی اہمیت اور مسلمانوں کے احساسات کا اندازہ ہوتا تو اس قوم کے اندر سے مذکورہ صفات کے اشخاص کا تلاش کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ اب اگرچہ کوئی مشورہ پیش کرنا بعد از وقت ہے لیکن از روئے دستور چونکہ اس فہرست میں اضافہ کی گنجائش موجود ہے اس وجہ سے ہم صدر ریاست کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا داؤد غزنوی صاحب، مولانا مودودی صاحب اور مولانا اظہر علی صاحب کو اس کونسل میں ضرور شامل کیا جائے۔ علماء کے طبقہ سے جب تک ان حضرات کے درجہ کے اشخاص نہیں لیے جائیں گے نہ تو کونسل کے اندر توازن قائم ہو سکے گا اور نہ مسلمانوں کی نظر میں اس کونسل کی اور اس کے مشوروں کی کوئی وقعت ہوگی۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ جولائی، اگست ۱۹۶۲ء)

اسلامی مشاورتی کونسل

اسلامی مشاورتی کونسل کا معاملہ شروع ہی سے کچھ عجیب وغریب سا رہا ہے۔ اوّل تو اس کے لیے جو اشخاص منتخب کیے گئے ان کے ناموں ہی کو سن کر اس کے مستقبل سے متعلق نہایت شدید قسم کی مایوسی ہوگئی تھی۔ ثانیاً اس پر جو پابندیاں عائد کردی گئی تھیں وہ ایسی غیر منطقی تھیں کہ ان کو دیکھتے ہوئے یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اگر یہ کونسل کوئی کام کرنا بھی چاہے گی تو کس طرح کر سکے گی۔ چنانچہ اب یہ بات بالکل کھل کر سامنے آگئی کہ اپنے روزِ پیدائش سے لے کر آج تک کی وسیع مدت میں یہ کونسل مجالسِ قانون ساز کو کوئی ایک مشورہ بھی دینے کے قابل نہ ہوسکی۔ حالانکہ قومی خزانے کا ہزاروں لاکھوں روپیہ اس پر صرف ہو چکا ہوگا۔

حکومت کے ذمہ داروں کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے ایک سے زیادہ معاملات میں کونسل کا فتویٰ معلوم کرنا چاہا لیکن اس کی طرف سے ہمیں کوئی جواب ہی نہیں موصول ہوا۔ کونسل کے ذمہ داروں کا جواب یہ ہے کہ ہمارے اوپر بعض ایسی پابندیاں عائد ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم کسی معاملہ میں جلدی جواب دے ہی نہیں سکتے۔ مثلاً یہ کہ وہ اس بات کے پابند ہیں کہ جب ان کے سامنے حکومت کی طرف سے کوئی استفتا آئے تو وہ اس سے متعلق ضروری معلومات وحقائق فراہم کرنے کی درخواست اس اسلامی ریسرچ کے ادارے سے

کریں جو حکومت کے زیرِ اہتمام قائم ہے۔ جب وہ ضروری معلومات وحقائق فراہم کر کے دے تب کونسل اس کی روشنی میں رائے قائم کرے اور اپنی اس رائے سے متعلقہ اداروں کو آگاہ کرے۔ کونسل کو شکوہ ہے کہ اب تک اس ادارے سے جن معاملات میں معلومات وحقائق فراہم کرنے کی خواہش کی گئی ادارے نے اس کی تعمیل ہی نہیں کی اس وجہ سے کونسل اس قابل نہیں ہوسکی کہ کسی استفتا کا جواب لکھ سکے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو ہمارے نزدیک حکومت بھی مجبور ہے اور کونسل بھی! حکومت کی مجبوری یہ ہے کہ اس غریب کو کیا خبر کہ کیا چیز اسلامی ہے اور کیا چیز غیر اسلامی۔ وہ تو کوئی رہنمائی حاصل کر سکتی ہے تو اسلامی مشاورتی کونسل ہی سے حاصل کر سکتی ہے۔ جب کونسل اس کو کوئی رہنمائی ہی نہ دے تو آخر وہ کیا کرے اور مجالسِ قانون ساز کے سامنے کیا چیز پیش کرے!

رہی کونسل تو اس کی بے بسی بھی واضح ہے۔ جب اس کی محفل آرائی کے لیے وہ نومن تیل ضروری ہوا جو اسلامی ریسرچ کے کولھو سے نکلا ہوا ہو تو آخر وہ اس کی فراہمی کے بغیر ہی کس طرح تمام روایات وآداب کو توڑ کر بے نقاب و بے حجاب ہوجائے!

اس سلسلہ میں ہمیں اسلامی ریسرچ کے ادارے کا عذر اگرچہ معلوم نہیں ہو سکا ہے لیکن ہم یہ حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ اس کی طرف سے بھی اگر کوئی تساہل ہو رہا ہوگا تو بے سبب نہیں ہو رہا ہوگا۔ عجب نہیں کہ اس کی ٹانگ بھی کسی ادارے کے ساتھ باندھ دی گئی ہو اور وہ اس الجھن میں پھنس کر کونسل کے جوابات لکھنے کی فرصت نہ پا رہا ہو۔

افسوس ہے کہ ہمارے اربابِ اقتدار اگر اسلام کے نام پر کوئی کام عوام کو بہلانے کے لیے کرتے بھی ہیں تو اس کو بھی خوبصورتی کے ساتھ نباہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے! ہر شخص روزِ اوّل سے جانتا ہے کہ اس اسلامی مشاورتی کونسل کے ہاتھوں نہ اسلام کا کچھ بننا تھا نہ کچھ بگڑنا بلکہ یہ محض اسلام، اسلام! پکارنے والے عوام کا جی خوش کر دینے کی ایک تدبیر

تھی۔ حکومت کا فائدہ ہی تھا اگر اس کا کچھ بھرم قائم رکھنے ہی کی کوشش کی گئی ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے کارفرما حضرات یہ بھی نہ کر سکے۔ اسی کونسل کا نام لے کر دستور کی اسلامیت کے گن گائے جاتے تھے اور اسی کے بل پر ہمارے صدرِ ریاست عوام کو اطمینان دلاتے تھے کہ دستور میں اسلام کی حفاظت کی پوری پوری ضمانت موجود ہے۔ اب وہی فرمائیں کہ جب حالات یہ ہیں جو مذکور ہوئے تو ان کی اطمینان بخشی کی قدر و قیمت کیا رہ جاتی ہے!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اگست ۱۹۶۳ء)

مقالہ ۱۹

اسلامی یونیورسٹی کا قیام

اس بات سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ بہاولپور میں جامعہ عباسیہ کو محکمہ اوقاف کے زیرِ اہتمام ایک اسلامی یونیورسٹی کی حیثیت دی جا رہی ہے اور محترم صدرِ ریاست کے ہاتھوں باضابطہ اس کا افتتاح ہو چکا ہے۔ محکمہ اوقاف کے زیرِ اہتمام اگر واقعی اسلام اور مسلمانوں کے لیے کچھ مفید کام ہونے لگیں تو حکومت کا اوقاف پر قبضہ کرنا کچھ گراں نہ گزرے۔ لیکن اب تک تو اس محکمہ کے ہاتھوں جو کام انجام پائے ہیں وہ کچھ زیادہ امید افزا نہیں ہیں۔ مزاروں پر قوالی، چراغاں اور چادریں چڑھانے کے کام تو ہمارے عوام بھی خاصی حد تک انجام دے لیتے تھے۔ اگر یہی کام ذرا زیادہ وسیع پیمانے پر سرکاری اہتمام میں ہونے لگے تو اس سے اس کے سوا کیا فرق پیدا ہوا کہ جو بے عقلیاں اور نادانیاں اب تک عوام کالانعام کے ہاتھوں ہو رہی تھیں ان کی ذمہ داری خود ہماری سرکار دولت مدار نے اٹھالی۔ اگر یہ سب کچھ محض عوامی جذبات کی پاسداری میں ہو رہا ہے تو عوامی جذبات کی پاسداری کے نقطۂ نظر سے تو شاید زیادہ بہتر شکل یہی ہوتی کہ حکومت اوقاف کی ذمہ داریوں سے دامن کشاں ہی رہتی۔ لیکن جب اس نے عوام کے جذبات سے صرف نظر کر کے اوقاف پر قبضہ کر ہی لیا تو اسے چاہیے کہ وہ ان کو اسلام اور مسلمانوں کی بہبود کا ذریعہ بنائے۔

جامعہ عباسیہ کو ایک اسلامی یونیورسٹی کے درجے تک ترقی دینا ہمارے نزدیک ایک نہایت مفید کام ہے اور ہم اس پر محکمہ اوقاف کو مبارک باد دیتے ہیں لیکن ایک دو باتیں اس سلسلے میں بھی قابلِ گزارش ہیں۔ امید ہے ہمارے اربابِ حل وعقد ان پر بھی غور فرمائیں گے۔

ایک تو یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کا منصوبہ پیش کرنے والوں نے اس کی افادیت واضح کرتے ہوئے جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے سند یافتہ ان مساجد و مدارس کی امامت و نظامت سنبھال سکیں گے جو اب حکومت کے زیر اہتمام ہیں۔ ہم یہ عرض کرتے ہیں: کیا اسلام کا علم رکھنے والوں کی ضرورت صرف ہماری مسجدوں ہی کو ہے، ہماری حکومت اور اس کے مختلف شعبوں اور محکموں کو نہیں ہے؟ کیا ایک ایسی حکومت میں جس کے متعلق ہمارے اربابِ حل وعقد شروع سے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ اسلام کے لیے قائم کی گئی ہے، ایک تھانیدار اور تحصیل دار سے لے کر اونچے سے اونچے عہدہ دار اور ذمہ دار تک، خواہ وہ ڈائریکٹر ہو یا سیکرٹری، جج ہو یا وکیل، سفیر ہو یا وزیر، ممبر ہو یا سپیکر، پروفیسر ہو یا چانسلر، گورنر ہو یا صدر یکساں ضروری نہیں ہے کہ وہ علم دنیا کے ساتھ ساتھ علم دین کے بھی جاننے والے ہوں؟ اگر یہ ضروری ہے (اور ہمارا خیال ہے کہ اس کے ضروری ہونے سے کوئی معقول آدمی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا) تو آخر ساری فکر مسجدوں ہی تک کیوں محدود ہے، حکومت چلانے کے لیے اس یونیورسٹی سے آدمی تیار کرنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے؟ پاکستان کے بنیادی نصب العین کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تو اس وقت ہمارے ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسی یونیورسٹی قائم ہو جو میکالے کے نظریات کے بجائے اسلامی نظریہ تعلیم کو فروغ دے اور اس راہ میں ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کی رہنمائی کرے تاکہ ان سے ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت چلانے کے لیے اشخاص پیدا ہو سکیں۔ اگر اسلام، اسلام! کا شور محض عوام فریبی کے لیے نہیں ہے اور اسلام کو صرف مسجدوں ہی کے اندر بند رکھنا نہیں ہے تو کم از کم اس ملک میں ایک یونیورسٹی تو ایسی ہو جو رہنمائی دے کہ اسلامی نقطہ نظر سے ہمارے موجودہ تعلیمی نظام

میں کیا تبدیلیاں ضروری ہیں؟ آخر یہ ضروری کام کرنے کا وقت کب آئے گا؟

دوسری گزارش یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کو اگر کسی درجے میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید بنانا ہے تو نہ مستشرق ٹائپ کے لوگوں کو اس پر مسلط کرنا صحیح ہو گا، نہ جامد اور متعصب قسم کے لوگوں کو! ان دونوں ہی قسم کے اشخاص سے اسلام کے مقصد کو فائدہ کے بجائے الٹا نقصان پہنچے گا۔ اس کے لیے ایسے اشخاص تلاش کرنے کی ضرورت ہے جو عقیدۃً اور عملاً مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ذہناً محقق اور سکالر ہوں۔ ہمارے صدر ریاست نے اس یونیورسٹی کے افتتاح کے موقع پر جو تقریر ارشاد فرمائی ہے، اس میں انہوں نے علماء کے جمود اور تقلید پر جو کچھ ارشاد فرمایا ہے ہم اس کی پوری پوری تائید کرتے ہیں لیکن یہ عامیانہ تقلید کی بیماری کچھ مولویوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ جو حضرات مغرب سے ڈگریاں لے کر آتے ہیں یہ مولویوں سے کہیں زیادہ عامیانہ تقلید کے مارے ہوئے ہوتے ہیں! علماء اپنی نصابی کتابوں کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے اور یہ حضرات مستشرقین کے اقوال و ارشادات سے کچھ الگ ہو کر نہیں سوچ سکتے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ علماء کے جمود پر ماتم کرنے والے تو بہت ہیں، یہاں تک کہ ہمارے صدر ریاست کو بھی ان کے حالِ زار پر توجہ کے لیے فرصت مل جاتی ہے، لیکن ہمارے ان پاکستانی 'مستشرقین مقلدین' کے حالِ زار پر کوئی ماتم نہیں کرتا حالانکہ ان کا حال علماء کے حال سے کچھ کم قابلِ ماتم نہیں!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

عائلی کمیشن کی سفارشات کا نفاذ

ہمیں یہ معلوم کر کے افسوس ہوا ہے کہ ہماری حکومت نے عائلی کمیشن کی رپورٹ منظور کر لی ہے اور اس کی سفارشات کے مطابق نکاح و طلاق اور کفالت و وراثت وغیرہ سے متعلق مروجہ قوانین میں وہ اصلاح و ترمیم کر دینا چاہتی ہے۔ مذکورہ کمیشن ۱۹۵۵ء میں پاکستان کی مرکزی حکومت نے قائم کیا تھا اور اس کی رپورٹ جون ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ جس وقت یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی اس وقت اس ملک کے تمام دینی حلقوں اور عام مسلمانوں کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی تھی لیکن اب چونکہ اس ردِعمل پر ایک عرصہ گزر چکا ہے، یہ باتیں ہماری موجودہ حکومت سے پہلے کی ہیں، ممکن ہے لوگوں کے عام احساسات اس رپورٹ کے بارے میں حکومت کے سامنے نہ ہوں۔ اس وجہ سے ہم صدر ریاست فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے سامنے اس رپورٹ کے بعض پہلوؤں کو لانا چاہتے ہیں اور ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہماری ان معروضات پر غور فرمائیں گے۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں اسلام اور اسلامی شریعت سے متعلق مسلسل اپنے جن جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی بنا پر ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر کوئی ایسی بات پسند نہیں کریں گے جو اسلام اور اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔

اس کمیشن سے متعلق سب سے زیادہ خاص بات جو جاننے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس

ذمہ جو کام سپرد کیا گیا تھا وہ کوئی عام قسم کی قانونی ترمیمات و اصلاحات تجویز کرنے کا کام نہیں تھا بلکہ خالص شرعی قوانین و احکام سے تعلق رکھنے والا کام تھا اور یہ شرعی احکام و قوانین بھی عام قسم کے نہیں تھے بلکہ ہر مسلمان کی شخصی زندگی سے تعلق رکھنے والے تھے، جن کے بارے میں لوگوں کے احساسات حلت و حرمت بڑے نازک ہوتے ہیں اور حکومتیں ان کا بڑا احترام ملحوظ رکھتی ہیں۔ لیکن کام کی اس اہمیت و نزاکت کے باوجود اس کمیشن کے لیے جو اشخاص منتخب کیے گئے ان میں ایک صاحب کے سوا بقیہ جتنے اصحاب بھی تھے وہ نہ صرف یہ کہ اسلامی شریعت کے علم سے بالکل بے بہرہ تھے بلکہ بعضوں کے متعلق تو یہ کہنے میں بھی ہمیں کوئی تکلف نہیں ہے کہ اسلامی شریعت کے باب میں وہ اپنے مخالفانہ جذبات اور غیر ذمہ دارانہ خیالات و نظریات کے لیے مسلمانوں میں ہمیشہ بدنام رہے۔

ممکن ہے ہمارے صدر ریاست کے سامنے اس وقت وہ سارے نام نہ ہوں۔ اس وجہ سے ہم کمیشن کے ارکان کے ناموں کو یاددہانی کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ کمیشن مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل تھا:

خلیفہ عبدالحکیم صاحب مرحوم، مسٹر عنایت الرحمان صاحب، بیگم شاہنواز، بیگم انور جی احمد، بیگم شمس النہار محمود اور مولانا احتشام الحق صاحب۔

ابتداءً اس کے صدر خلیفہ شجاع الدین مرحوم بنائے گئے تھے لیکن کمیشن کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد خلیفہ صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ پر میاں عبدالرشید صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈال کر صدر ریاست خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان میں سے ایک صاحب کے سوا کن صاحب یا صاحبہ کی نسبت مسلمان یہ حسنِ ظن قائم کر سکتے تھے کہ ان کو فقہ و حدیث اور اسلامی شریعت کا اتنا علم ہے کہ وہ اسلام کے عائلی قوانین میں ترمیم و اصلاح تجویز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہمیں ان فاضل ارکان کی دوسری صلاحیتوں اور قابلیتوں کا

انکار نہیں ہے۔ وہ علم وفضل کے بلند سے بلند مرتبہ پر فائز سہی، سوال اس دین اور شریعت کے علم سے متعلق ہے جس کے ایک نہایت ہی اہم اور نازک شعبہ سے متعلق ان کو سفارشات مرتب کرنے کی خدمت سپرد ہوئی تھی!

ان میں تنہا مولانا احتشام الحق تھانوی ایک ایسے بزرگ تھے جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ شریعت کے عالم ہیں لیکن ہم صدر ریاست کے علم میں یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ مولانا موصوف نے کمیشن کی سفارشات سے اسی زمانہ میں اپنی کلی براءت کا اعلان کر دیا تھا اور ان کا یہ اعلان پوری تفصیل کے ساتھ اسی زمانہ میں حکومت کے سامنے بھی آ گیا تھا اور پبلک کے سامنے بھی! اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایک کمیشن جو خالص شرعی مسائل سے متعلق سفارشات مرتب کرنے کے لیے بٹھایا جاتا ہے، اس کے ارکان میں سے جو واحد رکن دین کا جاننے والا ہے جب وہی اس کی سفارشات سے کھلم کھلا اپنی براءت کا اعلان کر دیتا ہے تو آخر دینی اعتبار سے اس کمیشن کی سفارشات اور تجاویز کا کیا وزن باقی رہ جاتا ہے؟ حقیقت نفس الامری خواہ کچھ بھی ہو لیکن ایک عام مسلمان تو اس صورت میں یہی رائے قائم کرے گا کہ یہ سفارشات شریعت کے بالکل خلاف ہیں۔

ہم صدر ریاست کے علم میں یہ بات بھی لانا چاہتے ہیں کہ اس کمیشن کی پیش کردہ رپورٹ کی مخالفت صرف احتجاجی تقریروں ہی کے ذریعہ سے نہیں ہوئی تھی بلکہ نہایت مدلل اور سنجیدہ علمی مقالات و مضامین کے ذریعہ سے ہوئی تھی۔ یہ تنقیدی مضامین لکھنے والوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ ان مضامین میں ان سفارشات کا صرف خلافِ شریعت ہونا ہی نہیں دکھایا گیا تھا بلکہ نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کی گئی تھی کہ اگر یہ سفارشات عملاً نافذ ہو گئیں تو ہماری معاشرتی زندگی کا پورا ڈھانچہ بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اور ان کے نفاذ سے سب سے زیادہ نقصان ہمارے معاشرہ کے انہی اجزاء کو پہنچے گا جن کی بہبود کو پیشِ نظر رکھ کر ہی بظاہر یہ سفارشات مرتب کی گئی ہیں۔

خود راقم نے بھی ان سفارشات کا بڑا تفصیلی تنقیدی جائزہ لیا تھا اور اس جائزہ میں ہم نے نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ یہ دکھایا تھا کہ یہ سفارشات بجز چند ایک کے نہ صرف قرآن و حدیث کے خلاف ہیں بلکہ ان لوگوں کے مفاد کے بھی خلاف ہیں جن کی خاطر یہ مرتب کی گئی ہیں۔ ہمارا یہ تنقیدی جائزہ اخبارات و رسائل میں بھی آ چکا ہے اور اسی زمانہ میں کتابی شکل میں بھی چھپ کر ایک وسیع حلقہ میں پھیل چکا ہے۔ ہم آج بھی ان سفارشات کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں کہ اگر یہ قانون بن کر عملاً نافذ ہو جائیں تو ان سے ہمارے معاشرہ کے ہر طبقہ کو نہایت شدید نقصان پہنچے گا۔ ہم صدر ریاست کی مصروفیتوں کو جانتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی ذمہ داریوں اور مسئولیتوں کو بھی جانتے ہیں اس وجہ سے ہم ان سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ اس سلسلہ کی ضروری چیزیں بذاتِ خود ملاحظہ فرمائیں اس لیے کہ عنداللہ اور عندالناس جو ذمہ داری ان کی ہے وہ کسی کی بھی نہیں ہے۔

انگریزوں نے ہمارے پرسنل لاء میں اگر کوئی مداخلت پسند نہیں کی تھی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی، جیسا کمیشن نے سمجھا ہے، کہ وہ ہم کو ترقی سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ نسوانی آزادی اور اخلاقی بے قیدی کی جو برکات وہ اس ملک میں لائے ان میں ہم نے جتنا بھی حصہ لیا عین ان کی آرزوؤں کے مطابق تھا اور جتنا بھی حصہ لیتے ٹھیک ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتا، اس ترقی سے ہمیں محروم کر کے وہ کیا فائدہ حاصل کر سکتے تھے؟ انہوں نے اگر ہمارے پرسنل لاء میں مداخلت نہیں کی تو اس کی وجہ یہ اور صرف یہ تھی کہ وہ ایک سیاسی قوم ہونے کے سبب سے پرسنل لا کی نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دین کا یہ حصہ ہر شخص کی زندگی سے فرداً فرداً تعلق رکھنے والا ہوتا ہے، اس کے بارے میں عوام و خواص سب ہی کے احساسات بہت نازک ہوتے ہیں، بالخصوص عوام کا تو اصلی دین ہی اتنا ہوتا ہے جتنا پرسنل لاء سے تعلق رکھنے والا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے نہ صرف انگریزوں نے بلکہ دنیا کی کسی بھی سیاسی قوم نے کبھی اپنی رعایا کے پرسنل لاء سے کبھی تعرض کرنے کی

غلطی نہیں کی ہے۔ اب ہمارے صدر ریاست غور فرمائیں کہ ہمارے دین کا جو حصہ انگریزوں کے زمانہ میں بھی محفوظ رہا، ہمارے لیے یہ کتنی مایوسی اور دل شکستگی کی بات ہوگی، اگر وہ اس زمانہ میں آ کر خطرہ میں پڑ جائے جبکہ اس ملک میں ہماری اپنی حکومت قائم ہو چکی ہے، جس سے ہر مسلمان بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ صرف پرسنل لاء کے دائرہ میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ میں اللہ اور اس کے رسول کے قانون کو جاری کرے گی۔

ہمارے صدر ریاست سے معاملہ کی نزاکت کا یہ پہلو بھی مخفی نہیں ہو سکتا کہ مخالفِ اسلام بات کو من مانے طور پر کر گزرنا اور چیز ہے اور کسی مخالفِ اسلام بات کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ یہی عین اسلام ہے اور چیز ہے۔ کمیشن نے جو سفارشات کی ہیں ان کی نوعیت صرف سفارشات کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے ایک ایک چیز کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہی عین اسلام یا مقتضائے اسلام ہے۔ کمیشن نے جن چیزوں کو عین اسلام یا مقتضائے اسلام بتایا ہے ان میں سے اکثر باتیں ایسی ہیں جو اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں اسلام کے بالکل خلاف اور حرام سمجھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے تمام متفق علیہ اماموں، تمام علماء اور تمام فقہاء نے ان کے خلاف فتوے دیے ہیں۔ اسلامی قانون کی تمام کتابیں ان کے خلاف گواہی دے رہی ہیں۔ تمام مسلمانوں کا عمل ان کے خلاف رہا ہے۔ ایسے حالات میں ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اہلِ ایمان کے ضمیر ان اصلاحات کو اسلام سمجھ سکیں گے۔ بلکہ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان اصلاحات کے نفاذ کی صورت میں ہر خدا ترس مسلمان اپنی اپنی جگہ پر ایک سخت روحانی اذیت محسوس کرے گا جبکہ وہ دیکھے گا کہ اپنے ایمان و ضمیر کی روشنی میں جس چیز کو وہ حرام سمجھتا ہے قانون ملکی کے تحت اس کو اس چیز کا ارتکاب کرنا پڑ رہا ہے اور اس تحکم کے ساتھ کہ اب یہی اسلام ہے۔

ہماری یہ گزارشات تو صدر ریاست کی خدمت میں تھیں۔ اب ہم آخر میں مولانا مفتی شفیع صاحب دیو بندی، مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، مولانا داؤد صاحب غزنوی، مولانا ابوالحسنات صاحب، علامہ حافظ کفایت حسین صاحب اور مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب

مودودی سے یہ گزارش کریں گے کہ یہ حضرات ایک وفد کی شکل میں صدر ریاست سے ملاقات کریں اور ان کے سامنے اس مسئلہ کے سارے پہلوؤں کو رکھیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس کے نتائج نہایت عمدہ ہوں گے۔ اور اگر خدانخواستہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو کم از کم ان کی طرف سے حقِ نصیحت و خیر خواہی تو ادا ہو جائے گا۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اپریل ۱۹۶۰ء)

ہندو پاک جنگ کا سبق

بھارت نے بزعم خود بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے پاکستان پر جو جنگ مسلط کی ہے خدا کا شکر ہے کہ وہ ہر پہلو سے پاکستان کے لیے رحمت و برکت اور ہندوستان کے لیے مصیبت و ہلاکت ثابت ہو رہی ہے۔ اگرچہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا ہر صفحہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار ایمان پرور نشانیوں سے نورانی ہے لیکن اس جنگ میں نصرت الٰہی نے اپنے جو کرشمے دکھائے ہیں وہ اسلام کی تاریخ میں ایک نئے روشن باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو آج اس نئے باب کے لیے اپنی قربانیوں اور جاں بازیوں سے مواد فراہم کر رہے ہیں اور خوش بخت ہوں گے وہ مورخ جو آئندہ نسلوں کے لیے اس پر فخر باب کو مرتب و مدون کریں گے۔ درحقیقت تاریخ انسانی کے اسی طرح کے ابواب ہیں جن سے تاریخ تاریخ کہلانے کی مستحق بنتی ہے ورنہ اس کی حیثیت قصوں اور کہانیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر کیجیے کہ اس نے بھارت کو اس امر کا ذریعہ بنایا کہ آپ کے دبے ہوئے جوہر نمایاں ہوں اور اسلحہ اور تعداد کی کثرت پر عزم و ایمان کی برتری کا حیرت انگیز معجزہ دنیا آپ کے ہاتھوں ایک مرتبہ اور دیکھ لے!

بھارت نے یہ جنگ ہمارے خلاف اس لیے چھیڑی ہے کہ ہم کشمیر کے مظلوم اور ستائے ہوئے مسلمانوں کے حامی ہیں۔ ہم جس دین کے پیرو ہیں اس کے صحیفہ آسمانی

کی تعلیم کی رو سے تو ہم پر یہ واجب تھا کہ ہم اپنے مستضعف اور مظلوم کشمیری بھائیوں کی آزادی اور ناموس کی حفاظت کے لیے از خود پہل کرتے لیکن اگر بین الاقوامی معاہدات کے لحاظ میں ہم ایسا نہیں کر سکتے تھے تو بھارت نے یہ بڑا نیکی کا کام کیا کہ وہ خود ہماری سرحدوں پر اپنی فوجیں لے کر چڑھ دوڑا اور اس طرح اس نے ہمارے لیے اپنے مظلوم بھائیوں کی امداد اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے جہاد کی راہ کھول دی۔ سو شکر کیجیے اپنے پروردگار کا کہ آپ اس وقت اپنے دین کا وہ فرض ادا کر رہے ہیں جس سے بڑا کوئی فرض نہیں! یہی وہ اصلی فرض ہے جس کے لیے درحقیقت امت محمدیہ کی بعثت ہوئی ہے، اسی فرض کی ادائیگی پر اس امت کی اصل ایمانی زندگی کا انحصار ہے، یہی راہ اس شہادت کی اصلی راہ ہے جس پر چلنے والے شھداء اللہ فی الارض کے لقب کے حقدار بنتے ہیں۔ دوسروں کے لیے یہ راہ موت کی راہ ہو لیکن ہماری زندگی کی ابدی بہشت اسی شاہراہ پر ہے۔ اس راہ میں موت ڈھونڈنے والے ہی اس سرچشمہ حیات و بقا تک پہنچتے ہیں جس سے اجتماعی و ملی زندگی کی کشت کو حقیقی سیرابی حاصل ہوتی ہے۔

تائید الٰہی کے کتنے مظاہر ہیں جو آج ایک عام آدمی کو بھی نظر آ رہے ہیں اور اگر ہم کو اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پر پورا پورا بھروسا ہے تو ان شاء اللہ بہت جلد وہ گھڑی آ جائے گی کہ قدرتِ الٰہی جریدۂ عالم پر آپ کی عظمت کا ایک ایسا پائدار نقش قائم کر دے گی جو کبھی نہ مٹ سکے گا۔

سب سے پہلی چیز تو یہ دیکھیے کہ دشمن نے اگرچہ نہایت عیاری کے ساتھ حملہ کیا لیکن اس نے ہمارے محافظوں کو غافل نہیں پایا۔ بلکہ ہر محاذ پر اس سے نمٹنے کے لیے ہماری بہادر فوجیں اس کو مستعد ملیں۔ دشمن نے اپنے زعم کے مطابق اپنی پسند کے محاذ انتخاب کیے تھے لیکن ہماری فوجوں کے ہاتھوں اس کو ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی اور چند دنوں ہی کے اندر اندر اس کی فوجی طاقت کو ایسا نقصان پہنچ چکا ہے جس کی تلافی ایک مدت تک ناممکن ہو گی۔ یہ محض تائید الٰہی کا کرشمہ ہے کہ ایک کثیر التعداد دشمن کو ہماری فوجوں نے اپنی تعداد

کی کمی کے باوجود پامال کر کے رکھ دیا اور دنیا پر یہ حقیقت ایک مرتبہ اور ثابت کر دی کہ اصل طاقت تعداد کی طاقت نہیں ہے بلکہ حق اور سچائی کی طاقت ہے۔ جو لوگ حق کی حفاظت و حرمت کے لیے سرفروشی کے سچے جذبے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اللہ کے فرشتے ان کی تائید و نصرت کے لیے اترتے ہیں اور وہ ہر محاذ پر کامیاب و فتح مند ہوتے ہیں۔

دوسری چیز جو آج ہر شخص کو حیرت میں ڈال دیتی ہے **جہاد بالمال اور جہاد بالنفس** کا وہ جذبہ ہے جس سے ہماری قوم کا ایک ایک فرد آج سرشار ہے۔ ہماری فوج کے سپاہی جس شجاعت و پامردی سے لڑ رہے ہیں، ملک کے عام شہری جس فیاضی سے اپنے مال پیش کر رہے ہیں، نوجوان جس جوش سے اپنے خون دے رہے ہیں، لوگ جس طرح جہاد میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری پچھلی تاریخ از سرِ نو عود کر آئی ہے۔ جس قوم میں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کا وہ جذبہ موجود ہو گا جو آج ہمارے اندر نمایاں ہے وہ قوم کبھی کسی دشمن سے شکست نہیں کھا سکتی، اگرچہ دشمن کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور اگرچہ وہ کتنے ہی اسلحہ کیوں نہ اکٹھے کر لے! اس جذبے کو پیدا کرنے کے لیے قوم کے مخلصین تمنائیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کا شکر کیجیے کہ حالات کی ایک ہی کروٹ نے پوری قوم کے اندر جہاد کی ایک لہر دوڑا دی ہے اور اب ہماری قوم ایک ایسی قوم بن گئی ہے جس نے پاکستان کے قیام کے اصلی مقصد کو سمجھ لیا ہے۔ یہی جوش و جذبہ ان شاء اللہ ہماری آئندہ نسلوں کو منتقل ہو گا اور ہماری تاریخ ایک نئے دور سے آشنا ہو گی۔

ہمارے لیے یہ امر بھی موجب مسرت ہے کہ اس جہاد میں نہ صرف مسلمان حکومتوں کی بلکہ پوری انسانی دنیا کی اخلاقی تائید پاکستان کو حاصل ہے۔ اس کرۂ ارض کی کوئی قابلِ ذکر قوم آج ایسی نہیں ہے جو بھارت کے موقف کی کھلم کھلا تائید کرنے کے لیے تیار ہو۔ یہاں تک کہ جن کی ہمدردیاں بھارت کے ساتھ ہیں وہ بھی اس معاملے میں اس کی

دھاندلی کی حمایت کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کسی سچائی کے حق میں یہ اعتراف عام بجائے خود ایک عظیم شہادت اس کی فتح مندی کی ہے۔ ایسی سچائی دنیا میں کبھی شکست نہیں کھاتی۔ مبارک ہے وہ قوم جو ایک ایسی عالم گیر صداقت کا علم لے کر اٹھے اور اس کے تحفظ کے لیے جان و مال کی قربانیاں پیش کرے۔ ایک ایسی ہی قوم کا یہ منصب ہے کہ وہ مستقبل میں دنیا کی قوموں کی امامت اور حق و عدل کے معاملات میں ان کی رہنمائی کرے۔ دنیا میں مسلمانوں کی ہمیشہ یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ جب بھی جہاد کے لیے اٹھے ہیں کسی ایسے مقصد ہی کے لیے اٹھے ہیں جس کے حق ہونے سے ان کے دشمن بھی انکار نہیں کر سکے ہیں۔ یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے جہاد نے ہمارے دین میں نہ صرف ایک عبادت کا بلکہ ایک عظیم عبادت کا درجہ حاصل کر لیا۔ فساد فی الارض کے اس دورِ ظلمات میں اگر اللہ تعالیٰ نے ہماری قوم کو یہ توفیق بخشی کہ وہ اس حق کی روایت پھر تازہ کرے تو یہ اس دنیا کے حق میں ایک فالِ نیک ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس واقعہ سے دنیا کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہو اور یہ دنیا پھر اس امن و عدل سے ایک مرتبہ معمور ہو جائے جس سے اسلام نے اس کو معمور کیا تھا۔

اپنی اجتماعی زندگی کی یہ سب سے بڑی بازی کھیلتے ہوئے ہم میں سے ہر شخص کو، ہر وقت، چند باتیں اپنے پیشِ نظر رکھنی چاہئیں:

ایک یہ کہ اصل اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہیے نہ کہ وسائل و ذرائع پر! وسائل و ذرائع اسی وقت کام دیتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت شاملِ حال ہوتی ہے۔ جہاں تک وسائل و ذرائع کا تعلق ہے بھارت ہم پر بدرجہا فوقیت رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ ہر محاذ پر ہم سے پٹ رہا ہے اور اس کے وہ وسائل و ذرائع جن پر اس کو اعتماد تھا، ہمارے مجاہدین کے کام آ رہے ہیں۔ عزت و ذلت، فتح و شکست اور ضعف و قوت سب خدا کے اختیار میں ہے اس وجہ سے جتنا اعتماد اپنی تدبیروں پر ہو اس سے کہیں زیادہ اعتماد اپنے رب پر ہونا چاہیے۔ اس اعتماد کی راہ یہ ہے کہ جو قدم بھی اٹھایا جائے حق کی سربلندی

اور خدا کی رضا کے لیے اٹھایا جائے اور اسی کے احکام و ہدایات کے تحت اٹھایا جائے۔ ہر مرحلے میں خدا کو یاد رکھا جائے اور ہر گام پر اسی سے استعانت کی جائے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی گردنیں دشمن کے مقابل میں تو بے شک تنی ہوئی رہتی ہیں لیکن اپنے رب کے آگے ہمیشہ جھکی ہوئی رہتی ہیں۔ مسلمان مجاہدین کی تعریف یہ بیان ہوئی ہے کہ ھم باللیل رھبان و بالنھار فرسان۔ شب زندہ داری اور جان بازی کا یہی امتزاج ہے جو مسلمان مجاہدین کو دوسرے جنگ جوؤں سے ممتاز کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس وقت تک ہم نے اپنے بڑوں اور چھوٹوں کے، اس سلسلے میں، جو بیانات و اعلانات پڑھے ہیں سب میں خدا پرستی کی وہ روح موجود ہے جو مومن کے شایانِ شان ہے۔ ہماری بری، بحری اور فضائی افواج نے جو کارنامے انجام دیے ہیں بلاشبہ وہ نہایت قابلِ فخر ہیں لیکن ہمارے ذمہ داروں نے ان کارناموں کا ذکر کرتے وقت ہمیشہ اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ یہ کامیابیاں ہمیں اس وجہ سے حاصل ہوئی ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔ یہی اصل حقیقت ہے جو ہمیشہ ہر شخص کے سامنے مستحضر رہنی چاہیے۔ اسی حقیقت کے تذکر سے دماغوں اور دلوں کے اندر وہ طاقت ابھرتی ہے جس کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اور اسی کی یادداشت سے اللہ تعالیٰ کی وہ معیت حاصل ہوتی ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد بندہ ہر چیز سے بے نیاز و مستغنی ہو جاتا ہے۔ قرآن میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ جو لوگ اللہ کی رضا جوئی کو اپنا نصب العین بنا کر جہاد کے لیے نکلتے ہیں اللہ کے فرشتے ان کے ہم رکاب ہوتے ہیں۔ اللہ کی یہ تائید جس طرح بدر و احزاب کے مجاہدین کو حاصل ہوئی اسی طرح ہمیں بھی حاصل ہوگی اگر ہم اللہ کی رضا اور حق کی حفاظت کے لیے اٹھے ہیں!

اللہ تعالیٰ کے اعتماد کے ساتھ دوسری چیز جو اس راہ میں مطلوب ہے وہ صبر ہے۔ صبر کے معنی عزیمت و استقامت کے ہیں۔ اس راہ میں جو آزمائشیں بھی پیش آئیں، خواہ وہ چھوٹی ہوں یا بڑی، پورے عزم و جزم کے ساتھ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیجیے۔ جنگ کے

دوران میں جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ صرف میدان میں لڑنے والے سپاہیوں ہی تک محدود نہیں رہتیں۔ بلکہ ان کے اثرات قوم کے ہر چھوٹے بڑے تک متعدی ہوتے ہیں، کسی نہ کسی شکل میں سب کو ان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس صبر کی بھٹی سے گزرنے کے بعد ہی کوئی قوم دنیا میں باعزت زندگی گزارنے کی حقدار بنتی ہے۔ جو قوم صبر کی خوگر نہیں ہے وہ قوم کبھی اپنی آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ یہ صبر بہت وسیع پیمانے پر مطلوب ہے۔ ہمارے ہر چھوٹے بڑے، شہری و دیہاتی، عالم اور عامی کو اس کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ تلخ سے تلخ گھونٹ بھی پینے پڑیں تو شہد و شکر کی طرح پیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے اجتماعی زندگی کی تمام سرفرازیاں اسی صبر کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہیں۔ اس کسوٹی پر اللہ تعالیٰ ہر قوم کو پرکھتا ہے۔ اس آزمائش کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک خاص پیمانہ ہے جو ہماری صلاحیتوں کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہے۔ اس وجہ سے کوئی آزمائش کبھی ہماری قوت سے زیادہ نہیں ہوتی اور مقصود اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ ہماری صلاحیتیں اجاگر ہوں اور ہمارے دبے ہوئے جوہر بروئے کار آئیں۔ یہ چیز اس ہمہ گیر تربیت کا ایک جزو ہے جو قدرت نے اس دنیا کے لیے مقدر کر رکھی ہے، اسی وجہ سے ہر مرحلے میں خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ یہ چیز ڈرنے اور گھبرانے کی نہیں بلکہ زندگی کی تمام مطلوبات کی طرح اختیار کرنے اور اپنانے کی ہے۔ اس کے بغیر کسی قوم کو اللہ کی معیت نہیں حاصل ہوتی۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۔

ایک اور چیز جو ایسے حالات میں مطلوب ہے، وہ پوری قوم کی یکجہتی و یکسوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ چیز اس وقت ہمیں بدرجہ کمال حاصل ہے۔ اس وقت جس شخص کے ہاتھ میں قیادت کی باگ ہے اس پر پوری قوم کو پورا پورا اعتماد ہے۔ جن لوگوں کو کچھ نظریاتی اختلافات تھے اب انہوں نے بھی اپنے ان اختلافات کو فراموش کر کے اپنی خدمات اس کے حوالہ کر دی ہیں۔ اس وقت صدر ایوب کو اس ملک میں جو اعتماد حاصل ہے وہ قائدِ اعظمؒ کے سوا اس ملک میں کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ پوری قوم ان کے ساتھ اور

دل و جان سے ساتھ ہے۔ ان کی فہم و فراست اور ان کی جرأت و بسالت پر سب مطمئن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہترین کمانڈر بھی دیے ہیں اور بے نظیر فوج بھی! حالات کی سازگاری شہادت دیتی ہے کہ جس طرح مشیتِ الٰہی نے قائدِاعظم کو پاکستان کے قیام کا واسطہ بنایا اسی طرح مشیتِ الٰہی صدر ایوب کو پاکستان کے استحکام کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے۔ پاکستان قائم تو ہو گیا تھا لیکن ابھی اس کے استحکام کا کام باقی تھا۔ یہ ضروری کام اللہ تعالیٰ کی عنایت سے صدر ایوب کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے اور ہمیں امید ہے کہ پاکستان اب اتنا مضبوط ہو جائے گا کہ اس کے دشمن اس سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں گے۔ ہر پاکستانی کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بھارت کی ہمارے ساتھ دشمنی کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بھارت کی طرف سے ایک فطری چیز ہے۔ بھارت ہمیشہ ہمارا دشمن رہے گا۔ الا آنکہ وہ ہماری طاقت سے اتنا مرعوب ہو جائے کہ ہمارے ساتھ مجاملت کا رویہ برتنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ چیز صرف اسی شکل میں ممکن ہے جب ہماری قومی سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار بن جائے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے یہ چیز حاصل ہے اور اگر پاکستان کو عزت کے ساتھ قائم رہنا ہے تو یہ چیز ہر حالت میں باقی رکھنی پڑے گی۔ ہماری ہر وقت یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صدر ایوب کو ہر قدم پر رہنمائی فرمائے اور ان کے ہاتھوں پاکستان کے استحکام کا کام تکمیل کو پہنچے۔

ہمارے نزدیک ایک اچھی حکومت کے لیے صرف دو چیزیں مطلوب ہیں۔ ایک قوت، دوسری عدل! قوت کا اصل منبع سچا اور پکا ایمان ہے اور عدل کا منبع خدا کی شریعت! حضرت عمرؓ کی حکومت ان دونوں ہی چیزوں کا مظہر اتم تھی۔ ہم پاکستان میں یہی دو چیزیں دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ ان کے سوا ہمیں کسی چیز کی آرزو نہیں ہے۔ پاکستان اتنا مضبوط ہو کہ جو اس سے ٹکرائے وہ پاش پاش ہو کے رہ جائے اور اس میں عدل کا وہ نظام ہو کہ اس کے نظامِ عدل کو دیکھ کر اس کے مخالف بھی پکار اٹھیں کہ اسی عدل پر آسمان و زمین قائم ہیں! صدر ایوب کو اللہ تعالیٰ نے اس پوری قوم کا جو اعتماد بخشا ہے اس اعتماد کا حق یہی ہے کہ وہ

پاکستان کو ان دونوں پہلوؤں سے ایک مثالی حکومت بنا دیں۔ اگر یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پا گیا تو جس طرح ہماری آئندہ نسلیں قائدِاعظم کو فراموش نہ کر سکیں گی اسی طرح صدر ایوب کو بھی فراموش نہ کر سکیں گی۔ مستقبل کے مؤرخ اس امر کا اعتراف کریں گے کہ قائدِاعظم نے پاکستان کو قائم کیا اور صدر ایوب نے اس کو عدل کی اساس پر اس طرح مستحکم کیا کہ کسی بڑی سے بڑی طاقت کے لیے بھی اس کا ہلانا ممکن نہیں رہا!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء)

مقالہ ۲۲

اقلیتوں پر ظلم کے لیے ردِ عمل کا فلسفہ

بھارت کی حکومت اپنی مسلم اقلیت کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت میں جس بری طرح ناکام رہی ہے اگرچہ یہ بجائے خود تاریخ کی ایک نہایت المناک حقیقت ہے لیکن اس ناکامی سے بھی زیادہ المناک حقیقت یہ ہے کہ بھارت کے لیڈروں کو اپنی اس ناکامی کا کوئی احساس نہیں ہے۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ تقسیم ملک کے بعد سے برابر سولہ سترہ سالوں میں جو کچھ ہوا ہے اور آج جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب بڑی آسانی کے ساتھ پاکستان کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہاں کا بڑے سے بڑا لیڈر بھی یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے پاکستان میں ہونے والے فلاں اور فلاں واقعات کا 'ردِ عمل' ہے۔

اگرچہ ردِ عمل کا یہ فلسفہ ہمارے نزدیک بالکل شیطانی فلسفہ ہے اور ہم یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو، راج گوپال اچاریہ، جے پرکاش نرائن اور بھارت کے موجودہ فلسفی صدر جیسے لوگوں کے جیتے جی یہ شیطانی فلسفہ گاندھی جی کے فلسفہ پر عین ان کے ملک میں، انھی کے نام لیواؤں کے ہاتھوں، اس طرح غالب آجائے گا۔ لیکن اپنی اس رائے کے باوجود ہم سچائی کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، اگر یہ فی الواقع پاکستان میں ہونے والے واقعات ہی کا ردِ عمل ہوتا تو کم از کم

ہمیں بھارت کے لیڈروں اور اس کی حکومت سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔ ہم اگرچہ ردِ عمل کے اس فلسفہ کو، جیسا کہ عرض کر چکے ہیں، شیطانی سمجھتے ہیں لیکن بہرحال ہم انسانوں کو انسان ہی سمجھتے ہیں، فرشتوں کی جماعت نہیں سمجھتے۔ اس وجہ سے ہم ان سے اس ظلم کو کچھ بعید نہیں خیال کرتے کہ وہ پاکستان کے مسلمانوں کے قصور کا انتقام بھارت کے مسلمانوں سے لیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ صورتِ حال یہ نہیں ہے اور بھارت کے لیڈر اچھی طرح جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بہت بڑے ظلم کے لیے یہ ایک نہایت ہی کمزور بہانہ تلاش کیا ہے۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ تقسیم کے بعد سے اکا دکا واقعہ پاکستان میں بھی فساد کی نوعیت کا پیش آیا ہے لیکن ان اکا دکا واقعات کو کیا نسبت ہے مظالم اور تباہیوں کے اس غیر منقطع اور لامتناہی سلسلہ سے جس میں بھارت کی مسلم اقلیت کو مبتلا کر دیا گیا ہے؟ یہاں کوئی ایک واقعہ بھی اس نوعیت کا کبھی پیش نہیں آیا جس نوعیت کے واقعات وہاں علی گڑھ، جبل پور، سنبھل، آسام، بہار اور کلکتہ وغیرہ میں ابھی حال ہی میں پیش آچکے ہیں۔ اور تازہ اطلاع اسی قسم کے یک طرفہ ظلم کی بلند شہر کے متعلق آئی ہے۔ صرف تعداد ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ واقعات کی سنگینی کے لحاظ سے بھی دیکھیے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ابھی حال ہی میں کلکتہ اور اس کے اطراف میں درندگی، سفاکی، بہیمیت اور حرث و نسل کی جو بربادی اکثریت کے ہاتھوں ظہور میں آئی ہے وہ پاکستان کے کسی واقعہ کا ردِ عمل ہے۔ آخر اس نوعیت کا واقعہ پاکستان کے کس خطہ میں پیش آیا؟

ہر شخص جانتا ہے کہ ہم پاکستان کی حکومت کے مداحوں میں نہیں بلکہ اس کے نقادوں میں ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں ہم حکومت پاکستان کی زیادہ سے زیادہ تعریف کریں گے کہ وہ اقلیتوں کے تحفظ کے معاملہ میں بہت نیک نیت اور مستعد ہے۔ اول تو یہاں ایسے واقعات پیش آئے ہی بہت کم، اور اگر کبھی کوئی واقعہ پیش آیا بھی تو حکومت نے فوراً حالات کو قابو میں کر لیا۔ یہاں کے لیڈروں نے کبھی اس عذر کو اپنے لیے سپر نہیں بنایا کہ یہ بھارت کے واقعات کا ردِ عمل ہے۔ یہاں کی عام فضا اقلیتوں کے حق میں بھارت کی فضا

سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں کے عوام میں اقلیتوں کے خلاف کوئی ادنیٰ تعصب بھی نہیں پایا جاتا۔ یہاں کی سیاسی پارٹیوں میں بھی کوئی پارٹی ایسی نہیں ہے جو ہندوؤں یا کسی غیر مسلم اقلیت کے خلاف کوئی معاندانہ جذبہ رکھتی ہو۔ ان معاملات میں سب سے زیادہ تنگ نظری کا الزام مذہبی جماعتوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں کسی جن سنگھ کا وجود نہیں ہے! اقلیتوں کے معاملے میں اسلام کی تعلیم بھی بہت واضح ہے اور مسلمان اپنی عام دینی غفلت کے باوجود اس بات کو بھولے نہیں ہیں کہ ان کے پیغمبر ﷺ نے ان کو بڑی تاکید کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری لمحات مبارک میں یہ نصیحت فرمائی ہے کہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ کی طرف سے ہے۔ اس وجہ سے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اس ذمہ داری میں کوئی خلل پیدا کرے۔ نیز مسلمانوں کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر اقلیتوں کے ساتھ انہوں نے کوئی بدعہدی اور زیادتی کی تو قیامت کے دن خدا کی عدالت میں خود محمد رسول اللہ ﷺ ان اقلیتوں کے وکیل ہوں گے۔ اسلام کی ان تعلیمات کا اور تاریخ کی روشن روایات کا یہ اثر ہے کہ پاکستان کی مذہبی جماعتوں میں سے بھی کوئی جماعت غیر مسلموں کے خلاف کوئی تعصب نہیں رکھتی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کا وہ کون سا عمل ہے جس کا ردِعمل بھارت میں آئے دن مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی عزت و آبرو کی بربادی کی شکل میں ہو رہا ہے!

ہم یہ بات بھی پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ پاکستان کے اندر شاید ایک مسلمان بھی ایسا نہ ملے جو عمل اور ردِعمل کے اس شیطانی فلسفہ پر اعتقاد رکھتا ہو جس پر بھارت کے لیڈروں کا ایمان ہے۔ یہ فلسفہ اسلامی شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ ہمارے ملک میں جو غیر مسلم اقلیتیں ہیں وہ صرف اپنے قول و فعل کی ذمہ دار ہیں، دوسروں کے قول و فعل کی کوئی ذمہ داری ہم ان پر نہیں ڈالتے۔ وہ اگر ملک کے قانون کی پابند اور ریاست کی وفادار ہیں تو حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کے جان و مال اور ان کے شہری حقوق کی

ہر قیمت پر حفاظت کرے، اس بات سے ان کی عرفی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا کہ کلکتہ میں ان کے ہم مذہبوں نے ہمارے اسلامی بھائیوں کا قتل عام کیا۔

اگرچہ ہم یہ توقع نہیں رکھتے کہ بھارت کے لیڈروں کی سمجھ میں ہماری کوئی بات آسکے گی تاہم حقیقت کا اظہار ایک فرض انسانی ہے اس وجہ سے ہم عرض کرتے ہیں کہ قومی جرائم پر 'ردِعمل' کا پردہ ڈال کر ان کو ہلکا دکھانا اپنے ضمیر کو موت کی نیند سلانا اور اپنی قوم کو ایسا زہر پلانا ہے جس سے پوری قوم پاگل ہو جائے۔ حکمرانی ایک عظیم ذمہ داری ہے جس کی بنیاد عدل پر ہے۔ ہر حکومت کا یہ ابتدائی فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ہر طبقہ کے لیے امن، عدل اور قانونی انصاف کی ضمانت فراہم کرے۔ اسی سے حکومت کے قیام کے لیے جواز پیدا ہوا ہے اور اسی کو فراہم کرنے کی خاطر خدا نے، جو آسمان و زمین کا حقیقی حکمران ہے، اپنے نظام میں حکومت کے لیے ایک مقام تسلیم کیا ہے۔ اگر کوئی حکومت اپنی رعایا کے لیے امن و عدل فراہم نہیں کرتی تو وہ اپنے وجود کی ضرورت کی خود نفی کر دیتی ہے اور اس کے بعد قدرت اس حکومت کے وجود سے اپنی زمین کو پاک کر دیتی ہے۔ اس معاملے میں قدرت بالکل بے لاگ واقع ہوئی ہے۔ اس کی میزان نے اپنے فیصلہ میں کبھی امتیاز نہیں برتا ہے اور آئندہ بھی وہ کبھی امتیاز نہیں برتے گی، خواہ معاملہ بھارت کا ہو یا پاکستان کا!

عدل کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ کوئی اضافی صفت نہیں ہے کہ ہندو کے لیے آپ عادل ہوں اور مسلمانوں کے لیے غیر عادل۔ جو شخص ایک کے لیے غیر عادل اور ظالم ہے وہ سب کے لیے غیر عادل اور ظالم ہے۔ میں بحیثیت مسلمان کے یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اگر میں ایک غیر مسلم کے ساتھ انصاف نہیں کرتا تو اپنے باپ بھائی کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت جس طرح انفرادی دائرے میں حقیقت ہے اسی طرح اجتماعی دائرے میں بھی حقیقت ہے۔ جو قوم مسلمانوں کے ساتھ عدل نہیں کر سکتی اس کے افراد خود اپنے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکیں گے اور جس طرح مسلمانوں کے لیے آپ کے پاس ردِعمل کا عذر ہے اسی طرح ان میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی عذر ہاتھ آجائے گا جس

کے پردے میں وہ اپنے ہر ظلم کو ثواب بنا لے گا۔ اس وجہ سے ہم بھارت کے لیڈروں سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کے لیے بدآموزی کی یہ راہ نہ کھولیں۔ اس کا ہمیں تو جو نقصان پہنچے گا وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ خدانخواستہ بھارت میں مسلمان ختم ہو جائیں گے۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ قدرت کے قانون کی رو سے بھارت کی حکومت اپنے مقصدِ وجود کی نفی کر دے گی۔ ہم یقین رکھتے ہیں اور اس یقین کے لیے ہمارے پاس نہایت مضبوط دلائل ہیں کہ اگر گاندھی جی اس دنیا میں پھر آ جائیں تو وہ اپنی قوم کو اس راستہ پر ہرگز جانے کی اجازت نہ دیں گے اگرچہ انہیں اس کی سزا میں کسی اور گوڈسے کے پستول سے دوبارہ مرنا ہی کیوں نہ پڑے! ہم ازراہِ محبتِ انسانی یہ آرزو رکھتے ہیں کہ کاش گاندھی جی کے نام لیواؤں میں کوئی شخص ایسا اٹھتا جو مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ خود اپنی قوم کو اس زہر ہلاہل سے بچانے کی خاطر جان کی بازی کھیل سکتا!

ہم اس امر واقعی کا اظہار و اعلان بھی برملا کرتے ہیں کہ پاکستان کے مسلمان بھارت کے مسلمانوں کے معاملات سے کبھی اپنے آپ کو بے تعلق نہیں کر سکتے۔ ان کے ساتھ ہمارا ایمانی رشتہ بھی ہے اور خونی رشتہ بھی! ان دو دو مضبوط رشتوں کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان سے اور ان کے حالات و مسائل سے بالکل بیگانہ بنالیں۔ اسی طرح ہم یہ توقع بھی نہیں رکھتے کہ بھارت کے ہندو پاکستان کے ہندوؤں کے معاملات و مسائل سے بالکل بے تعلق ہو جائیں گے اس لیے کہ ہماری ہی طرح وہ بھی اپنے بھائیوں سے دو دو بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن اس امر واقعی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک امر واقعی ہے کہ بھارت کے مسلمان اور پاکستان کے ہندو اپنی اپنی حکومتوں کی رعایا ہیں۔ ان گوناگوں تعلقات اور ذمہ داریوں کو حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ نباہنے کی بھارت اور پاکستان دونوں کے لیے ایک اور صرف ایک ہی راہ ہے۔ وہ یہ کہ دونوں حکومتیں اپنی اپنی اقلیتوں کو امن، عزت اور عدل کی زندگی فراہم کریں۔ یہ نہایت واضح حقیقت ہے جس کے

سمجھنے کے لیے معمولی عقل بھی کافی ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ پاکستان نے اس حقیقت کو سمجھنے میں ایک دن کی دیر بھی نہیں لگائی۔ ہمیں یاد ہے کہ قائداعظم نے قیامِ پاکستان کے بعد اپنی ابتدائی تقریروں ہی میں نہایت واضح الفاظ میں اس کا اعلان کر دیا تھا۔ اور یہاں کے مسلمانوں نے صدقِ دل سے ان کے اس اعلان کو قبول کر لیا۔ گاندھی جی بھی اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے اور انہوں نے بھی اس کے اظہار و اعلان میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندو قوم نے من حیث القوم اب تک اس حقیقت کو قبول نہیں کیا۔ پاکستان کے قیام سے اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ایک ایسی گرہ پڑ گئی ہے جو کسی طرح کھلتی ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ پاکستان کو تسلیم کرنے پر اپنے دل کو راضی کر سکی نہ مسلمانوں کو اپنے اندر گوارا کرنے کے لیے۔ اسی بات کا یہ نتیجہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا موسم ہمیشہ گرم رہتا ہے اور یہ بات شاید اب تک وہاں بڑے بڑوں کی سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ غصہ اور انتقام کے جذبات وقتی طور پر تو اپنے اندر کچھ جواز کے پہلو، ممکن ہے رکھتے ہوں، لیکن اگر کوئی قوم انہی جذبات کو اپنا کیش و مشرب بنا لے تو عالمِ انسانی کی پوری تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ایسی قوم دوسروں کو بہانے کے بجائے خود ان جذبات کے سیلاب میں بہ گئی ہے۔

اب ہمارے بھارت کے ہندو بھائیوں کو یہ بات مان لینی چاہیے کہ پاکستان ایک حقیقت ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی مان لینی چاہیے کہ ۵ کروڑ مسلمان جو بھارت میں موجود ہیں وہ بھارت کے شہری ہیں اور اکثریت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے حقوق تسلیم کرے اور ان کی حفاظت کرے۔ حقائق اور ذمہ داریوں کو تسلیم کرنے ہی سے قومیں سرخرو ہوتی اور عزت پاتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی قوم حقائق کو جھٹلائے اور ذمہ داریوں کو پامال کرے تو اس سے وہ دوسروں کی راہ میں جتنی مشکلیں پیدا کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ خود اپنی راہ کانٹوں سے بھر دیتی ہے۔ اب پاکستان کی مخالفت کا وقت گزر گیا۔ اب پاکستان اور بھارت دونوں واقعات کی شکل میں موجود ہیں اور دونوں ہی کی

بہبود کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ بنیں اور ان باتوں سے بچیں جو باہمی تعلقات کو خراب کرنے والی ہیں۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ بھارت کے مسلمانوں کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن سے بے تعلق رہنا پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس وجہ سے اگر بھارت میں مسلمان اسی طرح پامال ہوتے رہے جس طرح آج پامال ہو رہے ہیں تو اس کا یہ ردعمل تو ان شاء اللہ ہرگز نہیں ہوگا کہ یہاں کی ہندو اقلیت کو کوئی ضرر پہنچے لیکن یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے کبھی دوست نہ ہو سکیں گے۔ اب یہ بھارت کے لیڈروں کا کام ہے کہ وہ ذہنی توازن کے ساتھ سوچیں کہ یہ عمل اور ردعمل کا خونیں ڈراما ان کے لیے اور ہمارے لیے مفید ہے یا دوستی اور اعتماد کی وہ فضا جس میں دونوں ملک اپنی تعمیری سرگرمیوں میں مصروف ہو سکیں۔

آخر میں ہم بھارت کے مظلوم مسلمانوں سے بھی ایک بات کہنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ ان کی زندگی اور عزت دونوں کی ضمانت ایمان میں مضمر ہے۔ ایمان کے ساتھ زندگی بھی زندگی ہے اور موت بھی زندگی ہے۔ ایمان پر جمے رہنے کی صورت میں مومن مرتا نہیں ہے بلکہ اپنی موت سے ہزاروں لاکھوں زندگیاں پیدا کرتا ہے۔ اصلی طاقت انسانوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا ہاتھ غیر مرئی ہے لیکن ہے بڑا طاقتور! وہ دیر میں نمودار ہوتا ہے لیکن مظلوموں کے لیے نمودار ضرور ہوتا ہے اور جب نمودار ہوتا ہے تو کوئی اس کو روک یا پکڑ نہیں سکتا۔ اس کے نمودار ہونے کا وقت وہ ہوتا ہے جب مومن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا ہے لیکن وہ بے صبر یا مایوس نہیں ہوتا بلکہ اپنے رب اور صرف اپنے رب ہی سے آس لگائے، امید کا دیا جلائے، ناصر غیب سے لو لگائے ایمان پر جما رہتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر بھارت کے مسلمانوں نے ایمان کی حبل اللہ مضبوطی سے تھامے رکھی تو وہ کتنے ہی بے سہارا اور ناتواں کیوں نہ ہوں لیکن یہ رسی بڑی مضبوط ہے، انھیں کوئی طاقت بھی ہلا نہ سکے گی۔ کیا عجب کہ خدا نے تمام جھوٹے سہاروں سے اسی لیے ان کو الگ کیا ہو کہ ان کے لیے تنہا اپنے سہارے کی شانیں دکھائے۔ ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ خدا ہر

آزمائش میں ان کا یار و ناصر ہو!

سب سے آخر میں ہم پاکستان کے مسلمانوں کو وہ بات پھر یاد دلانی چاہتے ہیں جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ انفرادی، اجتماعی اور سیاسی زندگی کے کسی گوشے میں بھی 'ردِ عمل' کا وہ فلسفہ ہمارے لیے رہنما نہیں بن سکتا جو زید کے جرم کا انتقام بکر سے لینے کو جائز ٹھیراتا ہے۔ اس ملک کی اقلیتوں کے ساتھ ہمارا معاملہ اسلام کے اسی اصول پر مبنی ہوگا جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے کہ جب تک وہ ملک کی وفادار ہیں ہم ان کے جان، مال، عزت، مذہب اور حقوق کے محافظ ہیں اور ہماری حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان کی ان ساری چیزوں کی حفاظت کرے اور ملک کی سیاسی زندگی میں ان کو تمام آئینی راستوں سے فائدے اٹھانے کے مواقع بہم پہنچائے۔ یہ صرف سیاست اور جہاں بانی ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ ہر مسلمان اور ہر اسلامی حکومت پر خدا اور رسول کا مقرر کیا ہوا فریضہ ہے اور جو مسلمان بھی اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ اسلامی شریعت کی مخالفت کرے گا اور قیامت کے دن خدا کی عدالت میں اس کے خلاف خود محمد رسول اللہ ﷺ استغاثہ دائر فرمائیں گے۔ اس اصول کے احترام میں اس بات سے کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا کہ بھارت میں مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ بھارت کے ہندوؤں کے کسی فعل کی ذمہ داری بھی ہماری اقلیتوں پر نہیں ہے۔ پاکستان کی حکومت کو اگر بھارت کے مسلمانوں کا درد ہے (اور یہ درد اسلامی رشتے کی بنا پر لازماً ہونا چاہیے) تو وہ حکومتی سطح پر اس سلسلے میں جو قدم مناسب خیال کرے اٹھائے (اور اس پر یہ حق ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے وہ قدم اٹھائے) لیکن یہ بات ہم صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے مذہب کا مطالبہ ہم سے یہی ہے کہ ہمارے ملک کی اقلیتیں جب تک اپنے عہد کی وفادار ہیں ہم پر فرض ہے کہ ان سے کیے ہوئے عہد اور ان کو دی ہوئی ضمانت کے ہم وفادار رہیں!

اس معاملے کا ایک نازک پہلو بھی ہے جس کو خاص طور پر ہر پاکستانی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ بھارت نے چونکہ مسلمانوں پر مظالم ڈھانے کے لیے ردعمل کا بہانہ اختیار

کیا ہے اس وجہ سے اس کا طریقہ یہ ہے کہ پاکستان میں اگر رائی کے برابر بھی کوئی زیادتی کی بات ہو تو وہ اس کو پربت بناتا ہے تاکہ مسلمانوں پر پہاڑ گرانے کے لیے یہ رائی اوٹ کا کام دے سکے۔ اس پہلو سے بھی ہمارے لیے صحیح روش یہی ہے کہ ہم کوئی چھوٹے سے چھوٹا بہانہ بھی ایسا نہ پیدا ہونے دیں جو اسلام کی بدنامی اور ہمارے دینی بھائیوں کی بربادی کے لیے پردے کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ فروری ۱۹۶۴ء)

مقالہ ۲۳

اقلیتوں سے حسنِ سلوک

کلکتہ کے لرزہ خیز واقعات کے بعد ایک ہلکی سی امید بندھی تھی کہ اب شاید بھارت کی قیادت کا ضمیر بیدار ہو اور وہاں گاندھی جی کے نام لینے والوں کے کچھ لوگ اصلاح حال کے لیے آخری بازی کھیل جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ بعد کے حالات نے ہماری آخری امید کا بھی خاتمہ کر دیا! معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی قیادت میں یا تو اصلاح حال کا کوئی ارادہ ہی موجود نہیں ہے یا اس نے حالات کے آگے اب بے بس ہو کر ڈگ ڈال دیے ہیں۔ ان دونوں میں سے جو بات بھی ہو نہایت ہی افسوسناک ہے اور یہ جتنی افسوسناک ہمارے لیے ہے اس سے ہزار درجہ افسوسناک خود بھارت کے لیے ہے!

ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اب صرف خدا کا سہارا باقی رہ گیا ہے۔ حکومت جب خود جانبدار یا بے بس ہو تو نہ حفاظتِ خود اختیاری کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ حکومت سے کسی امید و التجا کا! لیکن خدا کا سہارا جس کا ہم نے حوالہ دیا ہے بہت بڑا سہارا ہے۔ اگر مسلمان اس سہارے کے اعتماد پر تمام دوسرے سہاروں سے بے نیاز و بے پروا ہو گئے تو خدا ان کی نصرت کے لیے خود اتر آئے گا۔

پاکستان کے لیے ایک عظیم اخلاقی فتح حاصل کرنے کا ایک نہایت شاندار موقع

قدرت نے فراہم کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ خواہ بھارت کے مسلمانوں پر کچھ ہی گزر جائے لیکن وہ اپنی اقلیتوں کی ہر قیمت پر حفاظت کرے اور ان میں سے کسی ایک فرد کا بھی بال بیکا نہ ہونے دے۔ اگر پاکستان نے اس میں کامیابی حاصل کر لی، اور ہمیں امید ہے کہ وہ ضرور کامیابی حاصل کرے گا تو اس سے مسلمان قوم کی طویل تاریخ جہاں بانی میں ایک اور نہایت روشن باب کا اضافہ ہوگا۔ بھارت کی سیکولرازم برسر بازار رسوا ہو چکی ہے، اس کے دستور کے تمام تحفظات مسلمانوں کے لیے بے معنی ثابت ہوئے لیکن پاکستان کے لیے پورا موقع باقی ہے کہ وہ دنیا پر ثابت کر دے کہ وہ جس دین کا نام لیوا ہے اس میں رواداری اور اقلیتوں کے حقوق کا کیا مقام ہے۔ یہ چیز دنیا میں بھی پاکستان کے وقار کو بلند کرے گی اور خدا کی نظروں میں بھی پاکستان اور اہل پاکستان کو سرخرو بنائے گی۔ اور چاہنے کی اصلی چیز یہی ہے۔

پاکستان میں داخل ہونے والے مہاجرین کا مسئلہ بھی ان شاء اللہ پاکستان حل کرنے سے قاصر نہیں رہے گا۔ اگر ہمارے دلوں میں اپنے مظلوم دینی بھائیوں کے لیے جگہ ہے تو ان شاء اللہ ہمارے ملک کی زمین ان کے لیے تنگ ثابت نہیں ہوگی۔ وسائل و ذرائع سب خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ ہمارا کام اپنے دلوں کو کشادہ اور حوصلوں کو بلند رکھنا اور اپنے فرائض کو پورے عزم کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ جو لوگ آتے ہیں وہ اپنا مستقبل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل دنیا کا نقشہ کیا ہوگا اور خدائے کارساز کے مخفی ارادے کن شکلوں میں ظاہر ہوں گے!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اپریل ۱۹۶۴)

مقالہ ۲۴

طلبہ کے مسائل اور ان کا حل

ہمارے ملک میں طلبہ کا مسئلہ ایک نازک مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ طلبہ اپنے سارے مسائل خود ہی حل کرنا چاہتے ہیں اور اس کا ذریعہ انہوں نے مظاہرے، سٹرائکیں اور بھوک ہڑتالیں سمجھ رکھا ہے۔ جس کے سبب سے نہ صرف تعلیم کا غیر معمولی نقصان ہو رہا ہے بلکہ آئے دن ایسے ناخوشگوار حالات پیش آ رہے ہیں جن کا مزید جاری رہنا ان طلبہ کی بھی بدقسمتی ہے اور ہماری قوم کی بھی۔

ہماری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ طلبہ سے کسی کو کیا پرخاش ہو گئی ہے؟ اگر کسی کو ان سے پرخاش کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے تو آخر حکومت ہی کی ایسی کیا مت ماری ہوئی ہے کہ وہ ان سے کوئی پرخاش رکھے۔ وہ اگر کوئی ضابطہ اور قاعدہ نافذ کرتی ہے تو بہرحال اس لیے نافذ کرتی ہے کہ اداروں میں نظم اور ڈسپلن کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ اس طرح کی کسی چیز کا مقصود ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ حکومت یا منتظمین تعلیم اقتدار منوانا یا طلبہ کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ کوئی عاقل آدمی اس قسم کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ نظم اور ڈسپلن کے قیام سے اصل فائدہ طلبہ ہی کو پہنچتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ طلبہ کسی قانون کو ضرورت سے زیادہ سخت محسوس کریں لیکن وہ کیوں نہیں محسوس کرتے کہ جن لوگوں نے اس قانون کو نافذ کیا ہے وہ نہ تو ان کے دشمن ہیں اور نہ مصالح اور حالات کے سمجھنے میں ان سے فروتر ہیں۔

تعلیم، تعلیم کی ضروریات، تعلیم کے مراحل، تعلیم کے لیے نصاب، تعلیمی اداروں کے ضوابط اور ان کے امتحانات، نتائج اور ڈگریوں کے شرائط اور مدارج کو سمجھنا اور ان کا فیصلہ کرنا تعلیمی ذمہ داروں کا کام ہے یا طلبہ کا؟ اگر ان میں سے کسی بات کے متعلق طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے زیادہ مفید فلاں بات ہے تو اس کو ادب و احترام کے ساتھ اپنے تعلیمی ذمہ داروں کے سامنے رکھیں اور ان کے فوائد ان کو سمجھائیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ان کی بات میں معقولیت ہوگی تو آخر پڑھے لکھے اور ذمہ دار لوگ معقول بات قبول کرنے سے کیوں انکار کریں گے؟ لیکن بالفرض وہ نہیں مانتے تو طلبہ یہ کیوں خیال نہیں کرتے کہ وہ اپنے سے زیادہ سن رسیدہ، تعلیم یافتہ اور تجربہ کار لوگوں کو اپنی بات کی معقولیت سمجھانے سے قاصر رہے۔ اس وجہ سے ممکن ہے کہ ان کی اپنی ہی رائے غلط ہو۔ اور بالفرض وہ اپنی رائے غلط ماننے پر تیار نہیں تو اس کے لیے آئینی شایستہ اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ ان کی بات میں معقولیت ہوئی تو آج نہیں تو کل مان لی جائے گی۔ لیکن یہ کیوں ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کو بزور منوانے کے لیے مظاہرے اور ہڑتالیں، نعرے اور ہنگامے، پھر توڑ پھوڑ اور لاٹھی چارج اور آنسو گیس تک نوبت آجاتی ہے۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں اگر مضبوط ڈسپلن نہ ہو تو طلبہ کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ 'دیوانہ را ہوئے بس است'۔ جہاں کسی شریر نے انگلی دکھائی اچھے برے سب اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ طلبہ میں بروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ برے تو شاید سو میں دو چار ہوتے ہیں لیکن نوجوانی کی ناتجربہ کاری اور عنفوانِ شباب کے الھڑ پن کی وجہ سے اکثریت کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ فتنوں اور ہنگاموں سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ ظاہر ہے کہ ڈسپلن کے استحکام کے نقطۂ نظر سے اگر کوئی ضابطہ نافذ ہوتا ہے تو اس سے مقصود اچھوں کو نقصان پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ اچھوں کو بروں اور ہنگامہ پسندوں کے شر سے بچانا ہوتا ہے۔ یونیورسٹی آرڈیننس سے ہمارے ان عزیزوں کو بڑی شکایت ہے کہ اس کے تحت حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کسی کی ڈگری روک لے سکتی ہے۔

لیکن، اول تو جہاں تک ہمیں علم ہے، اب تک اس اختیار کے استعمال کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ہے اور پیش آئے بھی کیوں، آخر حکومت کو لوگوں کی ڈگریاں روکنے سے ایسی کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ پھر اس طرح کے قوانین کی ضرورت تو ان چند شریروں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو نہ تو خود چین سے کام کرتے نہ دوسروں کو کام کرنے دیتے ہیں۔ اس طرح کے عناصر ڈگری تو درکنار اس بات کے بھی سزاوار نہیں ہیں کہ کسی تعلیمی ادارے کے پاس بھی پھٹکنے پائیں۔ آخر تعلیمی ادارے شرارت کے اڈے تو نہیں ہیں۔ انہی پر قوم کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے اور ان پر قوم لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرتی ہے۔ حکومت اور تعلیمی کارفرماؤں کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کے ماحول کو حتی الامکان غیر مطلوب عناصر سے پاک رکھیں۔

پھر اگر طلبہ کو کچھ شکایات ہیں تو ان شکایات کو قرینے کے ساتھ پیش کریں۔ ان کی شکایات پر غور کرنے کے لیے صدر ریاست نے خود ایک کمیشن مقرر کر دیا ہے۔ طلبہ کو اس بات سے خوش ہونا چاہیے اور اپنی زحمتیں اور تکلیفیں اس کے سامنے رکھنی چاہئیں۔ اس بات کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ کمیشن طلبہ کی واجبی شکایات کو کیوں اہمیت نہ دے گا اور بالفرض وہ طلبہ کے کسی مطالبے کو اہمیت نہ دے تو آخر طلبہ خود اپنے رویہ پر نظر ثانی کے لیے تیار کیوں نہیں رہتے۔ آخر ہمارے ان عزیزوں کا یہ ذہن کیوں بنتا جا رہا ہے کہ انہیں ساری دنیا سے بدگمانی ہے بجز ان لوگوں کے جو ان کی پیٹھ ٹھونکیں اور ان کے ہر غلط صحیح مطالبہ کی تائید کریں۔ وہ اس بات کے خواہش مند کیوں ہیں کہ ان کی ہر خواہش کے آگے حکومت گھٹنے ٹیک دیا کرے اور ان کے سارے مطالبے بے چون و چرا تسلیم کرلیا کرے۔ آخر وہ کبھی اس پہلو سے معاملے پر کیوں نہیں غور کرتے کہ حکومت کی ذمہ داریاں ان سے زیادہ ہیں اور تعلیمی ذمہ داروں کا وقار و احترام بھی ایک اہمیت رکھنے والی شے ہے۔

عزیز طلبہ تک اگر ہمارا کوئی مشورہ پہنچ سکے تو ہم انہیں نہایت محبت کے ساتھ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی ساری توجہ تعلیم پر مرکوز کریں۔ ان کا لمحہ لمحہ نہایت قیمتی ہے۔ جب تک کوئی ایسی بات ذمہ داروں کی طرف سے نہ ہو جس کی زد براہ راست طلبہ کے ایمان و

اخلاق پر پڑتی ہو (جس کا اندیشہ بہت کم ہے) اس وقت تک وہ بلاوجہ اپنے آپ کو انتشار میں مبتلا نہ کریں۔ طالب علمی کے دور میں ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سیاست سے صرف علمی ونظری حد تک تعلق رکھیں، اپنے ماحول سے باہر کے سیاسی ہنگاموں سے عملاً کوئی تعلق نہ رکھیں۔ ان ہنگاموں میں دلچسپی کے لیے ان کے پاس آئندہ بڑی فرصت ہو گی۔ طالب علمی کے دور میں وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ اپنے ملک وقوم کی کوئی خدمت کرسکیں۔ یہ کام بڑی پتہ ماری، بڑی ریاضت اور کامل یکسوئی کا ہے۔ جو طلبہ طالب علمی کے زمانے میں ہی لیڈری کا دھندا اختیار کر لیتے ہیں وہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے بقول پکنے سے پہلے ہی سڑ جاتے ہیں۔ ہماری قوم کو ایسے سڑے ہوئے لیڈروں کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ قابل اور پختہ کار و پختہ کردار لیڈروں کی ضرورت ہے۔

اپنے مطالبات منوانے کے لیے فاقہ کشی کی رسم جو ہمارے ہاں چل پڑی ہے، اس سے بھی ہمیں شدید اختلاف ہے۔ جب ہم کسی کالج یا یونیورسٹی کے طلبہ کے متعلق یہ سنتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے فاقہ شروع کر رکھا ہے تو ہمیں اس سے روحانی اذیت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بات منوانے کے اس طریقے کو فروغ گاندھی جی کے ذریعے سے ہوا اور اب ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اس نے ایک بلائے عام کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ گاندھی جی ایک بڑے آدمی تھے، اس لیے ان کی ادا نبھ گئی، ورنہ ہے یہ طریقہ بات منوانے کا نہایت نامعقول! ہر حساس آدمی کو کسی کی فاقہ کشی سے، بالخصوص نوجوانوں اور بچوں کی فاقہ کشی سے، نہایت درجہ قلق ہوتا ہے۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ اخبار میں اس نوع کی کسی خبر کے پڑھنے سے بھی دل پارہ پارہ ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا کرے تو اس اذیت سے متاثر ہو کر ایک معقول آدمی ایسے شخص کے کسی نامعقول مطالبے کو کس طرح تسلیم کرے، بالخصوص جبکہ اس مطالبے کو ماننے سے دوسرے بہتوں کی زندگیاں بھی متاثر ہوتی ہوں؟ آخر ایسے شخص میں اور بمبئی کے گداگروں کے اس گروہ میں کیا فرق ہے جو سوال کرتے ہیں اور سوال کے ساتھ اپنے

کپڑوں میں آگ لگا لیتے ہیں کہ اگر ان کا سوال نہ پورا کیا گیا تو وہ جل مریں گے!

ہمارے نزدیک بات منوانے کا یہ طریقہ نامعقول بھی ہے اور غیر اسلامی بھی! اسلامی روایات اور اسلامی تاریخ میں اس کی کوئی مثال ہمیں نہیں ملتی۔ عزیز طلبہ اور طالبات سے بڑی محبت کے ساتھ ہماری یہ گزارش ہے کہ وہ ضد کے اس طریقے کو بالکل چھوڑ دیں۔ لیڈر حضرات اور اخبارات سے بھی ہماری یہ التجا ہے کہ وہ کسی نوعیت سے اس قسم کے کسی اقدام کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔ قطع نظر اس سے کہ بالواسطہ یہ اقدام خودکشی کی حوصلہ افزائی ہے، اس کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے قوم کے کردار میں ایک غلط رجحان نمایاں ہوتا ہے جو غیر عقلی بھی ہے اور غیر مردانہ بھی!

سیاسی پارٹیوں سے ہم نے پہلے بھی گزارش کی ہے اور آج پھر گزارش کرتے ہیں کہ خدارا! وہ طلبہ کو اپنے سیاسی اغراض کا آلہ کار نہ بنائیں۔ اس سے صرف طلبہ ہی کا مستقبل برباد نہیں ہوتا بلکہ پوری قوم کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ تعلیمی پالیسی اور تعلیمی نظام میں جو تبدیلیاں یا اصلاح کسی پارٹی کو مطلوب ہو اس کے لیے وہ جدوجہد کے مناسب طریقے اختیار کرے لیکن ہر سیاسی پارٹی کا اللہ اور قوم سے یہ مضبوط عہد ہونا چاہیے کہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں میں کسی پہلو سے بھی طلبہ کو ملوث نہیں کرے گی اور نہ تعلیمی منتظمین کے بالمقابل طلبہ کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کرے گی۔ اس دوران میں اپوزیشن پارٹیوں کا رویہ طلبہ کے معاملے میں ہم نے نہایت غیر ذمہ دارانہ بلکہ ناعاقبت اندیشانہ دیکھا ہے۔ تعلیمی ذمہ داروں کے مقابل میں غیر ذمہ دار سیاسی طالع آزما جب طلبہ کے ساتھ اظہار ہمدردی کی نمائش کرتے ہیں تو یہ چیز ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جس طرح حقیقی ماں کی تادیبی تنبیہات کے مقابل میں کسی بچے کی سوتیلی ماں نمائشی شفقت کا اظہار کرے۔ اس طرح کی باتیں حالات کو خراب کرتی اور بچوں کے مزاج کو بگاڑتی ہیں۔ طلبہ کو سیاسی اغراض کے لیے اکسانا بچوں کے اغوا سے کم جرم نہیں ہے۔ طلبہ کو عملی سیاست سے الگ ہی رکھنے میں مصلحت ہے، بالخصوص جبکہ قوم کے سامنے موت وزیست کا کوئی مسئلہ بھی درپیش نہ ہو۔

یہ بات کچھ ہمارے سیاسی عدم توازن کی غمازی کرتی ہے کہ ہمارے ہاں ہر مسئلہ نفیرِ عام کا مسئلہ بن جاتا ہے اور ہم ہر کہ ومہ کو اسی کے لیے وقف دیکھنا چاہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ حال سیاسی معاملات میں ان قوموں کا نہیں ہے جن کی ہم سیاست میں تقلید کرتے ہیں۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ مارچ ۱۹۶۵ء)

مقالہ ۲۵

طلبہ کے ہنگامے کیوں!

پچھلے دنوں طلبہ کی طرف سے جو ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، خوشی ہے کہ حکومت نے اپنے حسنِ تدبیر سے اس پر قابو پا لیا اور حالات زیادہ خراب ہونے نہ پائے۔ مزید خوشی اس بات سے ہوئی کہ ایک وقتی جوش کے بعد طلبہ میں بھی سعادت مندی کا احساس بیدار ہوا اور وہ بھی اپنے اصلی، کام — پڑھنے پڑھانے میں لگ گئے۔ لیکن ہمیں اصلی خوشی اس وقت ہوگی جب ہمارے اربابِ اقتدار اور اربابِ تعلیم وہ طریقہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس سے اس قسم کے ناگوار ہنگاموں کا مستقلاً سدِ باب ہو جائے۔ اس معاملہ پر غور کرنے میں اگر پوری دوربینی سے کام نہ لیا گیا اور وقتی سکون کو مسئلہ کا مستقل حل سمجھ لیا گیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ ہمارے ملک کے کالج اور یونیورسٹیاں بھی اسی بحران سے دوچار ہو کر رہیں گے جس بحران سے اس وقت ہمارے پڑوسی ملک 'بھارت' کے کالج اور یونیورسٹیاں دوچار ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مسئلہ کے مستقل حل کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے اربابِ تعلیم، ہمارے طلبہ اور ہمارے اربابِ سیاست سب اپنے اپنے زاویہ نگاہ میں کم از کم جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، بنیادی تبدیلیاں کریں اور ان تبدیلیوں کو جلد سے جلد عمل میں لانے کی کوشش کریں۔

عزیز طلبہ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ طالب علمی درحقیقت ایک قسم کی درویشی ہے

جس کے حقوق بڑی ریاضت اور بڑی پتہ ماری سے ادا ہوتے ہیں۔ یہ دور قیادت و سیادت کا نہیں ہوتا بلکہ تسلیم و اطاعت کا ہوتا ہے اور ایک کامیاب و بامراد طالب علم وہی ہوتا ہے جو زندگی کے اس دور میں تمام ترغیبات سے منہ موڑ کر اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم و تربیت پر مرکوز رکھتا ہے۔ ایسے ہی طلبہ مستقبل کی امیدوں کے مرکز و مرجع ہوتے ہیں اور وہی آگے چل کر زندگی کے مختلف شعبوں اور میدانوں میں قوم و ملت کی کسی خدمت کے لائق بننے اور اس کی توفیق پاتے ہیں۔ جو طلبہ اس درویشی کی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتے وہ قبل از وقت مختلف ترغیبات کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس طرح اپنی تمام صحت و توانائی ضائع کر کے بالآخر اپنی قوم اور اپنے وطن کے لیے ایک بار بن کر جیتے ہیں۔

اسی طرح طلبہ کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ استاد اور شاگرد کا رشتہ اجیر اور مستاجر کا رشتہ نہیں بلکہ باپ اور بیٹے یا مرشد و مسترشد کا رشتہ ہے۔ ہماری مشرقی اور اسلامی روایات تو اس رشتہ کے احترام میں بڑی ہی سخت رہی ہیں۔ ہمارے ہاں تو جس نے کسی کو کوئی بات بتا دی یا سکھا دی زندگی بھر کے لیے اس کے حقوق قائم ہو جاتے تھے اور ان حقوق کا ہمیشہ احترام کیا جاتا تھا، عام اس سے کہ جو بات سکھائی گئی ہے وہ دین و اخلاق کی کوئی بات ہے یا معاش و معیشت کی، اور سکھانے والا کوئی ہندو، پارسی، عیسائی ہے یا مسلمان! یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی کو کشتی کا کوئی پیچ یا بنوٹ کا کوئی ہاتھ بھی بتا دیتا تھا تو سیکھنے والا زندگی بھر اس کو گرو اور استاد مان کر اس کا احسان اٹھائے پھرتا تھا۔ ہم نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اس کی روایات یہی تھیں اور ہم خود اس کے شاہد ہیں۔ مجھے کسی زمانے میں ایک ماسٹر صاحب نے ہندی کی کچھ حرف شناسی کرائی تھی، ان کی سکھائی ہوئی ہندی تو میرے ذہن و دماغ سے اب بالکل حرف غلط کی طرح نکل گئی لیکن خود استاذ کی تعلیم و محبت اب بھی میرے دل میں جاگزیں ہے اور وہ کبھی نہیں نکلے گی حالانکہ یہ ایک واقعہ ہے کہ وہ ماسٹر صاحب ایک نہایت پختہ زنار ہندو تھے اور مجھے ان کی اس پختہ زناری کا علم تھا۔ اسی طرح مدرسۃ الاصلاح کے دور میں مجھے بنوٹ کے ایک استاد نے بنوٹ کے کچھ ہاتھ

بتانے کی زحمت اٹھائی تھی — اس قسم کے فنون سے مجھے کچھ واجبی واجبی ہی سی مناسبت رہی ہے، لیکن ان کے سارے شاگرد ان کی عزت ایک استاد ہی کی طرح کرتے تھے حالانکہ وہ ایک ناخواندہ آدمی تھے اور ہم اپنے آپ کو عالم فاضل سمجھتے تھے۔ میرے جس استاد نے مجھے مکتب میں اردو کا قاعدہ پڑھایا تھا وہ بعد میں گردشِ روزگار کے ہاتھوں یکہ ہانکنے پر مجبور ہوئے — اس زمانے میں ہمارے قدیم وطن میں تانگے کی جگہ یکوں کا رواج تھا — لیکن ان کے اس پیشہ کے باوجود میں جب بھی ان کو دیکھتا تو میرا سر فوراً ان کی تعظیم کے لیے جھک جاتا۔

یہ چند باتیں میں نے محض بطور مثال ذکر کی ہیں جن سے یہ اندازہ کرانا مقصود ہے کہ استاذی اور شاگردی کے رشتہ کے معاملہ میں ہماری مشرقی اور اسلامی روایات کا ابھی ہمارے بچپن اور ہماری جوانی تک کیا حال رہا ہے۔ لیکن اب یہ رشتہ بالکل اجیر اور مستاجر کا رشتہ بنتا جا رہا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی عزت و حرمت ختم ہوتی جا رہی ہے حالانکہ یہی رشتہ ہے جو ماضی کی معنوی اور علمی وراثت کو حاضر اور مستقبل کی طرف منتقل کرنے کا واسطہ اور ذریعہ بنتا ہے، اسی کے ہاتھوں ہم انسانیت کے پچھلے اندوختہ کے امین بنتے ہیں اور اس کے تعلق سے سلف کے علوم و افکار، ان کے نظریات و تجربات، ان کے فلسفہ اور سائنس اور ان کی تہذیب و روایات حاضر کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور پھر حاضر ان کو اپنی کسوٹیوں پر پرکھ کر، ان کو نکھار کر اور اپنی محنتوں کے ثمرات سے ان میں اضافہ کر کے ان کو مستقبل کی طرف بڑھاتا ہے۔ اگر یہ تعلق کمزور یا بے وقعت ہو جائے یا خدانخواستہ ٹوٹ جائے تو یہ ایک عظیم حادثہ ہوگا۔ جس کے نتائج نہایت دور رس اور نہایت ہولناک ہوں گے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ماضی اور مستقبل کے اس تعلق کی بیچ کی کڑی ہمارے وہ طلبہ ہی ہیں جو آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں۔ وہی آج کے متعلم اور کل کے معلم ہیں۔ اگر انہوں نے اپنے مقام کو نہ پہچانا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا حاضر بھی تاریک اور ہمارا مستقبل بھی تاریک!

تعلیم کے ذمہ داروں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ آپ طلبہ کو جو کچھ بنانا چاہتے ہیں پہلے وہی کچھ خود بنیے۔ طلبہ سے اگر درویشی مطلوب ہے — اور ہمارے نزدیک یہ مطلوب ہونی چاہیے — تو آپ بھی دوسری تمام ترغیبات سے بالاتر ہو کر علم وفن اور تحقیق وجستجو کے زاویہ میں معتکف ہونے کی خو پیدا کیجیے۔ اگر آپ طلبہ سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ آپ کو استاد، گرو، باپ اور مرشد مانیں — بلاشبہ آپ کو یہ چاہنے کا حق ہے — تو آپ کو بھی اپنے اندر باپ کی شفقت اور مرشد کی تڑپ پیدا کرنی پڑے گی۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ طلبہ پر جو عکس بھی نمایاں ہوتا ہے وہ درحقیقت ان کے استادوں اور تعلیمی رہنماؤں ہی کا ہوتا ہے۔ 'الولد سر لابیہ' والی بات جس طرح باپ اور بیٹوں کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح استاد اور شاگردوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔

ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں استادوں اور شاگردوں کے درمیان محبت واطاعت اور شفقت وعقیدت کی وہی مشرقی واسلامی روایات قائم ہوں جو کبھی ہماری درسگاہوں کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ باقاعدہ ہمارے اساتذہ، طلبہ اور تعلیمی سرپرست حضرات باہم مل کر تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایک تحریک چلائیں۔ یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر صاحب کے متعلق ہم نے سنا ہے کہ وہ نہایت اچھے اوصاف کے آدمی ہیں۔ اس ہنگامہ کے دوران میں ان کا رویہ بھی بڑا ہی قابل تعریف رہا ہے۔ وہ اگر اس مہم کو لے کر اٹھیں تو ہمیں امید ہے کہ اس میں کامیابی ہوگی اور ان کی یہ خدمت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

اس سلسلہ میں ملک کے اربابِ اقتدار سے بھی ہماری ایک گزارش ہے۔ وہ یہ کہ پڑھے لکھے لوگوں پر اس قسم کے بحرانی دورے جو پڑتے رہتے ہیں ان میں بہت کچھ دخل اس خرابی کو بھی ہے جو اس نظامِ تعلیم کے اندر مضمر ہے جو ہمارے ملک میں رائج ہے۔ یہ نظامِ تعلیم کسی بلند نصب العین اور کسی اعلیٰ مطمحِ نظر سے بالکل خالی ہے۔ اس کا مزاج نہ اسلامی ہے، نہ مشرقی اور نہ قومی! علاوہ ازیں تعلیم کے ساتھ اس میں تربیت کا تو سرے

سے گویا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ لے دے کر ڈسپلن ایک چیز ہے جس سے ہمارے تعلیمی کارفرما آشنا ہیں۔ لیکن جو ڈسپلن بغیر تربیت کے قائم کیا جاتا ہے وہ ہمیشہ طاقت کی پشت پناہی کا محتاج ہوتا ہے اور تجربہ گواہ ہے کہ اس میں کوئی خیر وبرکت نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم ایسا ہو کہ طلبہ کو وہ ایک بلند نصب العین بھی دے اور ساتھ ہی اس بلند نصب العین کے لیے ان کی اعلیٰ تربیت بھی کرے۔ بغیر اس کے توقع نہیں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اندر اعلیٰ علمی واخلاقی ماحول پیدا ہو سکے۔ اگر یہ ماحول پیدا کرنا مطلوب ہے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اس نظامِ تعلیم کو از سر نو اسلام کی بنیاد پر استوار کیا جائے اور اسلامی اقدار ونظریات اس کے ہر پہلو میں اجاگر کیے جائیں۔

آخر میں ہم چند حرف سیاسی لیڈروں اور سیاسی پارٹیوں سے بھی عرض کریں گے۔ ہمارے نزدیک زیرِ تعلیم طلبہ کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا کمسن بچوں کے اغوا سے کم جرم نہیں ہے۔ ہماری اس رائے کی بنیاد ہرگز ہرگز اس نظریہ پر نہیں ہے کہ سیاست میں حصہ لینا طلبہ کے لیے کوئی حرام شے ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن طلبہ کو قبل از وقت اس کا چسکا پڑ جایا کرتا ہے ان کی تعلیم اور اس کے نتیجہ میں ان کی ساری زندگی بالکل برباد ہو کے رہ جاتی ہے۔ قومی واجتماعی زندگی میں انہی لوگوں کا داخل ہونا مفید ہوتا ہے جن کا علم بھی پختہ ہو اور جن کی تربیت بھی پختہ ہو۔ اس کے بغیر خام قسم کے لوگ جو میدان میں آکودتے ہیں وہ معاشرے میں تخمہ اور ہیضہ پھیلاتے ہیں۔ ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ قومی زندگی میں کبھی کبھی ایسے اوقات بھی آجاتے ہیں جب ہر شخص کے میدان میں نکل آنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ یہ وقت قوم اور ملک کے لیے موت وزیست کا ہوتا ہے اور اس کی نوعیت نفیرِ عام کی ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں طلبہ کو بھی میدان میں نکلنا پڑتا ہے۔ لیکن عام حالات میں طلبہ کے لیے صحیح پالیسی یہی ہے کہ وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں منہمک رہیں اور سیاست سے ان کا تعلق صرف علمی ونظری حد تک ہو۔ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فقرہ ہمیں نہیں بھولتا۔ انہوں نے ایک تعلیمی ادارے میں طلبہ کو

مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ 'بعض لوگ پکنے سے پہلے سڑ جایا کرتے ہیں!' غالباً ان کا اشارہ ایسے ہی طلبہ کی طرف رہا ہوگا جو قبل از وقت قوم کی قیادت کی ذمہ داریاں اٹھا لیتے ہیں۔ یہ بات طلبہ اور ارباب سیاست دونوں کے سوچنے کی ہے۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ دسمبر ۱۹۶۳ء)

مقالہ ۲۶

آفات کا درسِ عبرت

پچھلے دو مہینوں میں ہمارے ملک کے تین صوبوں — پنجاب، سندھ اور سرحد — اور آزاد کشمیر و شمالی علاقہ جات میں طوفانی بارشوں، سیلاب اور پہاڑی تودوں کے گرنے سے عظیم آفت آئی۔ ہمارے لیے، اگر ہم دیدۂ عبرت رکھنے والے ہوتے تو ان حوادث کے اندر بڑی نصیحتیں موجود تھیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارا حال اس وقت وہی ہو چکا ہے جس کا ذکر قرآن مجید نے فرمایا کہ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف ۱۰۵) یعنی آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جو لوگوں کو جھنجھوڑنے کے لیے ظاہر ہوتی رہتی ہیں لیکن لوگ ہیں کہ ان سے آنکھیں بند کیے گزر جاتے ہیں۔

ان قدرتی آفات سے جو جانی و مالی نقصان ملک کو پہنچا ہے اس کی مبالغہ آمیز رپورٹیں، جو اخبارات میں شائع ہوئی ہیں، اگر نظر انداز بھی کر دی جائیں، صرف سرکاری رپورٹوں ہی پر اعتماد کیا جائے، جب بھی نقصانات کی تعداد ہوش اڑا دینے کے لیے کافی ہے۔ ان کے مطابق بیسیوں دیہات ناپید ہو گئے، تقریباً دو ہزار انسانی جانیں تلف ہوئیں۔ سیلاب کے علاقوں میں تقریباً ۳۵ ارب روپے کی املاک اور ہزارہا مویشی پانی کی موجوں کی نذر ہو گئے۔ ۵۰ لاکھ ایکڑ رقبے پر کھڑی فصل کا پندرہ بیس فی صد حصہ تباہ ہو گیا

اورلاکھوں انسان بے گھر ہو گئے۔ نقصانات کے اندازے مختلف ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی ہے اس کا صحیح اندازہ لگانا کسی کے بس میں نہیں۔

سیلاب اور بارشوں کا طوفان، جیسا کچھ سخت تھا وہ تو تھا ہی، اس سے زیادہ قابل ماتم وہ حالت ہے جو اس قسم کے طوفان قیامت کے بعد بچ رہنے والوں کی ہے۔ تباہ کاریوں کی وحشت ناک خبریں برابر آرہی ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے اوپر زندگی کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اتنا غالب ہو چکا ہے کہ قدرت کی سخت سے سخت تنبیہ بھی ہمیں خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ ہم میں سے اکثر لوگ تو اس قسم کے حوادث کو صرف اتفاق پر محمول کر کے گزر جاتے ہیں، اس کے اسباب وعلل کی کرید میں پڑنے کی وہ ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور اگر کچھ لوگ اس کرید میں پڑنے کی زحمت اٹھاتے بھی ہیں تو ان کی نگاہ اس سے آگے نہیں جاتی کہ محکمہ موسمیات نے بارشوں کی پیشین گوئی کرنے میں غفلت کی، فلاں احتیاطی تدبیر اختیار کرنے میں حکومت نے سستی کی، فلاں دریا کا بند بروقت نہیں کھولا گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اس پہلو کی طرف کسی کی نگاہ نہیں اٹھتی کہ اس کائنات کا کوئی خدا بھی ہے جس کو اس دنیا کے معاملات سے براہِ راست تعلق ہے اور جو کچھ بھی یہاں ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اور نہ اس بات پر کوئی دھیان دیتا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے کہ اس میں اتنے بڑے بڑے واقعات محض نظامِ قدرت کی مشین کی کسی خرابی سے بس یوں ہی پیش آجائیں بلکہ ان کے سوتے خود ہمارے اپنے اخلاق و اعمال کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو جھنجوڑنے اور اپنی طرف متوجہ رکھنے کے لیے برابر ان کو چھوٹی بڑی آزمائشوں میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ یہ آزمائشیں کبھی کسی کو پیش آتی ہیں کبھی کسی کو، لیکن قدرت کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ اس سے عبرت سب ہی حاصل کریں۔ وہ بھی جو اس ابتلاء کی زد میں آئے اور وہ بھی جو اس سے محفوظ رہے۔ بلکہ جو محفوظ رہے ان پر دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔۔ ایک عبرت حاصل کرنے کی اور

دوسری شکرگزاری کی کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ان کو اس آفت سے محفوظ رکھا۔ ان دونوں باتوں کا تقاضا ایک تو یہ ہوتا ہے کہ یہ توبہ اور اصلاح کریں اور دوسرا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی ایسی فیاضی اور ہمدردی کے ساتھ امداد کریں کہ اس شکرگزاری کا حق ادا ہو جائے جو اس آفت سے محفوظ رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے ان پر عائد ہوتا ہے۔

جو لوگ ان واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کو خدا کی طرف سے سمجھنے کی بجائے ان کو محض اتفاق اور غلط منصوبہ بندی پر محمول کرتے ہیں یا ان کی علت اپنے اعمال و اخلاق کے اندر ڈھونڈنے کی بجائے ان کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالتے ہیں، یا اپنے آپ کو ان کا سزاوار سمجھنے کے بجائے اس چیز کو قدرت کا ایک ظلم سمجھتے ہیں، یا اس کو استحصال کا یا سیاسی پروپیگنڈے کا ذریعہ بناتے ہیں، ان لوگوں کو قرآن قسی القلب اور سنگ دل قرار دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ ان کو ڈھیل دے دیتا ہے یہاں تک کہ جب ان کے اندر خدا کی تنبیہات سے فائدہ اٹھانے اور توبہ و اصلاح کی صلاحیت بالکل مردہ ہو جاتی ہے تو وہ ان کو اپنے اس عذاب میں پکڑتا ہے جو ان کی کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے اور جس سے نجات دینے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔ اس عذاب کے بعد اس قوم کی قومی ہستی بالکل فنا ہو جاتی ہے اور خدا کا وہ قانون نمودار ہو جاتا ہے جو اس نے ایک قوم کو دوسری قوم سے بدل دینے کے لیے بنایا ہے۔

اس طرح کے عظیم واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے معاملہ میں مسلمانوں کو بالعموم اور ان کے ذمہ داروں اور لیڈروں کو بالخصوص جس درجہ حساس، زیرک، خدا ترس اور بیدار مغز ہونا چاہیے اس کی بہترین مثال ہم کو حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی میں ملتی ہے۔ ان کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑا جس کا ذکر تاریخوں میں 'عام الرمادہ' کے نام سے ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس قحط کے دنوں میں قحط زدوں کی امداد کے لیے اپنے رات دن ایک کر دیے، ایک ایک دروازے اور ایک ایک جھونپڑے پر پہنچتے اور لوگوں کی مشکلات

بنفسِ نفیس حل کرتے۔ راتوں کو گشت کرتے اور اگر کسی گھر میں بھوک سے بلکنے والے بچوں
کی آواز سن پاتے تو خود اپنی کمر پر آٹے کی بوری لاد کر اور ہاتھ میں روغن کا ٹین لٹکائے
ہوئے وہاں جا پہنچتے، خود چولھا پھونکتے اور جب تک بھوکے آسودہ نہ ہو جاتے اس وقت
تک وہاں سے ٹلنے کا نام نہ لیتے۔ بھوکوں کے احساسات سے قریب تر رہنے کے لیے گھر
کے اندر کھانا کھانا انہوں نے چھوڑ دیا۔ پورے زمانہ قحط میں اپنے اوپر یہ پابندی عائد کیے
رکھی کہ نہ دودھ استعمال کریں گے، نہ گھی اور نہ کوئی دوسری لذیذ چیز! ایک دن اسی دوران
میں اپنے کسی چھوٹے بچے کے ہاتھ میں خربوزے کی ایک پھانک دیکھ لی، دیکھتے ہی اس
کے پیچھے بھاگے کہ 'برخوردار! تم خربوزے اڑا رہے ہو اور امت محمد (ﷺ) قحط سے تباہ ہو
رہی ہے!' انتظامیہ کی سرگرمیوں کا اندازہ خود خلیفہ کی سرگرمیوں سے کر لیجیے۔ ان کا ایک
ایک عامل اور ایک ایک گورنر انہیں کی طرح قحط کو شکست دینے کے لیے اپنی پوری قوت
سے میدان میں اتر آیا۔ ان کے عراق کے گورنر نے ان کو لکھا کہ 'امیر المومنین! آپ قحط
کے حالات سے پریشان نہ ہوں، میں غلہ کے اونٹوں کا جو قافلہ بھیج رہا ہوں اس کی قطار کا
اگلا اونٹ مدینہ میں ہو گا اور اس کا آخری اونٹ عراق میں!'

اس سرگرمی، اور اس اہتمام و انتظام کے باوجود اب آیئے یہ دیکھیے کہ اس ابتلاء سے
متعلق، اور خود اپنی ذات سے متعلق، ان کے احساسات کیا تھے؟ ان کے حالات میں لکھا
ہے کہ راتوں کی تنہائی میں جب ذرا فرصت ملتی تو رو رو کر ڈاڑھی تر کر لیتے اور توبہ و استغفار
کے ساتھ اپنے رب سے یہ دعا کرتے کہ 'اے پروردگار، امت محمد (ﷺ) میرے
ہاتھوں تباہ نہ ہو!' اللہ اکبر! اس تدبر، اس انتظام اور اس طرح جان لڑا دینے کے بعد
تواضع، خشیت اور تصورِ خدمت کے احساس کا یہ عالم تھا کہ ڈرتے تھے اور روتے تھے کہ
کہیں یہ ابتلاء میری اپنی ہی کوتاہیوں کا نتیجہ نہ ہو۔

اس تمام گزارش سے ہمارا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ پاکستان میں یہ جو کچھ پیش آیا ہے یہ
اتفاقی حوادث نہیں ہیں۔ اس دنیا میں کوئی چھوٹا سے چھوٹا واقعہ بھی اتفاق سے پیش نہیں آتا چہ

جائیکہ یہ قیامتِ صغریٰ جس سے ہزاروں مربع میل کا رقبہ تہس نہس ہو کر رہ گیا! بلکہ یہ قدرت
کی طرف سے ہمارے لیے ایک بہت بڑی تنبیہ ہے تاکہ ہم اس خدا کی طرف رجوع کریں
جس نے اپنے فضل سے ہمیں ایک خطۂ زمین بخشا کہ ہم اس میں اس کی شریعت نافذ کریں
لیکن ہم بدستور خدا اور اس کے دین کے ساتھ مذاق کرتے چلے جا رہے ہیں۔ گزشتہ دو تین
مہینوں سے تو بالخصوص حکومتی پارٹی اور حزبِ اختلاف دونوں جانب سے دین کے خلاف جیسے
مہم چلائی جا رہی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہم نے اس تنبیہ سے صحیح سبق حاصل نہ کیا تو
اندیشہ ہے کہ ہم اس سے بھی زیادہ کسی سخت ابتلاء میں ڈالے جائیں۔ اس تنبیہ کے مخاطب
صرف عوام ہی نہیں ہیں بلکہ اس قوم کے خواص و اکابر اور زعماء و علماء اور اربابِ اقتدار عوام
سے بھی زیادہ ہیں۔ اس لیے کہ جن خرابیوں کے نتیجہ میں اس طرح کے حوادث ظہور پذیر
ہوتے ہیں ان کی اصلاح کی اصلی ذمہ داری چھوٹوں سے زیادہ بڑوں پر ہوتی ہے۔

اس قسم کے طوفان کا سدِّ باب محکمہ موسمیات کی پیشین گوئیوں، حفاظتی بندوں اور
سائنس کی پیش بندیوں، فوج اور پولیس کی کارفرمائیوں اور ترقی یافتہ ممالک کی رہنمائیوں
سے نہیں ہوتا۔ دنیا کی کوئی طاقت یا کوئی سائنس اللہ کے مقابل میں کھڑی نہیں ہو سکتی اور
نہ کوئی تدبیر اس کی پکڑ سے بچا سکتی ہے! یہ سب کیجیے اور زیادہ سے زیادہ کیجیے۔ اس لیے
کہ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ اس میں اسباب سے گریز ممکن نہیں ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے
بھی اسباب کی تابہ مقدور فراہمی کی ہدایت فرمائی ہے۔ لیکن اس غلط فہمی میں بھی نہ پڑیے
کہ اسباب کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار خدا کے مقابل میں بھی کام آ سکتی ہے۔ خدا سے
اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو صرف سچی توبہ ہی بچا سکتی ہے۔ وہ توبہ جس کے ساتھ اصلاحِ
حال کا سچا اور پکا ارادہ ہو۔ اور چونکہ یہ حوادث ہمارے اجتماعی فسادِ حال کی علامت ہیں،
اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہم من حیث القوم اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے
اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں ہی قسم کی نافرمانیوں کی معافی مانگیں اور آئندہ سے اس راستہ
پر چلنے کا عزم کریں جو خدا نے بتایا ہے!

(ماہنامہ میثاق لاہور)

٥

خطبات

مقالہ ۲۷

معرفتِ حق اور اس کے تقاضے

[یہ تقریر انجمن خدام القرآن لاہور کی ایک تربیت گاہ کے افتتاحی اجلاس میں کی گئی جو ۱۳/۱۱ اگست ۱۹۷۲ء کو لاہور میں منعقد ہوا۔]

خطبہ مسنونہ کے بعد:

بھائیو! میں سب سے پہلے اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس اجتماع میں برکت دینے کے لیے نہیں بلکہ برکت لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میری حاضری کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ میں اپنے مخدوم اور محترم دوست مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے درس سے کچھ برکت حاصل کروں۔ برکت حاصل کرنا، میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ میں اب استفادہ کے قابل تو رہا نہیں صرف برکت ہی حاصل کر سکتا ہوں۔ مولانا سے مجھے صرف محبت ہی نہیں ہے بلکہ بلا شائبۂ تکلف عرض کرتا ہوں کہ مجھے ان سے عقیدت بھی ہے۔ درآنحالیکہ عقیدت کے معاملے میں بہت فیاض آدمی نہیں ہوں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مجھے ان سے محبت ہی نہیں بلکہ عقیدت بھی ہے اور میں آپ لوگوں کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان کے درس سے اور ان کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

میری حاضری کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ آپ کی صحبت اور آپ کی معیت کا تھوڑا بہت

ثواب میں بھی حاصل کر لوں۔ اس زمانہ میں ایسے انسانوں کی کمی تو نہیں ہے جو ارسطو کی تعریف کے مطابق انسان ہیں، اس لیے کہ بہرحال وہ 'حیوانِ ناطق' ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بس حیوانِ ناطق ہی ہیں، قرآن کی تعریف کے مطابق وہ انسان نہیں ہیں اس لیے کہ وہ بصیرت اور بصارت دونوں سے محروم ہیں۔ فی زمانہ ایسے انسان بہت ہی تھوڑے ہیں جو اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے جدوجہد کریں، اس کے لیے گھر سے نکلیں، اس کے لیے تکلیفیں اٹھائیں، اس کے لیے ان کے اندر ذوق و شوق ہو۔ میں آپ لوگوں کو انہی میں شمار کرتا ہوں جو ایک نہایت ہی محبوب اور عظیم مقصد کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ارادے میں خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ کو زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہونے کا موقع دے!

حضرات! میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں شرکت کے ذریعے برکت حاصل کروں لیکن میرے عزیز بھائی شیخ سلطان احمد صاحب اور برادرِ عزیز ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مجھے یہ خواہش بھی معلوم ہوئی کہ میں آپ کے سامنے تقریر بھی کروں، تو میں نے ان کی خواہش کی تعمیل ضروری سمجھی لیکن میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی نوعیت ہرگز تقریر کی نہیں ہوگی بلکہ چند نہایت ہی واضح اور بدیہی حقیقتوں کی تذکیر ہی کی ہوگی۔ یعنی صرف یاددہانی! حقیقت یہ ہے کہ بعض حقیقتیں اپنی جگہ انتہائی واضح ہوتی ہیں لیکن شاید اپنی شدتِ وضاحت ہی کی وجہ سے بہت مجہول ہو جاتی ہیں لہٰذا ان کی وقتاً فوقتاً تذکیر ہوتی رہنی چاہیے۔ میری اپنی زندگی کی رہنمائی میں ان حقائق نے مجھے بہت مدد دی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ کو بھی ان کی یاددہانی کرا دوں تاکہ آپ حضرات بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔

خدا کا وجود

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا ہے اور ضرور ہے اور خدا کے ماننے پر ہر انسان مجبور ہے۔ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ میں اس

معاملہ میں اپنا یہ ذاتی احساس عرض کر دیتا ہوں کہ جب اول اول مجھے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ خدا ہے اور ضرور ہے، نیز یہ کہ انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اس سے مفر نہیں ہے، تو اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ اس ماننے سے بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی میں ان ذمہ داریوں کے متعلق سوچتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا بوجھ میری کمر توڑ دے گا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کچھ فلسفی ایسے بھی ہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی چیزوں کا بھی مطالعہ کروں۔ اور صاف طور پر عرض کیے دیتا ہوں کہ بغیر کسی تعصب کے میں نے ان چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر چھپی ہوئی خواہش بھی موجود تھی کہ اگر یہ فلسفی یہ ثابت کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا اس لیے کہ اس طرح بہت بڑے بوجھ سے نجات مل جائے گی۔ یہ ایک مخفی راز ہے جو میں آپ پر ظاہر کر رہا ہوں۔ ویسے الحمدللہ! مجھ پر الحاد کا کوئی دور نہیں گزرا ہے لیکن مجھ پر ایک ایسا دور ضرور گزرا ہے کہ جب میرے اندر یہ خواہش تھی کہ اگر یہ فلسفی حضرات خدا کا انکار ثابت کر دیں اور مجھے مطمئن کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو بہرحال ایک اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے گا اور سر سے ایک بھاری بوجھ اتر جائے گا۔ اس خواہش کے تحت میں نے متکلمین کی، دہریوں کی، منکرین کی، ڈارون کی، مارکس کی، فرائڈ کی، غرض کہ ان سب لوگوں کی کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھیں اور بغیر کسی تعصب کے پڑھیں، لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ ساری چیزیں پڑھنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ — یہ سب خرافات ہیں! ایک بدیہی حقیقت سے انکار کی خواہش ان سے یہ کام کرا رہی ہے، باقی رہ گیا یہ کہ خدا کے انکار کے لیے ان لوگوں کے پاس واقعی کوئی دلیل ہے تو اس کی سرے سے گنجائش ہی نہیں! جو بات یہ پیش کرتے ہیں، اس سے ہزار گنا مضبوط اور بدیہی بات وہ ہے جو قرآن حکیم پیش کرتا ہے کہ ایک خدا کو، ایک رب کو، ایک رحمان کو، ایک رحیم کو، ایک علیم کو، ایک خبیر کو، ایک سمیع کو اور ایک بصیر کو مانو! اس بات پر عقل بھی گواہی دیتی ہے اور فطرت بھی گواہی دیتی ہے۔ ظاہر بھی گواہی دیتا ہے اور باطن بھی گواہی دیتا ہے۔ آفاق بھی

گواہی دیتے ہیں اور انفس بھی گواہی دیتے ہیں۔ غرض کہ ایک ایک چیز گواہی دیتی ہے۔ ہمارے متکلم اور ہمارے فلسفی لوگ خدا کے وجود پر اگر کوئی دلیل قائم کرنہیں پاتے تو جانتے ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلیل وہاں کام دیتی ہے جہاں دلیل دعویٰ سے زیادہ واضح ہو۔ لیکن اگر دعویٰ دلیل سے زیادہ واضح ہو تو وہاں دلیل بے کار ہے۔ وہاں دلیل کیا کام کرے گی؟ وہاں ارسطو کی منطق کیا کام کرسکتی ہے؟ وہاں متکلمین کا علم کلام کیا کام کرسکتا ہے؟ اسی طرح آسمان اور زمین کے وجود پر آپ کیا دلیل لاسکتے ہیں؟ ان چیزوں پر دلیل لانے کی کوشش کرنا درحقیقت حماقت ہے۔ یہ بدیہیات ہیں! فطرت کی، آفاق کی، انفس کی، عقل کی سب کی بدیہیات! اس مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ محض انکار کرنے کی خواہش کے زیرِ اثر اندھے اور بہرے ہوگئے ہیں اس لیے کہ وہ جس علت العلل کو، جس محرکِ اوّل کو، جس مادہ کو، جس خلیہ کو اس عظیم کائنات کا سبب قرار دیتے ہیں، اس سے زیادہ اور اس سے لاکھ درجہ آسان اور عقل اور دل کے لیے قابلِ قبول بات وہ ہے جو قرآن کہتا ہے۔ میں اس کائنات کو کسی محرکِ اوّل کی حرکت کا نتیجہ مان لوں! اس حماقت میں مبتلا ہونے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ میں یہ مان لوں کہ بے شک خدا ہے اور ان ہی صفات کے ساتھ ہے جو قرآن کہتا ہے!

خدا کو ماننے کے تقاضے

تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ درحقیقت خدا کو ماننے کی جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں ان سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ اور اس میں واقعتہً کوئی شک نہیں ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں وہ بڑی اہم ہیں۔ بڑی مشکل ہیں۔ بڑی کٹھن اور بڑی دشوار ہیں۔ اس راہ میں آگے بڑھنا صرف اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جبکہ آدمی سر ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے۔ اس میں حضرت یحییٰؑ کی طرح سر کٹوانا پڑتا ہے۔

حضرت مسیحؑ کی طرح سولی کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی طرح آگ میں کودنے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے اور ان تمام مراحل اور مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جن مراحل اور مقامات سے ہمارے نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گزرے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہر شخص ہمت نہیں رکھتا اور اسی لیے لوگ گریز اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ صاف صاف انکار کردیتے ہیں کہ ہم ان جھگڑوں ہی میں نہیں پڑتے۔ وہ ان بدیہی حقیقتوں کو 'موہوم' کہہ کر گویا ذمہ داریوں سے بچنے کا آسان راستہ نکال لیتے ہیں۔ اور جو لوگ مانتے ہیں، جیسے کہ ہم اور آپ اور ہماری قوم، وہ درحقیقت اقرار مع الانکار کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں لیکن خدا کو ماننے کے جو تقاضے ہیں، ان میں سے کسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ پھر اس کے بعد تقاضوں سے فرار کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے اختیار کرلیتے ہیں۔ بڑے فخر اور تعلّی کے ساتھ خدا کا اقرار بھی کرتے ہیں لیکن زندگی کے کسی مرحلہ میں خدا کے اقرار کے تقاضوں کو پورا کرنے اور خدا کے احکام پر بے چون و چرا عمل کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر دوسرے صریح اور کامل انکار میں مبتلا ہیں تو یقیناً ہم بھی اقرار مع الانکار میں مبتلا ہیں اور ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

اصل چیز یہ ہے کہ خدا کو مانیے تو خدا کو ماننے کے جو مطالبے ہیں، جو تقاضے ہیں، جو تضمنات ہیں، جو مضمرات ہیں، جو لوازمات ہیں اور جو نتائج ہیں، ان کا مواجہہ کرنے کے لیے تیار رہیے۔ حقیقت سے گریز کی پالیسی نہایت بزدلانہ بلکہ منافقانہ ہے۔ اور قرآن کے مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ مآل کے لحاظ سے کفر اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے مابین فرق صرف ظاہر کا فرق ہے۔ نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا انجام ایک ہے۔ تو جو لوگ انکار میں مبتلا ہیں وہ تو انکار میں مبتلا ہیں ہی لیکن جو لوگ اقرار والے انکار میں مبتلا ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ وہ صریح نفاق میں مبتلا ہیں۔ اب اس صریح نفاق کو اپنے اندر سے نکالنا ایک بڑا معرکہ ہے اور دوسروں کے اندر سے نکالنا

اس سے بھی بڑا معرکہ ہے۔ اللہ جن کو ہدایت بخشتا ہے وہ نفاق کو اپنے اندر سے نکال سکتے ہیں اور جن کی ہدایت میں اور جن کی توفیق میں زیادتی فرماتا ہے وہ دوسروں سے اس کو دور کرنے کی سعی وجہد کرتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے بڑی سخت بازی کھیلنی پڑتی ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ حقیقت سے گریز کی پالیسی بالکل غلط ہے۔ حقیقت کا مواجہہ کیجیے اور پوری جرأت کے ساتھ مواجہہ کیجیے اور وہی بندے مبارک بندے ہیں جو یہ کام کریں۔ اللہ تعالیٰ کو بہت ساری بھیڑ مطلوب نہیں وہ تو مخلص چاہتا ہے۔ اسے تو وہ بندے پسند ہیں جو اس کو اس طرح مانیں جیسے کہ اس کو ماننے کا حق ہے۔ مولویوں کی زبان میں سننا چاہیں تو سنئے کہ 'مانیں مانا کر!' سر دینے کے لیے تیار ہو کر مانیں۔ یوحنا و مسیح علیہما السلام کی طرح مانیں، محمد ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کے طریقہ سے مانیں۔ باقی اس کے سوا دوسرا طرزِ عمل مہمل اور خرافات ہے!

پس حق کو جانیے، حق کو سمجھیے، حق کا علم حاصل کیجیے، حق کی معرفت حاصل کیجیے اور پھر اس حق کو اپنے اوپر قائم کرنے کے لیے اور دوسروں پر قائم کرنے کے لیے اپنے اندر صبر اور عزیمت پیدا کیجیے۔ اسی حق اور اسی صبر پر حقیقت میں صحیح زندگی قائم ہوتی ہے۔ جہاں تک حصولِ علم و معرفت کا تعلق ہے تو یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ نبیوں کی تعلیم، نبیوں کے صحیفے، اللہ کا شکر ہے، موجود ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن بتمام وکمال موجود ہے۔ آخری نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت موجود ہے۔ صحابہؓ کی زندگی موجود ہے۔ اگر آپ جاننا چاہیں اور آپ میں جاننے کا شوق اور طلب ہو، جس طرح زندگی کی اور طلبیں ہیں، تو یہ کام بہت مشکل نہیں ہے۔ لیکن صبر کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ یہی میری زندگی کا تجربہ ہے کہ صبر کا معاملہ واقعی بہت مشکل ہے۔ عزیمت کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ میں اس صبر کے متعلق عرض نہیں کر رہا ہوں جس کے کھوکھلے وعظ ہمارے منبروں سے ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ صبرِ حقیقی، عزیمت، استقامت سے میری مراد یہ ہے کہ اللہ کو ماننے اور حق کو تسلیم کرنے کے جو حقیقی تقاضے ہیں ان کو پورا کیا جائے۔ جس حق کو قبول کیا جائے اس کی اپنے

قول و عمل سے شہادت بھی دی جائے۔ یہ ہر مومن کا فرض ہے اور اولین فرض ہے۔

شہادتِ حق

جس شخص میں حق کی طلب نہ ہو، حق کا علم حاصل کرنے کا شوق نہ ہو، اسے آپ ارسطو کی تعریف کے مطابق انسان کہہ لیجیے لیکن میں تو اسے دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور ہی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک وہ حقیقت میں انسان نہیں ہے جس میں حق کی طلب نہ ہو۔ جس کا عظیم داعیہ انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ جس کے اندر یہ داعیہ نہیں ہے وہ مردہ ہے۔ وہ آدمی نہیں ہے، بلید ہے اور جانور سے بھی زیادہ بلید ہے! لہٰذا اس حق کو قائم کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔ پہلے تو اس حق کو اپنے اوپر قائم کیجیے اس لیے کہ جس نے اپنے اوپر اس حق کو قائم نہیں کیا اس کا حق کی شہادت دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہونا فضول کام ہے۔ ایسے کھوکھلے سینوں کی شہادت کچھ کارگر نہیں ہوتی، بالکل بے کار ہوتی ہے۔ صرف ان ہی لوگوں کو حق کی شہادت پیش کرنے کا حق ہے جو حق کو پہلے اپنے اوپر قائم کر لیں۔ اور اچھی طرح جان لیجیے کہ حق کی شہادت دینا بھی فرض ہے۔ حق کو جاننے والے اور علم صحیح رکھنے والے کے لیے میں دین میں، اور قرآن کے تیس پاروں میں، کہیں کوئی گنجائش نہیں پاتا کہ اسے حق کی شہادت دینے سے مفر ہو۔ شہادتِ حق اس پر واجب ہے، لازم ہے، فرض ہے! دائیں بائیں، آگے پیچھے، جس حد تک ممکن ہو حق کی شہادت دیجیے۔

لیکن جب شہادت کا مرحلہ آتا ہے تو بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اس کے لیے بسا اوقات ایسے ایسے لوگوں کے کانوں میں حق کی اذان دینی پڑتی ہے جن کے کانوں میں یہ اذان دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ بڑے عزیز تعلقات اس کے لیے منقطع ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے عزیز رشتے اس کے لیے کٹ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محبوبوں کی دوستی اس کے لیے قربان کرنی پڑتی ہے اور بسا اوقات سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آخری چیز جان ہے۔ اس کی بھی نذر گزارنی پڑتی ہے اور صاف سن لیجیے کہ اگر آپ جان کو عزیز رکھتے

ہوں تو اس راستہ میں بالکل قدم نہ رکھیے۔ یہ وہ راستہ نہیں جس میں آسانیاں ہوں۔ اس راستہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں ان تمام مشکلات کو بیان کروں۔ آپ قرآن کریم کا جو درس حاصل کریں گے ان سے یہ مشکلات معلوم ہو جائیں گی۔

صبر کی حقیقت

لیکن میرے عزیز دوستو! ایک بات میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں اور کاش! میں اسے اچھی طرح آپ کو سمجھا بھی سکوں۔ وہ بات یہ ہے کہ 'صبر' کہنے کے لیے بہت آسان ہے، لیکن کرنے کے لیے بہت مشکل ہے۔ اور پھر یہی وہ چیز ہے جس پر صحیح زندگی استوار ہوتی ہے۔ جہاں تک اہل حق کا تعلق ہے اور شہادت حق دینے والے لوگوں کا تعلق ہے، ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صبر کی بنیاد ایک علمی حقیقت پر اور ایک حکمت پر مبنی ہے۔ جب تک وہ حقیقت وحکمت پوری طرح سے واضح نہ ہو، اس پر علم الیقین اور حق الیقین نہ ہو تو اس وقت تک صبر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت وحکمت یہ ہے کہ آپ کے راستہ میں جو کچھ پیش آئے گا وہ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے تحت پیش آئے گا۔ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے سوا اس دنیا میں اور کوئی ارادہ اور مشیت کارفرما نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر ارادہ میں خیر مضمر ہوتا ہے اگرچہ ہمیں اس کا خیر معلوم نہ ہو۔ اسی حقیقت کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش میں نکلنے کا حکم ہوا۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جب تک آپ اس حقیقت کو مستحضر نہیں رکھیں گے آپ کی اندرونی زندگی میں اور آپ کی خارجی زندگی میں ایسے ایسے فتنے پیش آئیں گے کہ شیطان آپ کو لوٹا دے گا، آپ کے قدم متزلزل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر آپ کا مضبوط یقین ہے کہ جو ہوگا خدا کے ارادہ سے ہوگا اور خدا کا ارادہ ہمیشہ خیر اور حکمت ہی پر مبنی ہوتا ہے تو آپ یقین کریں کہ آپ بڑے سے بڑے مشکل مرحلہ میں بھی ثابت قدم رہیں گے۔ رہی یہ بات کہ خدا کا ہر ارادہ خیر پر مبنی

ہے اور خدا کے ارادہ کے سوا کوئی دوسرا اردہ اس کائنات میں کارفرما نہیں ہے تو یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ جو اس کو نہیں مانتا وہ مومن نہیں ہے! اس کو سمجھنے کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہر کام کی حکمت ہمارے اوپر عیاں اور واضح ہو جائے۔ لیکن اس کا کوئی امکان نہیں اس لیے کہ ہم خدا تو نہیں بن سکتے۔ ہم بندے ہیں اور ہمارا علم محدود ہے۔ دوسری یہ کہ ہم اس بات پر یقین رکھیں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس میں خدا کی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ کچھ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے اور کچھ کی حکمت، اپنے محدود علم کی وجہ سے، ہم سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ ہر کام میں خیر و برکت پوشیدہ ہوتی ہے تو اس پر پورا پورا ایمان اور یقین رکھیں۔ خدا چاہے گا تو وہ آپ پر حکمت بھی واضح کر دے گا، لیکن حکمت جاننے کے لیے ہم کو بے صبر نہیں ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ ظالموں کی گرتی ہوئی دیوار اور باغیوں اور طاغیوں کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھالا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی خدا کی حکمت ہی کارفرما ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ اہلِ حق مظلوم ہیں، مقہور ہیں، ان کو دکھ دیا جارہا ہے اور وہ فاقے کر رہے ہیں۔ یہ بات بھی آپ دیکھیں تو اس پر یہی یقین رکھیں کہ اس میں بھی خدا کی کوئی حکمت ہوگی۔ یہاں مسکینوں کی کشتی میں سوراخ کرا دیا جاتا ہے تو اس کے اندر بھی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ ظالموں اور باغیوں کی دیوار اونچی کرا دی جاتی ہے تو بہرحال اس دیوار کے نیچے بھی، غریبوں اور یتیموں کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ ظالموں اور طاغیوں کو جو مہلت دی جاتی ہے اس کے اندر کیا کیا حکمتیں ہوتی ہیں تو ان میں سے کچھ کا اندازہ آپ کو قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوگا اور اصل حقیقت قیامت کے دن ہمارے سامنے آئے گی۔

بہرحال ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ اگر حق کی راہ میں کسی پر ظلم ہوتا ہے تو اسی کے اندر حکمت ہے۔ اسی کے اندر بہتری ہے، اسی کے اندر خیر ہے، اسی کے اندر فلاح ہے اور اسی کے اندر کامیابی ہے۔ اور اگر ظالموں کو، طاغیوں کو، سرکشوں کو، نافرمانوں کو، باغیوں کو، غافلوں کو اور بے پرواؤں کو خدا کی طرف سے ڈھیل دی جاتی ہے

تو اس کے اندر بھی حکمت ہے، اس پر بھی پورا یقین رکھیے۔ اگر آپ اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھیں گے تو یہ چیز ہمیشہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کو پناہ میں رکھے گی۔ آپ ثابت قدم رہ سکیں گے۔ اور اگر اس سے غفلت ہو گئی تو شیطان آپ کو ٹھوکر کھلائے گا اور آپ کو دھوکا دے گا۔ لہٰذا یہ بڑی بنیادی چیز ہے جو آپ کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔

دنیا میں انسان کی حیثیت

دوسری ایک اور بات بھی میں آپ کے سامنے واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم کو اور آپ کو اس دنیا میں اپنا موقف اور مقام بھی طے کر لینا چاہیے کہ ہم اس دنیا میں کیا ھیں؟ خالق ہیں؟ ظاہر ہے کہ خالق نہیں ہیں، مخلوق ہیں۔ مالک ہیں؟ ظاہر ہے کہ مالک نہیں ہیں، مملوک ہیں۔ ہمارا صحیح موقف اور صحیح مقام جو قرآن مجید میں سورۂ حدید میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مُسْتَخْلَفْ ہیں، مُسْتَخْلِفْ نہیں ہیں۔ مُسْتَخْلَفْ کا مفہوم اگر آپ اردو میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیجیے کہ ہم امین ہیں۔ ہمیں جتنی قوتیں، صلاحیتیں، ذہنی و دماغی قابلیتیں اور جسمانی توانائیاں ملی ہیں، جو مال، دولت، اسباب، سامان، ذرائع اور وسائل ملے ہیں ہم ان سب کے امین ہیں، مالک نہیں۔ اور جب ہم امین ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ہمیں ہر امانت کے لیے جوابدہی کرنی ہے۔ ایک ایک چیز کے متعلق حساب دینا ہے۔ امانت دینے والے نے جس حد تک اختیار دیا ہے بے شک اس اختیار کے دائرہ کے اندر ہم اختیار استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں، لیکن اس کے باہر رتی برابر بھی ہٹے تو اس کا حساب دینا ہوگا، جوابدہی کرنی ہوگی اور نتیجہ بھگتنا ہوگا اور کسی ایسے ویسے سے نہیں بلکہ اس ہستی سے بھگتنا ہوگا جو ذرہ ذرہ کا علم رکھتی ہے۔ پھر یا تو اس بات کا انکار کر دیجیے اور کہیے کہ آپ مستخلف نہیں ہیں بلکہ مالک ہیں۔ ورنہ اپنے سمع پر، اپنے بصر پر، اپنے قلب و فواد پر اور اپنی ایک ایک چیز پر پہرہ بٹھائیے، اپنی زبان پر بھی پہرہ بٹھائیے۔ یہ آپ کی زبان کس کی ترجمان ہے؟ یہ آپ کی عقل کی ترجمان ہے یا آپ کے بطن اور فرج کی ترجمان ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عقل کی ترجمان ہے۔ ہم نے اس کو بطن

اور فرج کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر موقع ہوتا تو میں تفصیل سے آپ کو بتاتا کہ ہماری شاعری، ہمارا ادب اور ہمارا لٹریچر بالکل مہمل، گندی، ناپاک اور لغو چیز بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شمشیرِ جوہر دار جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی تھی، اس سے ہم نے گھاس کاٹنے کی درانتی کا کام لینا شروع کر دیا ہے۔

بہرحال اس بات کو ملحوظ رکھیے کہ ایک ایک چیز کے آپ مسئول ہیں اور ذمہ دار ہیں۔ جو شخص اس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرتا ہے، اس کے قدم جادۂ حق پر استوار رہتے ہیں اور جہاں اس حقیقت سے غفلت ہوئی وہیں وہ فوراً مار کھا جاتا ہے۔ تو اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیے۔ اس موقف کو، اپنے مقام کو، اپنے درجہ کو اور اپنے مرتبہ کو کبھی بھی فراموش نہ کیجیے اور اگر اس کے انکار کی آپ میں ہمت ہے تو میں کسی ایسے دوست کا خیر مقدم کروں گا جو مجھ پر ثابت کر دے کہ اس کے انکار کی عقلی دلیل موجود ہے اور اس کی گنجائش ہے۔ کم از کم قرآن مجید میں، جس پر آپ کا ایمان ہے، اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر یہ آپ کے نزدیک قرآن قبروں کے اوپر پڑھ کر صرف ایصالِ ثواب کے لیے ہے، تب تو میں کچھ نہیں کہتا۔ ان لوگوں کی قبروں پر بھی پڑھ کر اس کے ذریعہ ایصال ثواب کیجیے کہ جنہوں نے ساری عمر کبھی قرآن کو ہاتھ تک نہ لگایا ہو۔ لیکن اگر قرآن زندگی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہے، حق بتانے کے لیے ہے، صراطِ مستقیم پر گامزن رکھنے کے لیے ہے، مآلِ کار کا شعور دینے کے لیے ہے، جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، تب میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کا مستقر، آپ کا مقام اور آپ کا موقف اس قرآن میں یہی بیان کیا گیا ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کے برعکس مجھے کوئی بات سمجھا سکیں تو میں ان کا خیر مقدم کروں گا۔ یہ بات بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت تھی لیکن میں نے مختصراً عرض کیا ہے۔

ابنِ آدم کا شاطر دشمن

عزیزو! اب ایک حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس کو آپ ہمیشہ پیشِ نظر رکھیے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ابنِ آدم اور بنتِ حوا اس دنیا میں محاذِ جنگ پر ہے، اور بڑے شاطر دشمن کے مقابلہ میں محاذِ جنگ پر ہے! بڑے کائیاں دشمن کے مقابلہ میں، جس نے خدا کو یہ چیلنج دے کھا ہے کہ 'اگر تو مجھے مہلت دے تو میں اس انسان کے داہنے سے، بائیں سے، آگے سے، پیچھے سے، اس کے آرٹ سے، ادب سے، لٹریچر سے، ثقافت سے، کلچر سے، غرض کہ ہر پہلو سے، اس کے اوپر تاخت کروں گا! اور اسے تیری صراطِ مستقیم سے ہٹا کر چھوڑوں گا! اس کو گمراہ کر کے رہوں گا! اور ثابت کر دوں گا کہ اس کو میرے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے!' اللہ تعالیٰ نے اس شان کے ساتھ، جو اس کو زیبا ہے، جواب میں فرمایا کہ 'جا تجھے مہلت دی گئی! جس کو تو بہکا سکتا ہے، بہکا لے جو تیرے پیچھے لگ جائیں گے، میں ان سے اور تجھ سے، تیری ذرّیت سے اور تیرے اولیاء سے جہنم کو بھر دوں گا!' یہ قرآن مجید کی ایک واضح حقیقت ہے۔ قرآن حکیم میں قصہ آدمؑ و ابلیس صرف حکایت سنانے کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت بیان کرنے کے لیے ہے۔ اس کی بے شمار حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ آپ اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ آپ اس دنیا میں ایک بڑے شاطر اور کائیاں دشمن کے مقابلہ میں محاذِ جنگ پر ہیں اور یہ دشمن چالاک و مکار ہونے کے ساتھ ساتھ طاقتور بھی ہے۔ اس نے جس وقت انسان کو گمراہ کرنے کا چیلنج دیا اور مہلت مانگی تھی اس کے چیلے گنتی کے ہوں گے لیکن آج تو اس کی فوج بے شمار ہے۔ پھر اس کی فوج میں ایسے ایسے کائیاں لوگ پیدا ہو گئے ہیں کہ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ وہ آج خود ابلیس کے کان کتر سکتے ہیں۔ ابلیس کو بھی فلسفہ پڑھا سکتے ہیں۔ وہ اس سے بھی زیادہ کائیاں ہیں۔ اب ابلیس کو خود کچھ کرنے کی خاص ضرورت نہیں ہے، اس سے زیادہ شاطر اس کے شاگرد ہیں۔ اگر تفصیل کا موقع ہوتا تو میں ان شاگردوں کے کرتوتوں کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے رکھتا اور آپ کو اپنی بات پوری طرح سمجھا دیتا۔ اجمالاً یوں سمجھ لیجیے

کہ یہ شاگرد آج آرٹ کے نام سے، ادب کے نام سے، لٹریچر کے نام سے، ثقافت کے نام سے، کلچر کے نام سے، فیشن کے نام سے، تہذیب کے نام سے، پیٹ کے نام سے، سیکس کے نام سے، جمہوریت کے نام سے، عوام کے نام سے، خود اسلام کے نام سے اور نہ جانے کس کس نام سے خدا کی خلق کو گمراہ کر رہے ہیں اور ابلیس کے کان کتر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابلیس بھی شاید قیامت کے دن چیخ اٹھے گا کہ بے شک تم نے مجھے بھی مات دے دی! میں تم سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا۔ پس اے بھائیو! ایسے چالاک دشمن اور اس کے ایسے لاؤ لشکر کے مقابلہ میں آپ محاذِ جنگ پر ہیں! جو سپاہی محاذِ جنگ پر ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ بدبخت ہے، بدقسمت ہے، نالائق ہے اگر وہ اتنا غفلیل ہو کر اور گھوڑے بیچ کر سو جائے! گھوڑے بیچ کر سونے کا کیا موقع ہے؟ جن لوگوں کی صفت یہ تھی کہ وہ دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر باطل سے پنجہ آزمائی کرتے تھے اور اللہ کی کبریائی کی شہادت دینے کے لیے سردھڑ کی بازی لگاتے تھے اور پھر رات کو مصلّی پر اپنے آقا کے حضور کھڑے ہوتے تھے، اس سے مناجات کیا کرتے تھے، وہ آخر کاہے کو جاگتے تھے؟ ان کو کونسا غم تھا؟ ان کو اگر فکر تھی تو یہی کہ بڑے کائیاں دشمن سے مقابلہ ہے، بڑے شاطر دشمن سے سابقہ ہے جس کے ایجنٹ شیطانوں میں بھی ہیں، جنوں میں بھی ہیں اور خود انسانوں میں بھی ہیں۔ اور، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اس زمانہ میں تو ابلیس کے بڑے ہوشیار اور چالاک ایجنٹوں کا پورے کا پورا لاؤ لشکر آپ کے داہنے بائیں اور آگے پیچھے موجود ہے۔ لہٰذا آپ کے لیے ازحد ضروری ہے کہ آپ کسی وقت غافل نہ ہوں۔ ہر وقت جاگتے رہیں، ہر وقت ہوشیار رہیں اور چوکس اور چوکنے رہیں۔ محاذِ جنگ پر جس طرح سپاہی سوتا ہے، اسی طرح سوئیں، جس طریقہ سے جاگتا ہے اسی طریقہ سے جاگیں۔ یہ اللہ کو معلوم ہے کہ اس مقابلہ میں بالآخر جیتے گا کون اور ہارے گا کون! لیکن آدمؑ کی ناخلف اولاد ہو گا وہ جو اس حقیقت سے غافل ہو؟ یاد رکھیے کہ اس کی یہ غفلت اس کو شیطان کے مقابلہ میں چاروں شانے چت کر دے گی۔

پس، میرے عزیزو! جاگتے رہو! آگاہ رہو! رات کو بھی، دن کو بھی، سوتے وقت بھی، اور جاگتے وقت بھی، ہر وقت ہوشیار رہو! دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے ہر سمت اور ہر طرف سے چوکنے رہو۔ اگر آپ اس حقیقت کو یاد رکھیں گے تو آپ صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں گے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ محاذِ جنگ پر ہر سپاہی کو ہتھیار کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور آپ کو بھی ہتھیار درکار ہے۔ یہ ہتھیار کیا ہے؟ تو جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے چیلنج کے جواب میں جو بات ارشاد فرمائی تھی، وہی ارشاد آپ کے لیے ہتھیار اور وہی چیز آپ کے لیے نسخہ، علاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ

'جا، میں انسانوں کی رہنمائی اور مدد کے لیے اپنی ہدایت اور اپنی کتاب نبیوں اور رسولوں کے واسطے سے نازل کروں گا جو لوگ میری کتاب (اور میرے انبیاء و رسل کی سنت کو) مضبوطی سے پکڑے رہیں گے، ان کو تو ہرگز گمراہ نہیں کر سکے گا، ہاں جو میری ہدایت کو چھوڑ دیں گے تو ان پر تیرا جادو بے شک چل جائے گا۔'

پس شکر کیجیے کہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کے پاس اللہ کی آخری کتاب بہ کمال و تمام موجود ہے۔ اس کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیے۔ اس کو ایصالِ ثواب کا نسخہ نہ سمجھ لیجیے بلکہ اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اس کے اوامر و نواہی کو معلوم کیجیے۔ اس کے احکام اور ان کی حکمتوں کو جاننے کی سعی کیجیے۔ اس کی دعوت کا شعور حاصل کیجیے۔ برے اعمال، نافرمانی، سرکشی طغیان و بغاوت کے ہولناک انجام سے آگاہی حاصل کیجیے اور ساتھ ہی ساتھ جو کچھ علم ہوتا رہے اس پر عمل کی جدوجہد شروع کیجیے اور دوسروں تک قرآن مجید کی دعوت کو نہایت دل سوزی کے ساتھ پہنچانے کی فکر کیجیے۔ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیجیے۔ اس کا حق اسی طرح ادا ہو گا۔ اس کو مضبوطی سے تھام لینے کا یہی مطلب اور مفہوم ہے۔ اس کے برعکس طرزِ عمل اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق ہے۔ ایسے طرزِ عمل کے ساتھ اس کی محبت کا دعویٰ لاف زنی ہے، بے وزن ہے، بے حقیقت ہے، جس کا پا آخر کار روز حساب میں کھل جائے گا۔

فطرت کے تازیانے

عزیزو! اب صرف ایک حقیقت اور یاد دلانا چاہتا ہوں اور وہ محض میرا تاثر نہیں ہے بلکہ میرے نزدیک ایک امرِ واقعہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری قوم کے اوپر اس وقت اسی قسم کے حالات پیش آ رہے ہیں جس قسم کے منذرات، تنبیہات اور جس قسم کے تازیانے بنی اسرائیل کے لیے نمودار ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں دعوت الی اللہ کی وراثت بنی اسرائیل سے چھین کر آپ کو دی گئی تھی۔ سورہ مائدہ آپ نے پڑھی ہوگی۔ پھر پڑھ لیجیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ 'میں بنی اسرائیل سے اس کی نافرمانی، کج روی اور خیانت کی وجہ سے یہ امانت چھین کر اب تمہارے حوالے کرتا ہوں لیکن اگر تم نے مجھ سے نقضِ عہد کیا، میری کتاب کو چھوڑا، میرے نبی سے منہ موڑا، میری شریعت کے ساتھ بغاوت کی، میرے ساتھ مکاری اور چالاکی کی تو تمہارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوگا جو بنی اسرائیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔' میرا تاریخ کا جو مطالعہ ہے، تاریخ سے میری مراد وہ تاریخ ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے اور کسی تاریخ کا میں عالم نہیں ہوں، میں اس مطالعہ کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ اس قوم پر اسی طرح کے حالات پیش آ رہے ہیں جس قسم کے حالات بنی اسرائیل کو پیش آئے تھے۔ یہ بڑا نازک وقت ہے۔ میرے عزیزو! کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا رہو۔ اسی طرح کے واقعات، حالات اور حادثات چند خاص اشخاص و افراد کی غلطیوں کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ یہ صورتِ حال پوری کی پوری قوم کے شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بڑے ہی نادان ہیں وہ لوگ جو چند اشخاص و افراد کو موردِ الزام گردان کر سارا زور بس ان کو مجرم ثابت کرنے پر لگا رہے ہیں۔ گویا باقی سب خیر سلا ہے۔ حالانکہ یہ منذرات، یہ تنبیہات، یہ حادثات اور یہ واقعات پوری قوم کی نافرمانی، سرکشی اور کرتوت کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں۔ ذرا غور تو کرو کہ ایک ہزار سال بعد ہم نے ہندو قوم کے آگے گھٹنے ٹیک دیے وہ بھی ایک عورت کے آگے! تقریباً ایک لاکھ اپنے لوگ بطور قیدی پکڑوا دیے! آدھے سے زیادہ ہمارا ملک ہاتھ سے نکل گیا!

یہ معمولی واقعات نہیں ہیں۔ بھائیوں کے ہاتھوں جس طریقہ سے بھائیوں کا خون بہا ہے، عزتیں پامال ہوئی ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جو بھیانک واقعات اخبارات میں آئے ہیں اگر ان کا پانچ فی صد بھی صحیح ہے تو کلیجہ شق کر دینے کو کافی ہے۔ لیکن ذرا غور کرو کہ ان کا کتنا تاثر ہماری قوم نے لیا ہے۔ اس وقت اس بچے کھچے ملک کے حصہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ اکبر! بھائی، بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے — زبان کی بنیاد پر، نسل کی بنیاد پر، کلچر کی بنیاد پر، علاقہ کی بنیاد پر۔ جو امتِ محمد (ﷺ) کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پر جمع کی گئی تھی جس کا کلمہ ایک، کتاب ایک، رسول ایک، قبلہ ایک، آج وہ کس طرح شیطان کے نرغہ میں پھنسی ہوئی ہے! بھائیو! میں پھر کہتا ہوں کہ یہ بڑا نازک وقت ہے، یہ اصلاح حال کا وقت ہے، یہ جوڑنے اور ملانے کا وقت ہے۔ یہ نفرت دلانے اور ایک دوسرے پر الزام لگانے کا وقت نہیں۔ اس سے آخر قوم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ ہم کسی ایک طبقے یا گروہ کو ملزم قرار دیں اور ان کو مجرم ثابت کریں کہ ساری خرابیوں کا باعث تم ہو اور وہ ہم پر الزام لگائیں اور ہمیں مجرم ثابت کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سب کے سب مجرم ہیں، پوری کی پوری قوم مجرم ہے، ہم سب اللہ کے نافرمان ہیں۔ پس ہم سب کو اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اس سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنی چاہیے، اس کی جناب میں ہم سب کو توبہ اور استغفار کرنا چاہیے! ہم سب کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور جس کے دور دور بھی آثار نہیں ہیں تو جان لینا چاہیے کہ قوم کی کشتی بالکل بھنور میں ہے، گرداب میں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ڈوبی کہ تب ڈوبی۔ معلوم نہیں کہ آپ لوگوں کو بھی حقیقت نظر آتی ہے یا نہیں، مجھے تو رات کے اندھیارے اور دن کے اجالے میں بصارت سے بھی اور بصیرت سے بھی یہی حقیقت نظر آتی ہے۔ عزیزو! آج وقت ہے کہ یوحنا و مسیح علیہما السلام کی طرح آپ کے اندر سے وہ لوگ اٹھیں جو پوری قوم میں توبہ کی منادی کریں، استغفار کی منادی کریں، اللہ سے اپنے تعلق کو استوار کرنے کی منادی کریں، نبی سے حقیقی تعلق جوڑنے کی منادی کریں۔ خلاف دین، خلاف اسلام کاموں سے اجتناب کی منادی کریں۔ سرکشی و نافرمانی سے بچنے

کی منادی کریں۔ حلال و حرام کی تمیز کی منادی کریں۔ اس وقت ان کاموں کے سوا دوسرے کام بالکل فضول ہیں۔ شاطر اسی طرح لڑتے رہیں گے اور ایک سے ایک بڑا عذاب مختلف شکلوں میں آتا رہے گا۔ ایسے بگڑے ہوئے معاشرہ میں جو اشخاص و افراد مسلط ہوں گے وہ بھی اللہ کے قہر کی نشانی ہوں گے۔ کسی کے اندر خیر نہیں ہے۔ ایک پارٹی اگر جائے گی تو جس قسم کے شر و فساد کے ساتھ وہ آئی تھی کوئی دوسری پارٹی بھی اسی طرح کے شر اور فساد کے ساتھ، ممکن ہے، مسلط ہو جائے۔ لیکن اس وقت محض ہاتھوں کے بدلنے میں بھلائی نہیں ہے، ملک کے لیے کوئی خیر نہیں ہے۔ ملک کی بھلائی اگر ہو گی تو ان ہی بے غرض لوگوں کے ہاتھوں ہو گی جو آج یوحنا و مسیح علیہما السلام کی طرح توبہ کی منادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ جو صاف صاف، بالکل حق، واضح طور پر بڑوں کے سامنے، چھوٹوں کے سامنے، پوری قوم کے سامنے وہی بات پیش کریں جو حق ہے۔ جو دین کا تقاضا ہے، جو ایمان کا تقاضا ہے۔ لیکن جان رکھو کہ یہ راستہ آسان نہیں ہے، بہت کٹھن ہے! ہو سکتا ہے کہ اس راہ میں تمہارے سر کاٹ کر ظالم لوگ اپنی معشوقاؤں کے سامنے تحفہ کے طور پر پیش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس راہ میں تمہیں سولی پر چڑھنا پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے وطن سے نکال دیے جاؤ۔ معلوم نہیں کہ اس راہ میں کیا کیا پیش آئے گا۔ بدر و احد اور خندق و حنین، اس راہ کی لازمی منازل ہیں۔ مستقبل کا علم صرف اللہ کو ہے۔ لیکن جو کچھ ہو گا اسی کے اندر تمہارے لیے خیر اور اسی کے اندر فوز و فلاح ہے۔ اس بات پر یقین رکھو۔ قرآن کی دعوت اور توبہ کی منادی کا کام لے کر اٹھ کھڑے ہو جاؤ۔ شاید اللہ تعالیٰ تمہاری اس سرفروشانہ ادا کو پسند فرما لے اور تمہاری قوم کو بچا لے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ قوم کی کشتی بھنور میں ہے۔

آخر میں، میں اپنے لیے اور آپ کے لیے، دونوں کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو حق کی معرفت عطا فرمائے اور حق پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ دسمبر ۱۹۷۲ء)

پاکستان میں دینی تعلیم کا حال و مستقبل اور ہماری ذمہ داری

[یہ تقریر ۳ ستمبر ۱۹۶۴ء کی شام کو 'شام ھمدرد' کی تقریب میں، پارک لگژری ہوٹل لاہور میں کی گئی۔]

حضرات!

میں جناب حکیم صاحب (۱) محترم کا صدق دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کے لیے آپ کے سامنے اظہار خیال کا ایک موقع فراہم کیا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک ایسے مسئلے کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو میرے لیے ایک درد دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس درد کی کوئی کسک میں آپ کے دلوں میں بھی پیدا کر سکا تو سمجھوں گا کہ میرا یہاں آنا فائدے سے خالی نہیں رہا۔ اگرچہ ایک طبیب حاذق کی ترتیب دی ہوئی اس مجلس میں میری طرف سے درد کا تحفہ تقسیم کیا جانا بظاہر ایک ناموزوں سی بات ہے۔ اطبا کے پاس لوگ دوا کے لیے آیا کرتے ہیں، نہ کہ درد کے لیے۔ لیکن آپ اطمینان رکھیں، میں جو درد تقسیم کرنا چاہتا ہوں وہ سر کا درد نہیں بلکہ دل کا درد ہے۔ دل کے متعلق تو شاید آپ بھی یہ تسلیم کرتے ہوں گے کہ اس کی صحت و زندگی تمام تر اس کی دردمندی ہی

۱۔ جناب حکیم محمد سعید صاحب دہلوی

میں منحصر ہے۔ اگر دل میں درد نہ ہو تو پھر دل، دل نہیں ہے بلکہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے، جو سینے میں چھپا کر رکھنے کی چیز نہیں بلکہ زمین پر پھینک دینے کی چیز ہے۔

حضرات! آپ جیسے ہوشمند لوگوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہو سکتی کہ ہم مسلمان نسل ونسب، رنگ وخون، ملک ووطن اور اراضی وجغرافیائی حد بندیوں کی پیدا کی ہوئی کوئی قوم نہیں ہیں۔ ہم اس طرح وجود میں نہیں آگئے ہیں جس طرح کیکر کی جڑ سے دوسرا کیکر اور آم کی گٹھلی سے دوسرا آم پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ بلکہ ہم ایک مخصوص نظریہ حیات، ایک مخصوص نظام عقائد واعمال اور ایک مخصوص طرز زندگی سے ترکیب پائی ہوئی ایک ملت ہیں جس کا نام اسلام ہے۔ یہی اسلام ہے جو ہمیں دوسروں سے الگ کرتا اور آپس میں ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ یہی خلق اور خالق کے ساتھ ہمارے حقوق وفرائض کی حد بندی کرتا ہے۔ یہی ہماری دنیا اور عقبیٰ دونوں کی کامیابیوں کا ضامن ہے اور ہمارے رب کی طرف سے اسی پر جینے اور اسی پر مرنے کا ہم سے مطالبہ ہے۔

حضرات! قاعدہ ہے کہ جو چیز جن عناصر سے ترکیب پاتی ہے انہی عناصر پر اس کی صحت و زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر وہ عناصر مناسب مقدار میں موجود ہیں تو وہ چیز صحیح حالت میں رہتی ہے، اگر وہ کم ہو جائیں تو وہ چیز کمزور ہو جاتی ہے اور اگر وہ مفقود ہو جائیں تو وہ چیز بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو آپ خود اپنے جسم کی مثال سے نہایت بہتر طریقے پر سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کا جسم جن اجزاء سے مرکب ہے انہی اجزاء کی متناسب موجودگی سے وہ توانا اور صحت مند رہتا ہے۔ اگر وہ اجزاء تحلیل ہو جائیں اور آپ اس کے لیے مناسب غذا اور احتیاط سے بدل ما تحلل نہ فراہم کرتے رہیں تو آپ کمزور یا مریض ہو جاتے ہیں اور آپ کو کسی حاذق حکیم کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو آپ کا معائنہ کر کے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ آپ نے اپنی بد احتیاطیوں سے اپنے جسم کے کن اجزائے ترکیبی کو نقصان پہنچایا اور پھر اس سے آپ کے نظام جسمانی میں کیا کیا خلل واقع ہوئے ہیں اور اب ان کی اصلاح یا تلافی کے لیے کیا کیا احتیاطیں اور کیا کیا غذائیں اور دوائیں

ضروری ہیں۔ میں کوئی طبیب نہیں ہوں لیکن اتنی بات تو ایک عامی بھی جانتا ہے کہ غذا ہو یا دوا اس سے اصل مقصود انہی عناصر کو مدد پہنچانا ہوتا ہے جن سے ہمارے جسم کی تعمیر ہوئی ہے۔ اگر کبھی ہم محض اپنے اندر ایک جوش یا نشاط پیدا کرنے کے لیے کوئی ایسی چیز استعمال کر بیٹھتے ہیں جو ہمارے اصل تعمیری اجزا سے موافقت نہیں رکھتی تو اس سے ایک وقتی جوش و ہیجان تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے، جسے ہم غلط فہمی سے علامت صحت خیال کر لیتے ہیں، لیکن بالآخر اس کا ردعمل نہایت برا ہوتا ہے جس سے بسا اوقات ہم اپنا مزاجی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔

ٹھیک اپنے جسم ہی پر آپ اپنے جسدِ ملی کو قیاس کیجیے۔ ہمارے جسد ملی کے ضعف و قوت اور مرض و صحت کا انحصار بھی انہی اجزاء کی کمی بیشی اور عدم و وجود پر ہے جن سے اس کی تشکیل ہوئی ہے۔ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ اس کی تشکیل نسل، نسب، خون، رنگ اور وطن کے روابط یا محض زبان اور تہذیب کے اشتراک سے نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ جس چیز نے اس کو ریڑھ کی ہڈی بخشی ہے وہ قرآن ہے۔ جس چیز نے اس کو ایک حسین و جمیل پیکر دیا ہے وہ نبی ﷺ کی سنت ہے۔ جس چیز نے اس کو بنیان مرصوص بنایا ہے وہ کلمہ لا الہ الا اللہ کا رابطہ ہے اور جس چیز نے اس کے اندر زندگی، حرارت اور فدویت و قربانی کا خون دوڑایا ہے وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور ان کی محبت ہے۔ اگر آپ مانتے ہیں کہ فی الواقع ملت اسلامیہ کی تعمیر و تشکیل انہی چیزوں سے ہوئی ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس واضح حقیقت سے انکار کی جرأت کیسے کر سکتا ہے، تو مجھے یہ سوال کرنے کی اجازت دیجیے کہ کیا ہم مسلمان ان چیزوں سے بے نیاز ہو کر دنیا میں قائم رہ سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ میں سے ہر شخص اس سوال کا جواب نفی ہی میں دے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ میرا یہ سوال ملت اسلامیہ کے متعلق بحیثیت ملت اسلامیہ ہے، یعنی جس حیثیت میں وہ خیر امت قرار دی گئی ہے اور اس کو شھداء اللہ فی الارض کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے۔ اپنی اس مخصوص حیثیت میں قائم رہنے اور اس حیثیت سے اس کے ترقی کرنے کی واحد شکل اگر کوئی ہو سکتی ہے تو یہی ہو سکتی ہے کہ جن اجزائے فکری و اعتقادی اور جن

عناصر ایمانی و اخلاقی سے وہ وجود پذیر ہوئی ہے ان کا شعور و اعتقاد اس کے تمام افراد میں اگر نہیں تو کم از کم بیشتر میں زندہ اور متحرک رہے۔ اگر یہ زندہ و متحرک نہ رہے تو سمجھیے کہ ملت مردہ ہے اگرچہ اس کے قبضے میں دنیا جہان کے تمام اسباب و وسائل موجود ہوں۔ اگر آپ اس کے اندر زندگی کی حرکت پیدا کرنے کے لیے کوئی ایسا خارجی محرک لا گھسائیں گے جو خود اس کے اپنے مزاج سے بیگانہ ہو گا تو اس سے اس کے اندر وقتی طور پر ایک حرکت تو شاید پیدا ہو جائے گی لیکن یہ حرکت اس کی اپنی فطرت حرکت سے بالکل مختلف ہو گی۔ اس کی مثال بالکل ویسی ہی ہوگی جس کا ذکر کچھ عرصہ پہلے اخباروں میں آیا تھا کہ کچھ بوڑھوں پر اعادۂ شباب کا تجربہ کرنے کے لیے ان کے اندر بندروں کے غدود منتقل کیے گیے تو اس سے ان کے اندر زندگی کی حرکت تو پیدا ہوئی لیکن وہ حرکت انسانوں کے مقابل میں بندروں کی حرکات سے زیادہ مشابہ تھی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر صرف الٹی سیدھی کوئی حرکت ہی مطلوب ہو تب تو یہ کسی بھی ہنگامی نعرے سے پیدا کی جا سکتی ہے -- اور آج ہمارے مسلمان ممالک میں لیڈر حضرات اس قسم کے نعروں کا تجربہ بھی کر رہے ہیں -- لیکن پیش نظر اگر صرف کوئی حرکت نہیں بلکہ صحیح قسم کی حرکت اس نصب العین کی راہ میں مطلوب ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کی بعثت فرمائی ہے تو مجھے بتائیے کہ اس کی تدبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان افکار و عقائد اور ان اصول و مقاصد کا صحیح شعور و احساس قوم میں پیدا کیا جائے جن کے شعور و احساس ہی نے اس کو وجود بخشا تھا؟

حضرات! یہ شعور و احساس نہ تو کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد ہے جو آپ سے آپ باپوں سے بیٹوں کو منتقل ہوتی رہے اور نہ یہ کوئی سادہ سا منتر ہے جو جب آپ چاہیں لوگوں کے کانوں اور دلوں کے اندر پھونک دیں۔ بلکہ اس کے پیدا کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کے ایک ایسے سلسلے کی ضرورت ہے جو ہماری پوری زندگی پر حاوی ہو۔ جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ قرآن کیا ہے اور اس نے ہمیں کیا رہنمائی دی ہے؟ ہمارے پیغمبر ﷺ کی

بعثت کس مقصد سے ہوئی اور ہمارے تعلق کی نوعیت آپ کے ساتھ کیا ہے؟ ہمارا قانون کیا ہے اور وہ کن پہلوؤں سے دنیا کے تمام قوانین سے بالاتر ہے؟ ہمارا فلسفہ کیا ہے اور کن اعتبارات سے وہ دنیا کے تمام فلسفوں پر ترجیح رکھتا ہے؟ ہماری تاریخ کیا ہے اور کس طرح وہ دنیا کی تمام تاریخوں سے شاندار اور روشن ہے؟ ہمارا نظام زندگی کیا ہے اور کن پہلوؤں سے اس کو دنیا کے تمام نظاموں پر فوقیت حاصل ہے؟ اس وقت تک ہم کیا جان سکتے ہیں کہ ہم خود کیا ہیں، دنیا میں کیوں آئے ہیں، اور ہمیں کس مقصد کے لیے جینا اور کس عشق میں مرنا ہے؟

یہ کام نہایت وسیع وعمیق کام ہے جو اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہمارا نظام تعلیم وتربیت اس کی ذمہ داری اٹھائے۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک مدت سے ہمارے ہاں جو نظام تعلیم وتربیت رائج ہیں وہ دوسرے پہلوؤں سے اپنے اندر جو افادیت بھی رکھتے ہوں لیکن مذکورہ بالا مقصد کے لحاظ سے ان کی افادیت بمنزلہ صفر ہے! بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہو کہ اس مقصد کے لیے وہ مفید ہونے کے بجائے الٹے مضر ہیں۔ میری یہ رائے ملک میں رائج دونوں ہی نظاموں سے متعلق ہے۔ اس نظام سے متعلق بھی جو قدیم کہلاتا ہے اور اس نظام سے متعلق بھی جو جدید کے نام سے موسوم ہے اور جس کو ملک کے اصلی نظام تعلیم وتربیت کی حیثیت حاصل ہے۔ میں مختصراً ان دونوں کی نوعیت آپ کے سامنے واضح کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ ملی واسلامی نقطہ نظر سے ان کی حیثیت کیا ہے۔ میں پہلے جدید نظام تعلیم کو لیتا ہوں۔

جدید نظام تعلیم کے متعلق آپ یہ جانتے ہیں کہ اس کا تحفہ ہمیں انگریزوں سے ملا ہے۔ اس کو جب انہوں نے ہمارے ملک میں رائج کیا ہے تو ان کے پیش نظر نہ تو یہ بات تھی اور نہ ہو سکتی تھی کہ اس سے ہمارے اندر خود شناسی پیدا ہو۔ یعنی ہم اپنے آپ کو پہچانیں کہ ہم کیا ہیں۔ بلکہ واضح طور پر اس سے ان کا مقصود ہمارے اندر انگریز شناسی یا انگریزی شناسی پیدا کرنا تھا تا کہ ان کو اپنے دفتروں کے لیے سستے اور وفادار خادم مل سکیں۔ اس

مقصد کے لیے ظاہر ہے کہ ہماری مذہبی تعلیم کی ان کو مطلق ضرورت نہ تھی۔ سیاسی اعتبار سے بھی وہ ہماری مذہبی تعلیم کو ایک خطرناک چیز سمجھنے پر مجبور تھے۔ اس لیے کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ مسلمانوں کے اس دور زوال میں بھی اس تعلیم سے سید احمد شہیدؒ اور اسماعیل شہیدؒ پیدا ہو سکتے ہیں۔ محض وقتی ضروریات اور مسلمانوں کی ذرا دلداری کے خیال سے انہوں نے اس کا کوئی حصہ اپنے نظام تعلیم میں سمونے کی کوشش بھی کی تو اول تو اس کی حیثیت اکبر مرحوم کے الفاظ میں بادہ گلگوں میں زمزم کے چند قطروں سے زیادہ نہ تھی، پھر ان قطروں کو بھی انہوں نے تحلیل کیمیاوی کے ذریعہ سے اچھی طرح صاف کر لیا تھا کہ ان میں کوئی ایمانی جرثومہ باقی نہ رہ جائے!

اس نظام تعلیم نے ہماری قوم کے کھاتے پیتے گھرانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس کے جو برے اثرات ان پر پڑنے تھے وہ بھی پڑے لیکن پھر بھی یہ خیریت تھی کہ غرباء کے لیے اس تعلیم کے دروازے پوری طرح کشادہ نہ تھے اس وجہ سے وہ اس کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہو سکے۔ ان میں سے جس کو تعلیم کا شوق ہوا وہ اس مذہبی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا جس کے مرکز مسجدیں، دینی مدرسے اور مختلف علماء کے حلقہ ہائے درس تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ انگریز، انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب وتمدن سے ہمارے شرفاء کے بھی ایک طبقے میں خطرے کا احساس موجود تھا اس وجہ سے انگریزی تعلیم کی ساری کوششوں کے باوجود یہ طبقہ مذہب اور مذہبی روایات سے وابستہ رہا اور اس طرح کچھ نہ کچھ مذہبی تعلیم کا بھی بھرم قائم رہا۔

انگریزوں کی غلامی سے رہائی کے بعد ہونا تو یہ تھا کہ سب سے پہلے ہمارے نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی ہوتی کہ یہ ہمارے ملی واسلامی تقاضوں کو پورا کرنے والا بن سکتا، ہم دوسروں کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعے سے خود اپنے کو بھی پہچان سکتے اور جدید کے استفادہ کے ساتھ ساتھ اپنے قدیم سے بھی روشنی اور رہنمائی حاصل کر سکتے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم پوری وفاداری کے ساتھ اسی نظام تعلیم کو اپنائے ہوئے

ہیں جو انگریزوں سے ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ اس میں اگر کوئی تبدیلی ہوئی بھی ہے تو دینی و اسلامی نقطہ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اور جہاں تک اس نظام تعلیم کی کشش کا تعلق ہے وہ تو انگریزوں کے دور کے لحاظ سے اب ہزار گنی بڑھ گئی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں اس سے ایک طبقہ میں جو بے گانگی تھی وہ نہ صرف دور ہوگئی ہے بلکہ وہ عقیدت و محبت سے بدل گئی ہے۔ انگریزوں کی اسلام دشمنی کے سبب سے دین اور دینی تعلیم کے لیے ہمارے دلوں میں حمیت و حمایت کا جو جذبہ تھا وہ اب سرد پڑ چکا ہے۔ ہر درجے کی ملازمت اور ہر میدان میں مسابقت کی راہ اس تعلیم نے اب ہر طبقے کے لیے کھول دی ہے اس وجہ سے ہر شخص کا قبلہ و کعبہ اب یہی ہے۔ اب غرباء کے لیے بھی اس کے دروازے کشادہ ہیں اس وجہ سے اب ان کے بچے بھی مسجدوں اور عربی مدرسوں کے بجائے سکولوں اور کالجوں ہی کے رخ کرتے ہیں۔ بس کوئی ایسا ہی مظلوم و مسکین ہوتا ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا تو وہ عربی مدرسوں کی طرف نکل پڑتا ہے کہ

اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

دینی تعلیم کے جو ادارے ہمارے ملک میں تھے یا ہیں اس اعتبار سے تو وہ تمام دینی حس رکھنے والے مسلمانوں کے شکریے کے مستحق ہیں کہ آج ہمارے ملک میں جتنا کچھ بھی قال اللہ وقال الرسول کا چرچا ہے بہرحال انہی کا فیض ہے۔ یہ اگر نہ ہوتا تو انگریزی اقتدار کے بعد ہمارے ملک میں جو انقلاب آیا تھا وہ شاید ہمیں اتنا بدل دیتا کہ ہمارے اندر نکاح اور جنازے کی نماز پڑھانے والے بھی مشکل ہی سے ملتے! لیکن ان کے اس احسان کے اعتراف کے ساتھ اس امر واقعی کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ مدارس ایک مدت دراز سے ایسے جمود میں مبتلا ہیں کہ ان سے اس سے زیادہ خدمت کی توقع نہیں جا سکتی تھی جو انہوں نے انجام دی۔ اول تو یہ مدارس جس نصاب تعلیم اور جس طریقہ تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں وہ وقت کی ضروریات اور زمانہ کے حالات سے اتنا بے گانہ ہے کہ اب اس کے اندر نہ تو کوئی افادیت باقی رہی ہے نہ کوئی کشش۔ یہ نصاب جس زمانے

میں اختیار کیا گیا تھا اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے موزوں اور دین و دنیا دونوں کا جامع تھا۔ ضرورت تھی کہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے قرآن، حدیث اور فقہ کے سوا نصاب کے دوسرے اجزاء بدل جاتے لیکن ہمارے دینی مدارس کے کارفرماؤں نے کئی سو سال پہلے کے نصاب کو بھی تقدیس کا یہ درجہ دے رکھا ہے کہ اس میں کسی ترمیم کو گناہ سمجھتے ہیں۔ طریقہ تعلیم بھی ان مدارس کا اتنا جان لیوا ہے کہ نئی نسل اس کا کسی طرح تحمل نہیں کر سکتی۔ اس نصاب اور اس طریقہ تعلیم کی اصلاح کے لیے جو کوششیں ہوئیں وہ ایک خاص دائرے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ جمود ان کے سامنے روک بن کر کھڑا ہو گیا۔

ان مدارس کے گروہی رجحانات بھی ملی نقطہ نظر سے مضر ثابت ہوئے۔ دینی مدارس بالعموم الگ الگ فقہی مسالک کی بنیادوں پر قائم ہوئے اور انہی پر اب تک قائم چلے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ یہ مدارس کتاب و سنت کی بنیادوں پر قائم ہوتے اور پوری فقہ اسلامی کی خدمت کرتے اور اس کو آگے بڑھاتے تاکہ ان کے فارغین وسیع زاویہ نگاہ کے حامل بن کر اٹھتے اور مخصوص اپنے فرقے کی ترجمانی کرنے کے بجائے پوری ملت اسلامیہ کی خدمت کرتے اور تمام نوع انسان پر اللہ کے دین کی شہادت دیتے۔ اس طرح ان کے اندر نہ صرف رواداری بلکہ تحقیق و اجتہاد کی وہ روح بھی پیدا ہوتی جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

ان مدارس نے اپنے سامنے مطمح نظر بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رکھا۔ عام طور پر مدرسی، امامت، فتویٰ نویسی، وعظ گوئی، مناظرہ اور ایک محدود معنی میں تبلیغ تک ان کی نگاہ محدود رہی۔ ہر چند یہ کام بھی ضروری تھے لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ عام طور پر ہمارے دینی مدارس کے فارغین علمی و عملی زندگی کے دوسرے میدانوں میں نمایاں نہ ہو سکے۔ صرف وہی لوگ اس سے مستثنیٰ رہے جو غیر معمولی دل و دماغ کے مالک تھے اور جن کی رہنمائی ان مدرسوں سے زیادہ خود ان کے عزم و ہمت نے کی۔

یہ جمود ان مدارس پر بہت پہلے سے طاری تھا اور اس کو بڑا دخل ہے اس زوال کو ہم پر مسلط کرنے میں جو مغربی اقوام، بالخصوص انگریزوں، کے ہاتھوں ہم پر مسلط ہوا۔ لیکن انگریزوں کے حکمران ہو جانے کے بعد اس جمود پر مسکنت اور کس مپرسی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اس لیے کہ حکومت کے انقلاب کے بعد ان کی مادی سرپرستی کا انحصار بیشتر غرباء اور عام مسلمانوں کے صدقات وزکوٰۃ پر رہ گیا اور ان سے فائدہ اٹھانے والے بھی بیشتر اسی طبقہ کے لوگ رہ گئے ہیں جن کو انگریزی تعلیم کی آسانیاں حاصل نہ تھیں۔ گویا انگریزوں کے بعد سے ہمارے ہاں دینی تعلیم اگر زندہ رہی ہے تو وہ زیادہ تر عوام اور غرباء کے واسطہ سے زندہ رہی ہے۔ حکومت اور امراء کے طبقہ کا حصہ اس میں محض برائے نام ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد اگر ہمارے اندر اپنے ملی نصب العین کا احساس ہوتا تو دینی تعلیم ہی ہمارے سارے نظامِ تعلیم کی بنیاد بنتی اور اسی بنیاد پر ہم تمام علومِ جدیدہ کی عمارت قائم کرتے۔ لیکن ہوا یہ کہ یہاں جس نسبت سے جدید تعلیم کو فروغ ہوا اسی نسبت سے دینی تعلیم کو زوال ہوا۔ اول تو یہ علاقہ دینی تعلیم کے لحاظ سے تقسیم سے پہلے بھی کچھ زیادہ زرخیز نہ تھا، ہماری دینی تعلیم کے جو بڑے بڑے ادارے تھے وہ سارے کے سارے ان صوبوں میں تھے جو بھارت کے قبضہ میں چلے گئے۔ مشہور کتب خانے بھی انہی صوبوں میں تھے۔ یہاں جو مدارس تھے یا قائم ہوئے اول تو وہ کچھ زیادہ باوقار نہ تھے اور اگر کچھ تھے بھی تو یہاں جدید تعلیم و تہذیب کی بہتی ہوئی گنگا کو چھوڑ کر کس کی شامت آئی ہوئی ہے کہ وہ عربی مدارس کی خشک گردانوں میں اپنی اوقات رائگاں کرے! چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جو دینی ادارے یہاں قائم ہیں ان کے لیے سرمایہ کی فراہمی سے زیادہ مشکل کام طلبہ کی فراہمی کا ہے۔ اگر روٹی، کپڑا اور کتاب سب کچھ دے کر کچھ طلبہ کسی طرح حاصل بھی ہوتے ہیں تو ان میں شوقِ علم رکھنے والے شاید پانچ فی صد بھی نہیں ہوتے۔ زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن کا مقصد محض اوقات گزاری ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں دینی مدارس کا یہ حال ہے اور یہی مدارس ہیں جن سے حاملین دین

کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ رہے وہ علماء جو پہلے سے موجود تھے یا تقسیم ملک کے بعد یہاں آئے ان میں سے جو صفِ اول کے تھے ان میں سے اکثر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ جو چند باقی ہیں وہ چراغِ سحری ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کب ہم ان سے بھی محروم ہو جائیں۔ اس موقع پر میں آپ کو حضور نبی کریم ﷺ کی وہ حدیث یاد دلاتا ہوں جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے اندر سے علم دین کے اٹھا لیے جانے کی شکل یہ نہیں ہوگی کہ علم لوگوں کے سینوں سے نکال لیا جائے گا بلکہ علماء اٹھا لیے جائیں گے اور دین سے بے خبر جہلاء باقی رہ جائیں گے۔ وہ بلا علم فتوے دیں گے، خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو گمراہ کریں گے۔

حضرات! اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بحیثیت امت مسلمہ اس دنیا میں قائم رہنے کے لیے ہم سب سے زیادہ دین اور دینی تعلیم کے حاجت مند ہیں تو میں آپ کو اس صورت حال پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں جس سے ہم اس وقت اپنے ملک میں دوچار ہیں۔ میں نے اختصار کے خیال سے صرف اپنے ہی ملک کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرے مسلمان ملکوں میں صورت حال اس سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے مسلمان ملکوں میں دینی تعلیم پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اب تو اگر اس کی کچھ رمق باقی تھی تو پاک و ہند کے دینی مدارس اور ان کے علماء کے ذریعہ سے باقی تھی۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہاں مسلمانوں کا قومی وجود ہی خطرے میں ہے، دین اور دینی تعلیم کا کیا سوال! رہے آپ تو آپ کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ آپ اس ملک کے سب سے زیادہ تاریخی شہر کے معزز شہری ہیں۔ یہ شہر آپ کی تہذیب اور آپ کے علوم کا ایک اہم مرکز رہ چکا ہے، اس کی خاک میں بڑے بڑے علماء و صوفیہ دفن ہیں۔ میں نے آپ کے سامنے یہ سوال اس لیے رکھا ہے کہ آپ غور کریں کہ دینی تعلیم کے تحفظ کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے اور آپ اس میں اپنا حصہ کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟

سب سے زیادہ صحیح اور نتیجہ خیز چیز تو یہ تھی کہ اس ملک کا نظامِ تعلیم ہی از سرِ نو اسلام کی

بنیاد پر اٹھایا جاتا کہ دین سارے نظام تعلیم و تربیت کی روح بن جاتا اور ہم ایک ہی نظام تعلیم سے قدیم و جدید دونوں کی برکتیں حاصل کرتے۔ لیکن یہ محض آرزو ہے اور مجھے یہ آرزو اتنی بعید معلوم ہوتی ہے کہ میں اس کے لیے کوشش اور جدوجہد کرتے رہنے کا مشورہ دینے کے باوجود یہ کہوں گا کہ اس آرزوئے خوش کے پیچھے دوسری چھوٹی بڑی تدبیروں سے ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔ نظام تعلیم کی تبدیلی کا کام نظام تعلیم کے کارفرماؤں کا ہے۔ ان حضرات کے متعلق یہی کہنا مشکل ہے کہ یہ دینی تعلیم کی قرار واقعی اہمیت سمجھتے بھی ہیں یا نہیں! اب تک تو ان کی طرف سے جو کچھ سامنے آیا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دین کا دائرۂ عمل ان کے ہاں بھی مسجدوں سے آگے نہیں ہے اور اگر ہے تو اس میں ان کا اعتماد اس ٹائپ کے لوگوں پر ہے جو دین کو مستشرقین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ البتہ ہم اور آپ اگر اس کام کی اہمیت سمجھیں تو کچھ نہ کچھ اس کے تحفظ کے لیے کر سکتے ہیں۔ مثلاً

۱) ایک چیز تو یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس اگر علم دین کے بقا کو عزیز رکھتے ہیں تو وہ بلا تاخیر اپنے نصاب تعلیم کو بدل کر اس کو آسان، مختصر اور زمانہ حال کی ضروریات کے مطابق بنائیں۔ عربی نحو و صرف اور عربی زبان کی تعلیم جدید طریقے پر دی جائے قرآن، حدیث اور فقہ کے سوا دوسری غیر ضروری چیزیں نصاب سے نکال کر انگریزی زبان اور دوسرے بعض عمرانی علوم کی کتابیں داخل کی جائیں تاکہ ان مدارس سے ایسے علماء پیدا ہوں جو دین کے ساتھ زمانہ حال کے تقاضوں کو بھی سمجھ سکیں۔

۲) عربی مدارس اپنے ہاں ایک مختصر مگر جامع نصاب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ان کے طلبہ کے لیے بھی رکھیں جو عربی زبان اور علم دین کے حصول کا شوق رکھتے ہیں اور ان کے اوقات فرصت میں ان کو استفادہ کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس طرح جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اندر سے ایک اچھی تعداد ایسے نوجوانوں کی نکل آئے گی جو دین کی خدمت کر سکیں گے۔

۳) ملک کے جید علماء اپنے اپنے ہاں حلقہ ہائے درس قائم کریں جن میں اس امر کا اہتمام کریں کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے جن کے اندر دین کا شوق ہے وہ ان کے درس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ درس محض تبرک کی نوعیت کے نہ ہوں بلکہ تعلیمی نوعیت کے ہوں تاکہ تعلیم دین کے نقطۂ نظر سے مفید ہو سکیں۔ میں ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ اگر روزانہ صرف دو گھنٹے بھی اس کام پر صرف کیے جائیں تو تین سال کے عرصے میں یونیورسٹیوں کے فارغین کی ایک جماعت کو عربی زبان اور پورے دین کی تعلیم دی جا سکتی ہے جو ہر میدان میں دین کی خدمت کر سکتے ہیں اور یہ اللہ کا فضل ہے کہ ابھی ہماری قوم میں علم دین کے ایسے قدرداں موجود ہیں۔

۴) بڑے شہروں میں اسلامی ہاسٹل قائم کیے جائیں جن میں کالجوں کے طلبہ کے لیے قیام اور اسلامی تعلیم و تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

حضرات! یہ سارے کام اسی صورت میں ممکن ہیں جب ملک کے ہوشمند اور دردمند لوگ اس کام کی اہمیت سمجھیں، دوسروں کو اس کی اہمیت سمجھائیں اور جہاں بھی کام کرنے کا امکان ہو اس کی راہیں ہموار کریں اور جہاں کام ہو رہا ہو اس میں ہاتھ بٹائیں۔ یہ کام صرف علماء ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے جس کو اس ملک میں اسلام کا مستقبل عزیز ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس ملک میں خیر امت اور شہداء اللہ فی الارض کی حیثیت سے سربلند ہوں اور ہماری سربلندی اللہ کے دین کی سربلندی ہو۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ ستمبر ۱۹۶۳ء)

علم اور ذرائع علم

[یہ تقریر انجمن فاضلین ادارۂ تعلیم، جامعہ پنجاب کے ایک اجلاس میں ۱۹۶۶ء میں کی گئی۔]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اصل چیز جو انسان کو حیوانات سے ممیز کرتی ہے، وہ علم و ادراک ہے۔ جہاں تک دوسری خصوصیات و صفات کا تعلق ہے۔ مثلاً کھانے پینے میں، بھاگنے دوڑنے میں، توالد و تناسل میں، حیوانات نہ صرف انسان کے شریک و سہیم ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان صفات میں وہ انسان پر مختلف اعتبارات سے بالاتری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ لیکن علم و ادراک کی صفت انسان کے اندر ایک ایسی صفت ہے جس کی بدولت انسان نہ صرف تمام حیوانات پر حکمران ہے بلکہ پہاڑوں اور سمندروں کی تسخیر کرتا ہے، ہواؤں پر حکومت کرتا ہے، ستاروں پر کمند ڈالتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو فرشتوں پر بھی بازی لے گیا ہے۔

اسی وجہ سے دنیا کی قدیم ترین سچائیوں میں سے ارسطو کی یہ بات بھی ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ھے۔ ناطق کے معنی جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ 'دریابندۂ معقولات' کے ہیں یعنی انسان صرف محسوسات ہی کا علم نہیں رکھتا بلکہ معقولات کی دریافت بھی کرتا ہے اور اس کی یہی صفت ہے جو اسے حیوانات سے الگ کرتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو انسان بھی حیوانات کی مختلف قسموں میں سے ایک قسم کا حیوان ہوتا اور اگر سب سے نہیں تو بہت سی

قسموں سے تو ضرور فروتر ہوتا۔

حضرات! انسان کی یہی جبلت ہے جس کی وجہ سے انسان کا بچہ ابھی ماں کی گود ہی میں ہوتا ہے کہ ہر چیز سے متعلق کیا کیوں اور کس طرح کے سوالات کی بھرمار سے ماں اور باپ کو تنگ کر دیتا ہے۔ اسی جبلت کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے قدرت نے انسان کو عقل سے نوازا ہے جو انسان کی تمام خصوصیات میں سے اعلیٰ ترین خصوصیت اور اس کے تمام کارناموں اور اس کی کامرانیوں کا سرچشمہ ہے۔

جبلی اور فطری تقاضا ہونے کی وجہ سے ہر انسان کے اندر علم کی طلب لازماً پائی جاتی ہے۔ لیکن جس طرح ہر فطری طلب موانع و مشکلات اور ماحول کی مزاحمتوں کی وجہ سے دب جاتی ہے یا غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح یہ طلب بھی بہت سے لوگوں کے اندر مغلوب یا پراگندہ ہو جاتی ہے۔ لیکن ہے انسان کے اندر یہ اتنی شدید کہ یہ مردہ کبھی نہیں ہوتی اور اس دنیا میں بے شمار انسان ایسے گزرے ہیں جن کے اندر مزاحمتوں کے علی الرغم یہ داعیہ اس زور سے ابھرا ہے کہ انہوں نے کسی مزاحمت کی بھی پروا نہیں کی ہے اور اس راہ میں ایسی قربانیاں دی ہیں کہ انسانیت ان پر ہمیشہ فخر کرے گی اور درحقیقت ایسے ہی جانبازوں کے کارنامے ہیں جن سے آج نہ صرف علم و فن کے بازار کی رونق ہے بلکہ دنیا کی ساری بہار انہی کی لائی ہوئی ہے!

حضرات! میری اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ علم، انسان کی سب سے اعلیٰ طلب ہے اور اس طلب کے بروئے کار آنے کا ذریعہ اس کی عقل ہے۔ انسان کی ساری فتوحات اس کے دم قدم سے ہیں۔ یہ نہ ہو تو یہ دنیا بالکل تاریک ہو جائے۔ اس وجہ سے میں ان فلسفیوں سے متفق نہیں جو عقل کی کج اندیشیوں اور گمراہیوں کی داستان اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ عقل انسان کی رہنمائی کے لیے نہیں بلکہ اس کو گمراہ کرنے کے لیے قدرت نے اس کے ساتھ لگا دی ہے۔ عقل کو اس طرح مطعون کرنا

میرے نزدیک ایک قسم کا مغالطہ ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ عقل بہت حفاظت اور بڑی تربیت کی محتاج ہے۔ حفاظت سے میرا مقصد یہ ہے کہ انسانیت کا تمام شرف چونکہ اسی پر منحصر ہے، اس وجہ سے سب سے بڑی ضرورت انسانیت کی یہ ہے کہ انسان کا یہ جوہر کسی غلط ہدف پر ضائع نہ ہو بلکہ اسی مقصد پر صرف ہو جس مقصد کے لیے قدرت نے اس کو انسان کے اندر ودیعت کیا ہے۔

تربیت سے میرا مقصد یہ ہے کہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں کہ یہ برابر ترقی کرتی رہے اور اس پر کبھی جمود اور اندھی تقلید کا رنگ چڑھنے نہ پائے۔ اس مقصد کے لیے دنیا میں اس قسم کے اداروں کا وجود ہو جن میں سے ایک ادارے میں آج مجھے یہ تقریر کرنے کی عزت حاصل ہوئی ہے۔ میرے نزدیک ان اداروں کا اصل مقصد کتابوں کی تعلیم و تدریس نہیں بلکہ عقل کی ایسی تربیت ہے کہ یہ حصولِ علم کی راہ میں ہمیشہ سرگرم رہ سکے۔

حضرات! لیکن عقل کی اس فضیلت کے ساتھ ساتھ اس بات کو یاد رکھیے کہ عقل نہ تو بے خطا چیز ہے اور نہ اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ جس طرح مادیات و محسوسات کے عالم میں اپنی جولانیاں دکھاتی ہے اسی طرح ان اعلیٰ اقدار و حقائق کی جستجو میں بھی تگ و دو کر سکتی ہے۔ جو محسوسات و مادیات سے ماوراء ہیں۔ حالانکہ وہی اقدار و حقائق ہیں جن سے انسانی زندگی کو ابدیت اور غیر فانی ہونے کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ اگر انسان ان حقائق سے بے خبر رہے تو خواہ مالی اعتبار سے کتنی ہی ترقی کر لے، اس کو ابدیت کا اعلیٰ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

عقلِ انسانی کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے قدرت نے انسان کو ایک اور ذریعہ علم بھی عطا فرمایا ہے۔ یہ ذریعہ وحی کا ذریعہ ہے۔ وحی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے آئی ہے۔ جن کا علم بے خطا بھی ہے اور جو ان حقائق و اقدار پر مشتمل بھی ہے جو محسوسات و مادیات

سے ماوراء ہیں۔ یہ علم اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے دیا ہے کہ انسان اس عالمِ آب و گل کا اسیر بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس زندگی کے بعد ابدی زندگی کی خوشیوں اور لذتوں کو بھی حاصل کر سکے۔

وحی کے ذریعے سے ہمیں جو علم حاصل ہوا ہے نہ وہ عقل کے خلاف ہے نہ وہ اس دنیا کے معاملات و مسائل سے بے تعلق ہے، بلکہ وہ تمام تر عقل و فطرت ہی کے تقاضوں پر مبنی ہے اور اس کا مقصد ہماری اس دنیاوی زندگی کی ایسی تنظیم ہے کہ یہ زندگی ہماری ابدی زندگی کا دیباچہ اور اس کی تمہید بن جائے اور ہم یہاں اپنی زندگی، آخری زندگی کی صلاح و فلاح کو پیش نظر رکھ کر، گزاریں۔

آپ اگر علم وحی پر ایک شائقِ علم، طالب علم کی طرح کسی بدگمانی کے بغیر غور کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ ہماری عقل کو معطل نہیں کرتا بلکہ اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے غور و فکر اور اپنی تحقیق و جستجو کو صرف اس عالمِ رنگ و بو ہی تک محدود نہ رکھے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان ظواہر کے پیچھے جو حقائق ہیں ان کو بھی دیکھے اور سمجھے۔ یہ ہمیں اس بات کی ترغیب نہیں دیتا کہ ہم اس دنیا کے معاملات و مسائل کو نظر انداز کر دیں بلکہ اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم صحیفۂ کائنات کے صرف اسی ایک ورق کے فکر و مطالعہ پر قانع نہ ہو جائیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہے بلکہ اس صحیفہ کے ان اوراق کو بھی پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں جو اگرچہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہیں لیکن ہمارے دل اور ہماری آنکھوں کے لیے وہ بھی کھلے ہوئے ہیں۔

اس وجہ سے میں علم کے ان دونوں ذرائع —عقل اور وحی— کو یکساں اہمیت دیتا ہوں اور ان کے درمیان کسی نزاع کا قائل نہیں ہوں۔ جو لوگ ان کے درمیان نزاع کے قائل ہیں اور عقل کی حمایت میں وحی کو اور وحی کی حمایت میں عقل کو مطعون کرتے ہیں میں اس کو ان کی کم نگاہی پر محمول کرتا ہوں۔ جس طرح عقل استدلال سے کام لیتی ہے اسی

طرح وحی بھی آفاق و انفس کی نشانیوں سے استدلال کرتی ہے اور اس استدلال میں وہ تمام تر عقل ہی کے کلیات استعمال کرتی ہے اور عقل کی جولانیوں کے لیے ایک غیر محدود میدان فراہم کرتی ہے۔ پس علم کی صحیح ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم وحی کی روشنی سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھائیں ورنہ عقل اور سائنس کی مدد سے آج جو فتوحات انسان حاصل کر رہا ہے یہ ان کے لیے نفع رساں ہونے کے بجائے تباہی کا باعث بن جائیں گی! موجودہ دور کے انسان نے سائنس کے زور سے اسلحہ تو بے پناہ ایجاد کر لیے لیکن وحی کی رہنمائی سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنے ظرف کے اندر وہ وسعت اور آفاقیت پیدا نہ کر سکا جو ان اسلحہ کے صحیح استعمال کے لیے ناگزیر ہے! ہماری یونیورسٹیوں کو اس مسئلہ پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا اور اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔

مقالہ ۳۰

آزادی کے اسلامی تقاضے

[۲۹ جنوری ۱۹۴۸ء سے لے کر ۹ فروری ۱۹۴۸ء تک راولپنڈی ڈویژن کے اضلاع — جہلم، گجرات، سرگودھا اور میانوالی کے ضلعی اجتماعات منعقد ہوئے۔ ان اجتماعات میں مرکز کی طرف سے میں اور رفیقِ محترم جناب غازی محمد عبدالجبار صاحب شریک ہوئے۔ جماعت کے کاموں کا جائزہ لینے اور ارکان کو مناسب وقت ہدایات دینے کے علاوہ ہر مقام پر، ہر طبقہ کے اشخاص سے تبادلہ خیالات اور عام مسلمانوں کے اجتماعات میں لوگوں کو خطاب کرنے کے مواقع بھی ملے۔ خطاب عام کی تقریروں کے ضروری حصے مولوی فتح محمد صاحب، قیم حلقہ راولپنڈی نے نوٹ کر لیے تھے۔ ان کی یادداشت کی مدد سے تقریر کے مختلف اجزاء کو ایک سلسلے میں مربوط کر دیا گیا ہے۔ مختلف مقامات کی مقامی اور وقتی ضروریات کے لحاظ سے تقریروں کے مطالب میں تھوڑا بہت اختلاف بھی ہوا۔ لیکن ہر جگہ قدر مشترک ایک ہی رہا۔ اس لیے تمام ضروری مطالب ایک ہی تقریر میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ ہر تقریر کو الگ الگ قلمبند کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ (امین احسن اصلاحی)]

آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے کل اور آج میں بڑا فرق پیدا ہو چکا ہے۔ آپ کل تک اس ملک میں غلام تھے، آج آزاد ہیں۔ کل تک محکوم تھے، آج حاکم ہیں۔ کل تک آپ کا ارادہ دوسروں کے ارادہ کا تابع اور آپ کا اختیار دوسروں کے اختیار و اذن کا دستِ نگر

تھا، لیکن آج آپ اپنی مرضی کے مالک اور اپنے ارادہ کے بادشاہ ہیں۔ آپ کی سرزمین اب اپنی ہے، اس کے وسائل و ذرائع اپنے ہیں۔ آپ کو اس کے نظم و نسق کا پورا حق حاصل ہے اور کوئی نہیں ہے جو آپ کے اس حق میں مزاحمت کر سکے۔ آپ اب اس کے بنانے اور بگاڑنے کے مختار ہیں اور کوئی نہیں ہے جو آپ کا ہاتھ پکڑ سکے۔ غور کیجیے! اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے جو آپ کو حاصل ہوئی ہے! اور پروردگار عالم کا یہ کتنا بڑا فضل ہے جو اس نے آپ پر فرمایا ہے! آزادی اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے اس نے آپ کو سرفراز فرمایا اور غلامی دنیا کی بدترین ذلتوں میں سے ایک بہت بڑی ذلت ہے جس سے اس نے آپ کو نجات دی! اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت پانے کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم پہلے اس آزادی کے حقیقی مفہوم اور اس کے مقتضیات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر سچے عزم کے ساتھ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

آزادی اور غلامی کا اسلامی اور غیر اسلامی مفہوم

حضرات! اس چیز پر غور کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ دنیا کے بہت سے الفاظ اور اصطلاحات کی طرح آزادی اور غلامی کی اصطلاحات کا مفہوم بھی ہمارے اسلامی لغت میں اس مفہوم سے بہت کچھ مختلف ہے جو دنیا کی دوسری قومیں ان الفاظ سے سمجھتی ہیں۔ دنیا کی دوسری قوموں کے نزدیک تو غلامی کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کے ارادہ و اختیار، اس کے ملک و وطن اور اس کے وسائل و ذرائع پر قابض ہو جائے اور اس کی خواہشوں کے خلاف ان ساری چیزوں کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرے۔ اسی طرح ان کے نزدیک آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی قوم اس قسم کے اجنبی تسلط سے نجات حاصل کر کے اپنے وسائل و ذرائع پر اپنے حسبِ منشاء تصرف کر سکے اور اپنے معیارات کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو ڈھال سکے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک —بشرطیکہ وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غور کریں— آزادی اور غلامی کا مفہوم اس سے بہت کچھ

مختلف ہے۔ مسلمان کے نزدیک غلامی کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت اور اس کی بندگی اور اس کی اطاعت کو تسلیم کرے، خواہ وہ غیر کوئی اور شخص اور کوئی اور قوم ہو یا خود اس کا اپنا ہی نفس اور اس کی اپنی قوم ہو۔ اسی طرح آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اللہ کے سوا ہر اطاعت و بندگی سے آزاد ہو جائے یہاں تک کہ خود اپنے نفس اور اپنی خواہشوں اور اپنی قوم کی حاکمیت و اطاعت کا کوئی پھندا بھی اس کے گلے میں باقی نہ رہے۔ آزادی اور غلامی کی تعریف میں اسلامی اور غیر اسلامی نقطۂ نظر کا یہ اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہیں ہے بلکہ بنیادی اور جوہری اختلاف ہے۔ اس اختلاف کا اگر آپ ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا چاہیں تو اس طرح اندازہ کر سکتے ہیں کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد انڈین یونین کے غیر مسلم تو اپنے تصورِ آزادی کے لحاظ سے آزادی کی منزلِ مقصود تک پہنچ گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے جان و مال اور ارادہ و اختیار پر انگریزوں کو جو تصرف حاصل تھا وہ ختم ہو گیا اور وہ اپنے ملک کے حکمران اب خود بن گئے۔ باقی رہے پاکستان کے مسلمان تو ان کی آزادی کے لیے تنہا یہ بات کافی نہیں ہو سکتی کہ انگریز یہاں سے چلے گئے۔ بلکہ ان کے تصورِ آزادی کے لحاظ سے یہ بات بھی ضروری ہے کہ غیر الٰہی حاکمیت و اطاعت کے ہر پھندے سے ان کی گردن آزاد ہو خواہ وہ پھندا دوسروں نے بالجبر ان کی گردن میں ڈالا ہو یا وہ خود اپنی پسند سے کوئی پھندا تیار کریں اور اس کو خود اپنے شوق سے زیور کی طرح پہن لیں! اگر انگریز چلے گئے اور ان کی جگہ ہم نے خود لے لی اور اللہ کے قانون کے بجائے خود قانون بنانے اور چلانے لگے تو یہ یا تو غلامی ہی کی ایک نئی شکل ہوگی یا اس کو صحیح تر الفاظ میں بغاوت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کو اسلامی تصور کے لحاظ سے آزادی نہیں کہہ سکتے۔

ہر چند کہ سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

آزادی اور غلامی کے مفہوم میں اسلامی اور غیر اسلامی نقطۂ نظر کا یہ اختلاف بڑے دور رس نتائج رکھتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے لازمی طور پر آزادی حاصل کرنے کے بعد

ایک غیر مسلم معاشرہ اس آزادی کو اس سے بالکل مختلف طریقوں پر برتتا ہے جس طرح ایک مسلم معاشرہ اس کو برتتا ہے۔ ایک غیر مسلم معاشرہ کسی اجنبی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنا حق سمجھتا ہے کہ اس آزادی کو آزادانہ استعمال کرے۔ اپنے وسائل و ذرائع پر اپنے منشاء کے مطابق خود تصرف کرے اپنے لیے خود قانون بنائے۔ اپنی پسند و ناپسند کے لیے خود کوئی معیار ٹھہرائے۔ اپنے ذوق اور پسند کے مطابق اپنی تہذیب کو جو رنگ چاہے دے۔ اپنے سیاسی و اجتماعی مسائل کو جس ڈھنگ پر چاہے حل کرے۔ لیکن ایک مسلمان کے نزدیک آزادی کے معنی غیر اللہ کی حاکمیت اور اس کی بندگی سے آزادی ہے نہ کہ خود اللہ کی حاکمیت اور بندگی سے آزادی! جہاں تک اللہ تعالیٰ کی غلامی کا تعلق ہے یہ پیدائشی طور پر ہر انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور سچا مسلمان اس امر واقعی کو تسلیم کرتا ہے، اس وجہ سے وہ اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد وہ خدا سے بھی آزاد ہو جائے۔ اگر وہ ایسا کرے تو قرآن میں اس کو ظلم، فساد اور بغاوت کہا گیا ہے اور یہ چیز اسلامی شریعت میں غلامی سے بھی زیادہ بری ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک مسلم معاشرہ کا حق یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی اس آزادی کو خدا کے قانون کے تابع کر دے۔ اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر اس آزادی کو استعمال کرے۔ غیر الٰہی حاکمیت سے آزاد ہو کر اللہ وحدہٗ لاشریک کا غلام اور محکوم بن جائے اور اپنے ترک و اختیار، ردّ و قبول اور پسند و ناپسند کے لیے اس شریعت کو معیار بنائے جو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے۔ اس وفاداری میں اس نعمتِ آزادی کی حقیقی قدر پوشیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اس کی کسی نعمت سے مستقل طور پر فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو اس کی صحیح قدر کرتے ہیں۔ اگر کوئی قوم کسی نعمت کو پا کر اس کا حق ادا نہیں کرتی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جانچنے کے لیے تھوڑی سی مہلت ضرور ملتی ہے لیکن بالآخر وہ نعمت اس سے چھین لی جاتی ہے۔ ان ہی دونوں راستوں میں سے کوئی ایک راستہ آپ کو بھی اختیار کرنا ہے اور آپ کے مسلمان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ آپ دوسرا راستہ اختیار کریں اب آپ پر کوئی غیر الٰہی اقتدار بالجبر مسلط نہیں ہو رہا ہے۔ آپ اپنی انفرادی زندگیوں میں خدا

کی بندگی کر سکتے ہیں اور اپنی اجتماعی زندگی میں بھی خدا کی بندگی کر سکتے ہیں۔ اب آپ کے افراد بھی مومن و مسلم رہ سکتے ہیں اور آپ کی حکومت بھی مومن و مسلم بن سکتی ہے۔ اور آزادی کی نعمت دے کر یہی بات ہے جو اللہ نے آپ سے چاہی ہے۔ اگر آپ نے یہ بات پوری کر دی تو اس نعمتِ آزادی کی آپ حقیقی قدر کریں گے اور اللہ تعالیٰ آپ سے خوش ہوگا اور آپ کو اس منصبِ خلافت کی عزت بخشے گا جو اس نے ہمیشہ اپنے صالح بندوں کو بخشی ہے۔ لیکن اگر آپ نے اس کی خلاف ورزی کی اور باغیوں اور مفسدوں کی طرح اس آزادی کو پا کر خدا کے ملک میں اپنی بادشاہی اور اپنی خدائی چلانے کے گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے تو آپ کو امتحان اور جانچ کے لیے خدا کی طرف سے تھوڑی سی مہلت ضرور نصیب ہوگی، مگر اندیشہ ہے کہ اس مہلت کے گزر جانے کے بعد خدانخواستہ یہ آزادی اسی طرح چھین لی جائے گی جس طرح کچھ دنوں پہلے دلی کا تخت و تاج چھین لیا گیا تھا۔

پاکستان کا مفہوم اور اس کے تقاضے

حضرات! اس آزادی کے ثمرہ اور نتیجہ کے طور پر جو چیز آپ کو حاصل ہوئی ہے، وہ پاکستان ہے! اس وجہ سے میں نے جس اسلامی نقطۂ نظر سے آزادی اور غلامی کے مفہوم اور اس کے مقتضیات پر گفتگو کی ہے اسی نقطۂ نظر سے پاکستان، اس کے مفہوم اور اس کے مقتضیات پر چند حروف عرض کروں گا۔ یہ حقیقت آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس خطۂ زمین کا نام جو پاکستان رکھا گیا ہے، یہ نہ تو کوئی اتفاقی اور جغرافی نام ہے اور نہ یہ کوئی قومی نام ہے۔ اس ملک کا نام پاکستان اس لیے نہیں رکھا گیا کہ اس کا یہی نام پہلے سے تھا اس وجہ سے آزادی کے بعد بھی یہی نام اختیار کر لیا گیا۔ علیٰ ہذا القیاس یہ نام اس وجہ سے بھی نہیں رکھا گیا کہ یہاں 'پاک' نام کی کوئی قوم بستی رہی ہو اور اس کی نسبت سے ہندوستان، افغانستان یا انگلستان کی طرح اس کو پاکستان کا نام دے دیا گیا ہو۔ بلکہ اس کا نام پاکستان اس آئیڈیالوجی کی وجہ سے رکھا گیا ہے جو پاکستان کی تحریک کے آغاز سے اس کی تکمیل کے وقت تک برابر اس کی پشت پر کام کرتی رہی ہے۔ اور جس نے پاکستان کے لیے محرک کا

کام بھی دیا ہے اور دلیل کا بھی! یہ آئیڈیالوجی کیا ہے؟ یہ آئیڈیالوجی اس عقیدہ اور تصور سے عبارت ہے کہ آپ خدا اور اس کی توحید اور اس کے دین سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ خدا کی توحید کا یہ لازمی نتیجہ سمجھتے ہیں کہ اسی کو حکمراں اور قانون ساز مانیں، اس وجہ سے آپ یہ بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ آپ ایک ایسے مشترک ہندوستان میں اپنے دینی تصورات کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے جس میں حکومت کی بنیاد 'حکمرانیٔ جمہور' کے اصول پر رکھی گئی ہو۔ اسی طرح آپ دین کو صرف پرائیویٹ زندگی تک محدود نہیں مانتے بلکہ اس کو انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ پر حاوی مانتے ہیں، اسی وجہ سے کوئی ایسا نظام زندگی قبول کرنا آپ کے تصورِ دین کے منافی تھا جس میں دین کو ایک لادینی نظام کے تحت صرف پرائیوٹ زندگی تک محدود کر دیا گیا ہو۔ علیٰ ہذالقیاس آپ جس نظریہ سلطنت کے معتقد ہیں، وہ یہ ہے کہ 'خدا کی حکومت، خلق کے لیے صالحین کے ذریعے سے'۔ اس وجہ سے آپ کے لیے ناممکن تھا کہ آپ عہدِ حاضر کے اس مقبول عام سیاسی نظریہ پر ایمان لائیں کہ 'عوام کی حکومت عوام کے لیے، عوام کے ہاتھوں'! آپ کے اور ہندوستان کی دوسری قوموں کے تصور کا دراصل یہی اختلاف تھا جس نے آپ کو پاکستان کے مطالبہ پر مجبور کیا تھا تاکہ آپ ایک علیحدہ خطۂ زمین میں خالص اپنے تصورات اور عقائد کے مطابق ایک نظام زندگی بنا سکیں اور اس کے تحت صحیح اسلامی زندگی بسر کر سکیں۔ یہ تصور تمام تر آپ کے دینی معتقدات پر مبنی تھا اس وجہ سے نہ تو آپ کے لیے انحراف ممکن تھا اور نہ آپ کے حریفوں کے لیے اس کا انکار ممکن ہو سکا۔ اسی وجہ سے اس چیز نے آپ کی تحریک کے لیے محرک کا بھی کام دیا اور آپ کے دعوے اور مطالبے کے لیے دلیل اور ثبوت کا بھی کام دیا۔ اسی کے نام پر آپ نے اپنی قوم کو پکارا اور پوری قوم کی قوم آپ کی پکار پر جمع ہو گئی اسی چیز کو آپ نے دنیا کے سامنے بطور دلیل کے رکھا اور دنیا کی رائے عامہ کو آپ کے مطالبہ کے آگے جھکنا پڑا۔ اگر آپ نے اس آئیڈیالوجی کے نام پر لوگوں کو نہ پکارا ہوتا تو مجھے امید نہیں کہ آپ راس کماری سے لے کر کشمیر تک اور پشاور سے لے کر کلکتہ تک اپنی حمایت میں کوئی ہلچل پیدا کر سکتے! اگر آپ نے اپنے مطالبہ کی تائید میں اللہ کا، اس کے رسول کا،

اس کی کتاب کا اور اسلامی شریعت کے اٹل تقاضوں کا حوالہ نہ دیا ہوتا تو ہرگز اس کی توقع نہیں تھی کہ وہ کروڑوں مسلمان بھی آپ کے اس مطالبہ کی حمایت میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتے جو اس بات سے ناواقف نہ تھے کہ پاکستان کی تعمیر کے بعد بھی ان کی قسمت ہندوستان کے ساتھ ہی وابستہ رہے گی اور ان کا یہ مطالبہ ان کے لیے ہزارہا خطرات کے دروازے کھول دے گا۔

بہر حال یہ ایک قطعی حقیقت ہے کہ پاکستان کا نام جب بھی آپ کی زبانوں پر آیا ہے اس آئیڈیالوجی کے ساتھ ہی آیا ہے۔ اگر تقریر کے طویل ہو جانے کا ڈر نہ ہوتا تو میں تفصیل کے ساتھ بتاتا کہ آپ کی سیاسی تاریخ کب سے اس لفظ سے آشنا ہوئی اور کن محرکات کے تحت اس تصور کا وجود ہوا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ آپ میں سے ہر شخص خود اس تفصیل سے اچھی طرح واقف ہے۔ آپ میں سے جن لوگوں نے پاکستان کی تعمیر میں کسی نوعیت سے کوئی حصہ لیا ہے، انہوں نے اس حقیقت کا بارہا اسی قوم کے سامنے اعلان و اقرار بھی کیا ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ آپ پاکستان حاصل ہو جانے کے بعد پاکستان کے مقتضیات کو پورا کریں اور اس کی تکمیل کے آئندہ مراحل میں اس تصور سے غافل نہ رہیں جس کے نام پر آپ نے اس کو حاصل کیا ہے۔ نیز اپنے ان وعدوں اور اعلانات کو بھی فراموش نہ کریں جن کو آپ نے اپنی قوم کے سامنے بار بار دہرایا ہے اور خلق اور خدا کو ان پر گواہ ٹھہرایا ہے۔

حضرات! آپ کی ذمہ داریاں لفظ پاکستان سے بھی واضح ہو رہی ہیں۔ پاکستان کے معنی، میں پاکوں کی سرزمین! آپ اچھی طرح واقف ہیں کہ پاکوں کی قومیت نسل و قوم، ملک و وطن اور روایات تہذیب و معاشرت کے سرسری اشتراک سے نہیں بنا کرتی، بلکہ عقائد و افکار اور اعمال و اخلاق کی کامل وحدت سے بنتی ہے۔ ہندوستان کے برہمن اور فلسطین کے یہودی کسی زمانہ میں نسلی و نسبی پاکی کے خبط میں مبتلا تھے اور محض بزرگوں یا دیوتاؤں کی اولاد ہونے یا خیال کرنے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بھی پاک سمجھتے تھے اور

اس سرزمین کو بھی پاک خیال کرنے لگے تھے جس میں وہ آباد تھے۔ لیکن جب مسلمانوں کا ظہور ہوا اور وہ ان ملکوں پر غالب آئے تو انہوں نے یہودیوں اور برہموں کی ان غلط فہمیوں کو رفع کیا اور ان کو بتایا کہ کوئی قوم نسب اور خون کی وجہ سے پاک نہیں ہوا کرتی، بلکہ ایمان اور عمل صالح سے پاک ہوتی ہے۔ جو مسلمان اس طرح کی نخوت جاہلیت منانے والے بن کے رہے ہیں وہ دنیا پر اور خود اپنے اوپر بڑا ظلم کریں گے، اگر وہ اسی طرح کے کسی جاہلی فتنہ میں خود مبتلا ہو جائیں۔ اسی وجہ سے میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ پاکی اور ناپاکی کی حقیقت پر اسلامی نقطہ نظر سے غور کریں تاکہ جس خطہ زمین کو آپ نے پاکستان کا نام دیا ہے وہ فی الحقیقت پاکستان بن سکے۔ یہ نام آپ کے قومی احساس برتری کا محض ایک نشان بن کر نہ رہ جائے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے آپ کو رسوا کرائے۔

اسلام میں جیسا کہ میں نے عرض کیا، کوئی شخص نہ تو نسل ونسب سے پاک ہوتا ہے اور نہ کسی خاص گروہ کی طرف انتساب کی وجہ سے، نہ کسی خاص سرزمین کا باشندہ ہونے کی وجہ سے، نہ اجلے کپڑے پہن لینے کی وجہ سے۔ بلکہ وہ ان تمام باتوں پر اعتقاد رکھنے اور عمل کرنے کی وجہ سے پاک ہوتا ہے جن کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی اونچا نسب رکھتا ہو، کتنی برتر قوم کی طرف انتساب کا مدعی ہو اور ہر صبح کو کتنا ہی صابون اور خوشبو اپنے جسم پر لیپتا ہو لیکن پاکی اور پاکیزگی کی اس کو ہوا تک بھی نہیں لگ سکتی جب تک وہ ایمان وعمل صالح سے اپنے آپ کو نہ سنوارے! علیٰ ہذا القیاس اسلام میں کوئی خطہ زمین بھی پاکستان کے باعزت نام کا مستحق نہیں ہو سکتا خواہ اس میں دنیا کی کوئی قوم بھی بس رہی ہو جب تک اس خطہ زمین پر خدا کا قانون جاری ونافذ نہ ہو!

پاکستان کے لیے عظیم قربانی کا مقصد

اس ملک کے لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ ان ساری باتوں کو یاد رکھیں اور ان کو پورا کریں۔ اگر انہوں نے ان باتوں کی خلاف ورزی کی تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کی ساری جدوجہد کا مقصد فوت ہو جائے گا اور یہ لوگ خلق اور خدا کے آگے جھوٹے ثابت ہوں گے بلکہ یہ ایک

ایسا حادثہ ہوگا جو پوری قوم کی کمر ہمت توڑ دے گا۔ جو لوگ سمجھتے تھے کہ پاکستان بغیر کسی بڑی قربانی کے محض سیاسی تدبیر و تدبر کے زور سے حاصل ہو گیا ہے، واقعات نے ان کے اس خیال کی تردید کر دی ہے۔ اب تو بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو بھاری قیمت مسلمانوں کو پاکستان کے لیے ادا کرنی پڑی ہے اتنی بھاری قیمت دنیا کی کسی قوم نے بھی آزادی کے لیے ادا نہیں کی ہے۔ مشرقی پنجاب اور دلی کے لاکھوں مسلمانوں کی خانماں بربادی کو بھول جائیے، ہزاروں عورتوں کی بے عصمتی اور ذلت کو بھی نظر انداز کر دیجیے، لاکھوں بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کے قتل عام کو بھی شمار میں نہ لائیے اور ان واقعات سے بھی قطع نظر کیجیے جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پیش آئے ہیں۔ صرف اس امر پر غور کیجیے کہ ہندوستان کے کئی کروڑ مسلمان جو آج اپنے وطن میں خوف اور بے اطمینانی کی وہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں —— جس کا تصور وہ کسی دشمن کے ملک میں بھی مشکل سے کر سکتے ہیں —— آخر وہ کس جرم کی پاداش میں یہ سزا بھگت رہے ہیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ محض اس جرم کی سزا ہے کہ انہوں نے پاکستان کے مطالبہ میں آپ کا ساتھ دیا اور یہ کہہ کر ساتھ دیا کہ اس مقصد عزیز کی خاطر وہ اپنے سیاسی مستقبل کو خطرہ میں ڈالنے اور صاف لفظوں میں اپنے تئیں قربانی کا بکرا بنانے کے لیے تیار ہیں؟ اگر محض سیاسی مشیخت جتانے کی خاطر اس حقیقت کی تاویل کی خواہش آپ کے اندر پیدا نہ ہو تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ سب پاکستان کے لیے کیا گیا ہے۔ یہی چیز ہے جس کی خاطر مشرقی پنجاب اور دلی کے مسلمانوں نے بھی تباہی کو دعوت دی اور اسی چیز کی خاطر ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں نے بھی تباہی کو دعوت دی اور اسی چیز کی خاطر ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں نے بھی اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیا، اس وجہ سے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ پاکستان محض گردش قلم کا ایک کرشمہ یا سیاسی تدبر کا ایک شعبدہ ہے۔ جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں اگر وہ واقعات سے بے خبر ہیں تو ان کی بے خبری پر افسوس ہے اور اگر وہ اس قوم کی قدر و قیمت سے ناواقف ہیں جس کو انہوں نے اس راہ میں قربان کیا ہے تو ان کی یہ ناقدری قابل ماتم ہے! پاکستان کے لیے آپ کو ایک تہائی سے زیادہ بلکہ کم وبیش

نصف آبادی کو قربان کرنا پڑا ہے اور یہ اتنی بڑی قربانی ہے جس کی مثال دنیا کی کسی قوم کی تاریخ آزادی بھی پیش نہیں کر سکتی!

غور کیجیے! اتنی بڑی قربانی آپ کی قوم نے کس مقصد کے لیے دی ہے؟ کیا محض اس لیے کہ اس ملک میں ایک چھوٹی سی ریاست مسلمانوں کی بھی قائم ہو جائے؟ اس طرح کی ریاست جس طرح افغانستان میں افغانیوں کی، ایران میں ایرانیوں کی، اور ترکی میں ترکوں کی ہے۔ اگر فی الواقع یہی چیز پیش نظر تھی تو میں عرض کروں گا کہ بڑی ہی حقیر چیز کے لیے مسلمان قوم نے اپنی بہت بڑی چیز قربان کی اور یہ ساری قربانی خسر الدنیا والآخرۃ کی مصداق ہے۔ اس طرح کی ریاست سے ان کروڑوں مسلمانوں کو دنیا میں کیا فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے جن کے جان و مال کو اس کے قیام کی جدوجہد میں حصہ لینے ہی کی وجہ سے ہندوستان میں مباح کر دیا گیا۔ اور کل کو خدا کے یہاں وہ اپنی ان کوششوں پر کس اجر کے متوقع ہو سکتے ہیں جبکہ ان کی ساری محنت ایک ایسی ریاست کے قیام پر صرف ہوئی ہو جو دنیا کی قومی ریاستوں میں سے ایک ریاست ہو اور جس نے اپنے قیام کی جدوجہد میں دین کے نام سے تو فائدہ اٹھا لیا ہو لیکن قیام کے بعد دین کے کسی کام آنے کی اس سے توقع نہ ہو! اس طرح کی ریاست پر ممکن ہے کہ پاکستان کا کھاتا پیتا مسلمان راضی ہو جائے، کیونکہ بہر حال دنیا کا فائدہ اس کے تحت ایک حد تک اس کو حاصل رہے گا، لیکن وہ کروڑوں مسلمان اس چیز پر قانع کیسے ہو سکتے ہیں جنہوں نے اس کے عشق میں کھو تو سب کچھ دیا ہے مگر پایا کچھ بھی نہیں ہے! ان کو تو اگر کوئی چیز تسلی دے سکتی ہے تو صرف ایک ہی چیز تسلی دے سکتی ہے وہ یہ کہ ان کو اطمینان ہو کہ جس خدا اور رسول کے نام پر ان کو قیام پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی اور جس کی تعمیل میں انہوں نے سب کچھ کھو دیا ہے وہ فی الحقیقت اسی خدا اور اسی کے دین کا کام ہے۔ یہ نہ خیال کیجیے کہ میں محض لفاظی کے زور سے مسلمانوں کی اس جدوجہد کو خواہ مخواہ ایک دینی رنگ دے رہا ہوں، ورنہ مسلمان محض اپنا ایک قومی سٹیٹ چاہتے

تھے جو پاکستان کی صورت میں انہیں مل گیا۔ ممکن ہے کچھ ہوشیار قسم کے لوگ فی الحقیقت ایک قومی حکومت ہی چاہتے رہے ہوں اور دین کا نام وہ محض ظاہرداری ہی لیتے رہے ہوں، لیکن اس قسم کے تھوڑے سے چالاک لوگوں کے پردے میں ان کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کا خون کرنا جائز نہ ہوگا جو فی الحقیقت خدا کے دین کی خدمت ہی کے لیے اس جدوجہد میں شریک ہوئے تھے اور اب تک وہ اپنی ساری تباہیوں اور بربادیوں پر اس خیال سے مطمئن ہیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے کیا ہے۔ اس گروہ میں ہندوستان اور پاکستان کے کروڑوں عامۃ الناس کے ساتھ ان دونوں ملکوں کے ہزاروں اور لاکھوں علماء اور مشائخ اور دوسرے اہل علم بھی ہیں جن کو دین کے سوا دنیا کی کوئی اور دوسری چیز کبھی بھی اپیل نہیں کر سکتی تھی۔ اگر خدانخواستہ ان لوگوں کا منشاء پورا نہ ہوا اور آپ نے ان کے جذبات سے بے پروا ہو کر ایک لادینی قسم کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تو یہ لوگ اپنی بدبختی پر سر پیٹ لیں گے اور اس کا اثر ان کے ذہن و دماغ اور ان کے عزم و حوصلہ پر اتنا برا پڑے گا کہ آپ کی پوری قوم بالکل بے جان ہو کر رہ جائے گی اور تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ترکوں کے خلافت کو ختم کر دینے سے ہماری قوم کے اعصاب پر جو اثر پڑا تھا اس سے ہزار ہا درجہ اس حادثہ کا اثر قوی ہوگا، بلکہ اندیشہ ہے کہ شاید اس حادثہ کے بعد اس کا سنبھالنا ممکن ہی نہ ہو سکے!

مستقبل کا نظامِ زندگی

حضرات! آزادی اور پاکستان کے حصول کے بعد سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال جو آپ کے سامنے آیا ہے اور آپ سے فوری حل کا مطالبہ کر رہا ہے وہ مستقبل کے نظام زندگی کا سوال ہے۔ سابق نظام زندگی جس کے تحت آپ نے کم و بیش ڈیڑھ سو سال بسر کیے اس کے بنانے والے انگریز تھے، جو اس ملک سے رخصت ہو چکے اور اب ناگزیر ہے کہ ان کے پیچھے یہ نظامِ زندگی بھی رخصت ہو جائے جو انہوں نے بنایا تھا اور جو اپنے ظاہر و باطن میں آپ کے نہیں بلکہ ان کے مقاصد و مطلوبات کا ترجمان ہے۔ ہماری

موجودہ نسلیں چونکہ اسی نظام کے تحت پلی اور بڑھی ہیں اس وجہ سے ممکن ہے اس سے وہ بیگانگی محسوس نہ ہوتی ہو جو فی الحقیقت محسوس ہونی چاہیے۔ لیکن اب آزادی اور پاکستان کے حصول کے بعد جب وہ دوسروں کی بجائے اپنے آپ کو دیکھنا شروع کریں گی اور آہستہ آہستہ اپنے آپ کو پہچانیں گی تو اس نظام کی ہر چیز سے بیگانگی بلکہ نفرت سی محسوس کریں گی۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ نظام بدل جائے اور صرف جزوی طور پر نہیں بلکہ یک قلم بدلا جائے۔ اور بے ڈھنگے لباس کی جگہ ایسا جامہ تیار کیا جائے جو اس کی قامت پر راست آئے۔ اب اگر میں آپ سے یہ سوال کروں کہ اس نظام کو ترک کر کے وہ کونسا نظام ہے جو آپ اختیار کر سکتے ہیں — اگر آپ اپنے مسلمان ہونے کی حقیقت سے بھی کچھ آشنا ہیں — تو آپ اس سوال کے جواب میں ایک ہی بات کہہ سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ 'اسلامی نظامِ زندگی!' جہاں تک جواب کا تعلق ہے کوئی مسلمان اس جواب کے سوا کوئی اور جواب نہیں دے سکتا، یہ اور بات ہے کہ بہتوں کے ذہن میں اس کا مفہوم اتنا مبہم ہو کہ وہ اس کی کوئی واضح تعبیر نہ کر سکتے ہوں یا ان کے ذہن میں اسلامی اور جاہلی تصورات کا کوئی اپنا تیار کیا ہوا معجون مرکب ہو کہ جس کو انہوں نے اسلامی نظامِ زندگی سمجھ رکھا ہو یا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ مسلمان جس طرح کا نظام بھی قائم کر کے لائیں وہ آپ سے آپ اسلامی ہو جاتا ہے اور اس کے اسلامی بن جانے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کو مسلمان چلا رہے ہیں۔ اور اس طرح کی بعض دوسری غلط فہمیوں کا پایا جانا ناممکن ہے بلکہ ہم کو اعتراف ہے کہ اسلامی تعلیم و تربیت سے محروم رہنے کی وجہ سے مسلمان اسلامی نظامِ زندگی کے تصور سے اکثر و بیشتر ناآشنا ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک گروہ قلیل کے سوا جو قومی حیثیت سے تو مسلمان رہنا چاہتا ہے، مگر اعتقاد و عمل کے لیے اسے کفر ہی کی راہیں پسند ہیں، کوئی بھی یہ بات کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اسے اسلام کا نظام نہیں بلکہ کوئی اور نظام مطلوب ہے اور آج تو اس گروہ کے لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ وہ صاف صاف یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ انہیں اسلام کے سوا کوئی اور نظام مطلوب ہے بلکہ اگر کہتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ وہ جس نظام کو پسند کر رہے ہیں وہ اسلام کے نظام کے منافی

نہیں ہے۔ مسلمانوں کی اس عام خواہش کے ساتھ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ لوگ بھی پوری طرح ہم نوا ہیں جن کے ہاتھوں میں آج مسلمانوں کی باگ ہے اور نظامِ زندگی کے فیصلہ میں جن کی آواز اصلی موثر آواز ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے اس اطمینان کے لیے تو معقول وجوہ موجود ہیں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس ملک میں کوئی جاہلی اور کافرانہ نظامِ زندگی فروغ نہیں پائے گا لیکن اس سے اس عام بے خبری کی وجہ سے جس میں اس عہد کے مسلمان مبتلا ہیں اس بات کا اندیشہ ضرور ہے کہ مبادا کسی غلط اور ناقص چیز کو مسلمان اسلامی نظام سمجھ بیٹھیں اور ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر لوگ ان کے اوپر اسلام کے نام سے کوئی ایسی چیز مسلط کر دیں، جس کو اسلام سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ ہو اس خطرہ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی کی خصوصیات کو معلوم کیا جائے اور ان کا علم عام مسلمانوں میں بھی پھیلایا جائے تاکہ وہ اسلامی اور غیر اسلامی نظام کے درمیان امتیاز کر سکیں اور کسی غلط چیز کو اپنے اوپر مسلط نہ ہونے دیں اور اگر فی الواقع اسلامی نظام قائم ہو تو اس کی حفاظت کر سکیں۔

اس تقریر میں میرے لیے اسلامی نظامِ زندگی کی تفصیلات پیش کرنا یا اس کی خصوصیات کو بیان کرنا تو ممکن نہیں ہے لیکن میں اسلامی نظامِ زندگی سے متعلق چند ایسی موٹی موٹی باتیں بیان کرنا فائدہ سے خالی نہیں سمجھتا جو عام مسلمانوں کو اسلامی اور جاہلی نظام کی شناخت کرنے میں مدد دے سکیں گی اور آگے پیش آنے والے حالات و وسائل میں ان کی رہنمائی ان کو بہت سی غلط فہمیوں اور بہت سے دھوکوں سے محفوظ رکھے گی۔

پہلی بنیادی بات

اسلامی نظامِ زندگی سے متعلق سب سے پہلی بات جو ہر مسلمان کو معلوم ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کی بنا انسانی آراء و افکار کی جگہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت پر ہے۔ اس کے اصول خدا اور اس کے رسول نے مقرر کر کے اس کے جزئیات کے متعلق یہ ہدایت فرما

دی ہے کہ وہ انہی کلیات واصول کی روشنی میں معین کر لیے جائیں اور تمام نئے حالات ومسائل میں جو بات خدا اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے اصولوں سے قریب تر نظر آئے وہ عمل اور اتباع کے لیے اختیار کر لی جائے۔ اس میں انسانی فکر ونظر کو ایجاد کا نہیں، صرف اجتہاد و استنباط کا، حق دیا گیا ہے اور یہ حق ان لوگوں کو دیا گیا ہے [جو اسلامی شریعت پر مجتہدانہ نظر رکھتے ہوں اور اسلام کے مصالح ومقتضیات کو سمجھ سکتے ہوں۔ اس میں انسانی فکر ونظر کے استعمال کا دائرہ اگرچہ بہت وسیع ہے، لیکن وہ غیر محدود نہیں ہے، بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے کلیات کے تحت ہے۔ اس میں جمہور کو قانون سازی کا کوئی حق نہیں دیا گیا ہے لیکن وہ ان لوگوں کے انتخاب کا حق رکھتے ہیں جن کو وہ اس قانون کی تنفیذ، بدلتے ہوئے حالات پر اس کی تطبیق اور اس کے مقتضیات کی رعایت وحفاظت کے لیے اہل خیال کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا بھی پورا حق رکھتے ہیں کہ جن لوگوں کو ایک مرتبہ وہ یہ امانت سونپیں اگر ان کو اس کے لیے نااہل پائیں یا ان کی طرف سے کسی خیانت یا بدعہدی کا کوئی خدشہ محسوس کریں تو ان کی اصلاح کے لیے کوئی مناسب قدم اٹھائیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو ان کو منصب سے ہٹا دیں۔ لیکن ان کی اقلیت یا اکثریت، کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس نظامِ زندگی کے کلیات یا جزئیات —— خدا اور اس کے رسول کے مقرر کردہ اصولوں سے بے پروا ہو کر —— محض اپنی خود رائی سے تصنیف کرے۔ ایسا کرنا اسلامی شریعت میں نہ صرف ناجائز ہے بلکہ یہ براہِ راست خدا کے حق قانون سازی میں مداخلت کی وجہ سے کفر وشرک کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ بات اگرچہ اسلامی شریعت میں اتنی کھلی ہوئی ہے کہ اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس زمانے میں مسلمان عام طور پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کر گزریں وہ آپ سے آپ اسلامی ہو جاتا ہے، اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرح رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی انفرادی زندگیوں میں تو ممکن ہے مسلمان کسی حد تک اپنے افعال واقوال کے لیے خدا اور

رسول کے احکام کو بھی معیار خیال کرتے ہوں، لیکن اپنی اجتماعی زندگی کے معاملات میں تو یہ اللہ اور رسول سے بالکل بے پروا ہو کر خود معیار اور سند بن گئے ہیں۔ یہ جو قانون بنا ڈالیں وہ آپ سے آپ اسلامی ہو جاتا ہے، خدا اور رسول سے اس کو کوئی واسطہ ہو یا نہ ہو۔ یہ جو نظامِ معیشت ومعاشرت پسند کر لیں وہ اسلامی ہے، اگرچہ وہ خدا اور رسول کے مقرر کردہ اصولوں سے کوسوں دور ہو۔ یہ جو نظامِ تعلیم جاری کر دیں وہ اسلامی نظامِ تعلیم ہے، اگرچہ اس نظامِ تعلیم سے اسلام کی بیخ کنی اور کفر کی آبیاری ہو رہی ہو۔ اس پر جو بر خود غلطی میں مسلمان ٹھیک ٹھیک اہلِ کتاب کے نقشِ قدم کے پیرو بن گئے ہیں۔ جس طرح اہل کتاب مدعی تھے کہ ہم جو کچھ زمین پر باندھیں گے وہ آسمان پر باندھا جائے گا اور جو کچھ زمین پر کھولیں گے آسمان پر کھولا جائے گا، بالکل اسی طرح مسلمان قوم اپنے آپ کو یا تو خدا اور رسول کے قائم مقام سمجھنے لگی ہے یا یہ خیال کرنے لگی ہے کہ خدا نے اس کو یہ درجہ دیا ہے کہ اس کا ہر قول وفعل بجائے خود سند اور حجت ہے۔ اس کے لیے کسی اور بالاتر سند اور حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کل تک جو مسلمان اس بات پر راضی نہ تھے کہ کوئی ایسی اسمبلی ان کے لیے قانون بنائے جس کی اکثریت غیر مسلم ہو وہ ان اسمبلیوں کے حق شریعت سازی پر کوئی خاص بے چینی محسوس نہیں کر رہے ہیں جن کی اکثریت خود ان کے بھائیوں پر مشتمل ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اصلی اہمیت دراصل اس بات کی نہیں ہے کہ قانون کا ماخذ کیا ہو، بلکہ جو کچھ اہمیت ہے وہ صرف اس بات کی ہے کہ اس کے بنانے والوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہو، غیر مسلموں پر مشتمل نہ ہو۔ حالانکہ دیکھنے کی چیز یہی تھی کہ قانون کا ماخذ کیا ہے— خدا اور رسول یا کوئی اور؟ اگر قانون کا ماخذ کوئی اور ہے تو وہ اسلامی شریعت میں حرام ہے اور اس کی حرمت میں اس چیز کی وجہ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ یہ 'کوئی اور' خود مسلمان جمہور کے نمائندے ہیں یا کسی اور قوم کے!

اسلام زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے

اسلامی نظام زندگی کے متعلق دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے۔ اسلام، جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے، صرف بندے اور خدا کے درمیان ایک معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ بندوں اور بندوں کے درمیان کا بھی معاملہ ہے۔ اس وجہ سے وہ ان سارے اجتماعی و معاشرتی پہلوؤں سے بحث کرتا اور ان کے اصول کلیات مقرر کرتا ہے جن پہلوؤں سے ایک شخص اپنے کنبہ یا قبیلہ یا قوم یا ملک یا اپنے ابنائے جنس کے ساتھ جڑتا ہے۔ اگر یہ جڑنا رشتہ اور قرابت کی نوعیت کا ہے تو اسلام اس کے لیے بھی حقوق و فرائض مقرر کرتا ہے، اگر یہ جڑنا اقتصادی و تجارتی نوعیت کا ہے تو اسلام اس کے بھی حدود و قیود معین کرتا ہے اور اگر یہ جڑنا سیاسی و اجتماعی پہلو رکھتا ہے تو اسلام اس کے چاروں گوشے بھی واضح کرتا ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اسلام کی نگرانی سے آزاد ہو۔ اس وجہ سے کوئی نظام زندگی، اسلامی زندگی کہلانے کا مستحق اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ ہر پہلو سے اسلامی ہو۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ اپنے اسی پرانے نظام کو لے کر جو انگریزوں کا بنایا ہوا ہے، کچھ اس کے اَبرے سے لیں اور کچھ اس کے استر سے اور اس کے جھول جھال کو ٹھیک کر کے اور کچھ اس میں اسلامی رنگ کے پیوند لگا کر اس کو مسلمانوں کے اوپر اڑھا دیں اور کہنا شروع کر دیں کہ یہ لو! اسلامی نظام تیار ہو گیا تو یہ کھلی ہوئی دھوکہ بازی ہوگی۔ اسلامی نظام اس قسم کی پیوند کاری یا گلکاری سے نہیں بنے گا، بلکہ موجودہ نظام زندگی کے ہر شعبہ کو یک قلم بدل کر اس کو خالص اسلامی اصولوں کی اساس پر تعمیر کرنا ہوگا۔ یہ تبدیلی اگرچہ تدریجاً ہوگی — اس تدریج کی صورت میں آگے چل کر واضح کروں گا — لیکن بہرصورت تبدیلی ہمہ گیر ہوگی۔ یعنی موجودہ نظام پورے کا پورا بدل کر اس کی جگہ پورا اسلامی نظام جاری کرنا ہوگا، نظام اسلامی کے مجموعہ میں سے کچھ کی بیشی کرنے یا اس میں ترجیح و انتخاب کا حق ہمیں حاصل نہیں ہے!

اسلام کا کوئی حصہ اختیاری نہیں ہے، سب کا سب واجب اور ضروری ہے۔ اسی طرح

واجب اور ضروری، جس طرح نماز و روزہ! البتہ اگر فرق ہے تو اس اعتبار سے فرق ہے کہ اسلام کے اجتماعی احکام کی تعمیل اس وقت تک افراد پر ضروری نہیں ہوتی جب تک وہ ایک بااختیار اور آزاد جماعت کی حیثیت حاصل نہ کر لیں۔ یہ حیثیت حاصل ہو جانے کے بعد دین کے تمام اجزاء جماعت پر یکساں طور پر واجب ہو جاتے ہیں، خواہ ان کا تعلق روزہ و نماز سے ہو یا حدود و تعزیرات سے ہو یا جہاد و قتال سے! اس قسم کی کلی تبدیلی، قطع نظر اس سے کہ یہ اسلام کا مطالبہ ہے، اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ اسلامی نظام کے مختلف اجزاء کا اصلی حسن اسی وقت سامنے آتا ہے جب وہ اجزاء خود اپنے فریم کے اندر ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو بلکہ اسلامی نظام زندگی کے ایک یا بعض اجزاء کو لے کر ان کا پیوند کسی اور نظام زندگی میں لگا دیا جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ اسلامی جزو کی اصلی خوبی لوگوں کے سامنے نہیں آئے گی، بلکہ یہ اپنے اصلی جسم سے کاٹ کر ایک دوسرے جسم میں جوڑے جانے کی وجہ سے بے ڈھنگا بھی معلوم ہوگا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام میں چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا یا زنا پر سنگسار کرنے کی سزا جاری کر[...]نے کا حق اس وقت دیا گیا ہے جب ملک کا معاشی اور معاشرتی نظام اسلام کے پاکیزہ اصولوں پر قائم کیا جا چکا ہو۔ اس طرح کے ماحول میں چوری اور زنا کی یہ سزائیں نہ صرف واجبی اور معقول ہوں گی بلکہ ان جرائم کی اس سے کم درجہ سزا پر اس طرح کے ماحول میں بسنے والوں کا حساس ضمیر مطمئن ہی نہیں ہو گا۔ لیکن اگر یہی سزائیں آپ موجودہ معاشی اور معاشرتی ماحول کے اندر جاری کر دیں تو ہر شخص ان سزاؤں کو غیر معقول اور بے رحمانہ قرار دے گا اور اس مذہب سے اسے بدگمانی ہوگی جس کے اندر ایسے عام جرائم پر اتنی سخت سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ اس وجہ سے ہم اس بات کو اسلام کے لیے نہایت مضر سمجھتے ہیں کہ موجودہ جاہلی نظام زندگی کے فریم میں اسلام کے پرسنل لاء یا اس کے کرمنل لاء کو ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ اس کوشش سے اسلام کو فائدہ پہنچنے کی بجائے الٹا نقصان پہنچے گا اور موجودہ نسلیں جو غیر اسلامی ماحول اور غیر اسلامی تعلیم و تربیت کے زیر سایہ پلنے اور بڑھنے کی وجہ سے اسلام سے پہلے ہی کچھ بدگمان ہیں، اندیشہ ہے کہ اگر اسلامی نظام زندگی سے ان کا یہ الٹا تعارف کرایا گیا تو ان کی

یہ بدگمانی اور زیادہ بڑھ جائے گی اور دوسری قوموں کو بھی اسلامی احکام کی قدر و قیمت پہچاننے میں سخت زحمت پیش آئے گی۔

حکومت کیسے مسلمان بنتی ہے

تیسری نہایت اہم بات جو اس سلسلہ میں معلوم کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ جس طریقے سے ایک شخص کفر کی حالت سے نکل کر اسلام کی حالت میں داخل ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح کوئی نظام زندگی یا کوئی سٹیٹ بھی جاہلیت سے نکل کر اسلام کو اختیار کرتا ہے۔ اگر آپ کسی غیر مسلم کو مسلمان بنانا چاہیں تو اس کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کرتے کہ پہلے اس کے سر پر مسلمانوں جیسی پگڑی باندھ دیں یا اس کے چہرے پر داڑھی لگا دیں یا اس کو گائے کا گوشت کھلا دیں اور پھر اس سے کہیں کہ جا تو اب اسلام میں داخل ہو گیا ہے، آہستہ آہستہ بقیہ اسلام کو بھی اختیار کر لینا۔ بلکہ پہلے آپ اس سے خدائے وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کے واجب الاطاعت ہادی ہونے کا اقرار کراتے ہیں۔ جب وہ ان باتوں کا اقرار کر لیتا ہے تو آپ اس کو مہلت دیتے ہیں کہ اب وہ بالتدریج اپنی ساری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ ڈالے۔ اسی طرح جب کوئی حکومت مسلمان بننے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کے لیے یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ وہ پہلے اپنے دائرے کے اندر شادی، بیاہ اور نکاح و طلاق سے متعلق اسلامی قوانین جاری کر دے یا کچھ مولویوں کو بھرتی کر کے پولیس کو نماز پڑھانے کی مہم جاری کر دے۔ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے اپنے (Constitution) دستور کی زبان سے، جو کسی سٹیٹ کے ارادۂ عمومی (General Will) کے اظہار کا واحد ذریعہ ہے، خدا کی حاکمیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کے واجب الاطاعت لیڈر ہونے کا اقرار کرے۔ یہ اقرار کر لینے کے بعد سٹیٹ نے گویا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھ لیا۔ اب اس کو مہلت دی جائے گی کہ جس تربیت و تدریج کے ساتھ اسلام کے اجتماعی قوانین اختیار کرنے کی اسلام میں ہدایت کی گئی ہے، اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ وہ اسلام کے

تمدنی، معاشرتی اور اقتصادی ضابطوں کو اختیار کرنا شروع کرے، یہاں تک کہ ایک دن پورے طور پر اسلام کے رنگ میں رنگ جائے اور اس کی زندگی کے کسی گوشے میں بھی جاہلی نظام زندگی کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے۔ اگر اس فطری طریق کو چھوڑ کر غیر فطری طریقہ اختیار کیا گیا، جیسا کہ پاکستان کے لیڈر پاکستان کی حکومت کو اسلامی بنانے کے لیے اختیار کر رہے ہیں، تو اندیشہ ہے کہ اس طرح یہ ملک کبھی بھی اسلامی حکومت کی صورت نہیں دیکھ سکے گا۔ ہم ان لیڈروں کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کرتے۔ ممکن ہے وہ نیک نیتی کے ساتھ یہ خیال کر رہے ہوں کہ اس طرح وہ آہستہ آہستہ ملک کے پورے نظام کو اسلامی بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن ہم اس پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ یہ الٹی تدریج اسلامی نظام کے مطالبہ سے لوگوں کو پھیرنے یا نئی نسلوں کو اس سے کچھ بدگمان کرنے کے لیے تو مفید ہوگی، لیکن اسلامی نظام کو برپا کرنے کے لیے یہ ذرا بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ ہم تدریج کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اس کو از روئے شریعت ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس الٹی تدریج کو نہایت مہلک خیال کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک فطری تدریج یہی ہے کہ پہلے سٹیٹ اپنے دستور کی زبان سے کلمہ پڑھے اور خدا کی حاکمیت کے حق میں اپنی حاکمیت سے دست برداری کا اعلان کرے، اس کے بعد درجہ بدرجہ اپنے نظام کے ہر شعبے کو اس عقیدے کی روشنی میں بدلے۔ پہلے سٹیٹ کی صورت کو، پھر نظام تعلیم کو، پھر قضا اور عدالت کے طریقوں کو، پھر معاشرتی اور اقتصادی طریقوں کو، یہاں تک کہ قومی ضابطہ حیات سے لے کر خارجی سیاست تک ہر چیز کا مزاج یکسر اسلامی ہو جائے۔ لیکن سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سٹیٹ کا اقرار ایمان چنداں ضروری نہیں ہے، بلکہ ایک لادینی جمہوری ریاست بھی قائم ہو جائے تو اس کے نظام میں بھی آہستہ آہستہ اسلامی نظام حیات کے اجزاء کا پیوند لگا کر اس کو اسلامی رنگ کا بنا لیا جائے گا۔ اس طرح کے لوگوں کو کون سمجھائے کہ کسی منکر خدا اور رسول کو محض داڑھی رکھوا کر یا پگڑی بندھوا کر مسلمان نہیں بنایا جا سکتا، اسی طرح ایک لادینی جمہوری ریاست کو محض نکاح و طلاق کے اسلامی قوانین کے ذریعہ سے اسلام کی طرف نہیں لایا جا سکتا۔ اور یہ بات کہ اس ملک کے اندر مسلمانوں کی

اکثریت ہے اس وجہ سے وہ لازماً ایک لادینی جمہوری ریاست کو بھی اسلام ہی کی طرف کھینچے گی، محض ایک غلطانہ خیال ہے۔ اگر ایک مرتبہ لادینی جمہوری سٹیٹ قائم ہو گیا تو کچھ دنوں تک تو ممکن ہے کہ یہ صورت قائم رہ سکے کہ آپ مسلمان رہیں اور آپ کی حکومت کافر! لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ آپ کی سٹیٹ اس دورنگی کو مٹا کر رہے گی اور بالآخر سٹیٹ کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی کافر بننا پڑے گا۔

اس وقت مقصود اسلامی نظام کی تفصیلات کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اسلامی نظامِ زندگی سے متعلق بعض ایسی اصولی باتوں کو آپ کے سامنے رکھ دینا ہے جو آپ کو ان دستوری تبدیلیوں کے رجحان کو سمجھنے میں مدد دے سکیں جو مستقبل قریب میں اس ملک میں ہونے والی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مقصد کے لیے یہ باتیں کافی ہوں گی۔ اس وجہ سے میں ان سے ہٹ کر ان عذرات پر اب چند حرف عرض کرنے کی کوشش کروں گا جو اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں پیش کیے جاتے ہیں۔

بعض عذرات اور ان کا جواب

میں نے عذرات کا لفظ بالقصد استعمال کیا ہے ورنہ بعض باتیں اسلامی نظام کی نسبت ایسی بھی کہی جاتی ہیں جو صریح مخالفت کی حیثیت رکھتی ہیں اور صرف انہی لوگوں کی طرف سے نہیں کہی جاتی ہیں جو غیر مسلم ہیں، بلکہ ان لوگوں کی طرف سے بھی کہی جاتی ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ میں اسلام کے ان مسلمان مخالفین کے جواب میں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اگر انہیں اسلامی نظام پر اعتراضات ہیں تو وہ جو نظامِ زندگی چاہیں اس کو اختیار کر لیں اور کھلم کھلا اختیار کریں۔ وہ خواہ مخواہ اسلام کے ساتھ چمٹے نہ رہیں بلکہ اخلاقی جرأت کا ثبوت دیں اور اپنے لیے مسلمانوں کے دائرہ سے کوئی جگہ باہر تلاش کر لیں۔ البتہ میں ان لوگوں کے عذرات کا جواب دینا چاہتا ہوں جو اسلامی نظام کی قدر و قیمت اور اس کے قیام کی ضرورت و اہمیت کا تو اعتراف کرتے ہیں لیکن بعض وقتی

حالات یا سیاسی مصالح کو بطور عذر پیش کر کے فی الحال اس کو ملتوی کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔

یہ لوگ جو باتیں کہہ رہے ہیں ان میں سے دو باتوں کو خاص طور پر اہمیت دی جا رہی ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اس وقت پاکستان مختلف قسم کے اندرونی و بیرونی خطرات سے گھرا ہوا ہے۔ انڈین یونین اس کے تباہ کرنے پر تلی ہوئی بیٹھی ہے، سکھ اس کے خلاف الگ غصہ سے کھول رہے ہیں، کشمیر میں الگ جھگڑا چل رہا ہے، اندرونی ملک کا یہ حال ہے کہ پناہ گزینوں کے مسئلے نے ملک کے معاشی نظام اور اس کی انتظامی مشینری کو درہم برہم کر ڈالا ہے اور بعض سیاسی تحریکیں بھی (مثلاً پٹھانستان کی تحریک) موجود ہیں جو پاکستان کی وحدت کے لیے سخت خطرہ بن سکتی ہیں۔ ان حالات کے اندر اسلامی نظام کا سوال ایک بے وقت سوال ہے جس کے اٹھ کھڑے ہونے سے اندیشہ ہے کہ بیرونی خطرات اور اندرونی مشکلات دونوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر پاکستان میں مذہبی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو لازمی طور پر اس کا ردِّعمل ہندوستان میں یہ ہو گا کہ ہندو مہاسبھا کی تحریک کو تقویت ہو گی اور وہاں بھی ایک لادینی جمہوری حکومت کی جگہ خالص مذہبی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی جس سے اقلیتوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص نقصان پہنچے گا اور ان کی رہی سہی آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں ان دونوں باتوں کا مختصراً جواب دوں گا۔

خطرات کے عذر کا جواب

پہلی بات کے جواب میں گزارش ہے کہ ان خطرات کی وجہ سے اس چیز کو ملتوی کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے جس کی خاطر ہی ہم نے ان خطرات کو دعوت دی ہے۔ میں شروع میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں کہ اگر ہم اسلام اور اسلامی زندگی اپنے لیے ناگزیر خیال نہ کرتے ہوتے اور اس کو کسی وجہ سے بھی ملتوی کرنا ہمارے لیے جائز ہوتا تو ہمارے

لیے پاکستان کے مطالبہ کے لیے کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ ہم نے یہ خطرناک مطالبہ کیا ہی اس وجہ سے تھا کہ ہم ہر خطرہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں، لیکن اسلام کو ملتوی نہیں کر سکتے! پھر یہ کتنی نامعقول بات ہوگی کہ ہم اپنے مسلمان بننے کو ملتوی رکھ چھوڑیں کہ اس وجہ سے کچھ خطرات اور مشکلات ہیں۔ اگر ان خطرات اور مشکلات کی وجہ سے اسلام کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے تو پھر نہ تو ہندوستان کو تقسیم کرانے ہی کی کوئی ضرورت تھی اور نہ اپنی قوم کو ان مصائب میں مبتلا کرنے ہی کی کوئی وجہ تھی، جن میں آپ اس کو مبتلا کر چکے۔ لیکن یہ سب کچھ کر گزرنے کے بعد یہ کتنی عجیب بات ہے کہ خطرات و مصائب کے احساس نے ہم کو اسی چیز سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا ہے جس کو ہم اپنی زندگی کے لیے سانس کی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری خیال کرتے تھے۔

ممکن ہے یہ باریک بات بعض لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے، اس وجہ سے ان خطرات پر ایک دوسرے پہلو سے غور کیجیے۔ یہ سارے خطرات جو آج موجود ہیں اور جو کل پیدا ہو سکتے ہیں، یہ اس ملک کے سر پر اس وقت تک برابر منڈلاتے رہیں گے جب تک یہ صرف ایک چھوٹی سی پاکستانی قوم کا قومی وطن (Home Land) ہے۔ جب تک آپ محض ایک قوم ہیں، اس وقت تک آپ کے لیے اور اس ملک کے لیے نہ ہندوستان کی طرف سے مطمئن ہونے کی کوئی صورت ہے، نہ روس کی طرف سے اور نہ ایران و افغانستان کی طرف سے! ایران و افغانستان کے ساتھ اگرچہ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا رشتہ اخوت کا رشتہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ کی ترقی جس طرح ہندوستانی قومیت کے مفاد کے خلاف ہے اسی طرح ایرانی و افغانی قومیت کے بھی خلاف ہے، اس وجہ سے کہ بحیثیت ایک 'قوم' کے دنیا کی تمام دوسری قوموں کے ساتھ آپ کا فطری تعلق عداوت اور رقابت ہی کا ہو سکتا ہے نہ کہ دوستی، اخوت اور ہمدردی کا! ایک قوم رہتے ہوئے آپ دنیا کی دوسری قوموں سے زیادہ سے زیادہ جس بات کی توقع کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ظاہر میں وہ آپ کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوئی کوشش نہ کریں اور آپ کے تعاون کا جواب تعاون سے دیں اور یہ

توقع بھی صرف ان ہی قوموں سے کر سکتے ہیں جن کے سیاسی مصالح ان کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ آپ کے ساتھ رواداری اور تعاون کا رابطہ رکھیں۔ اسی وجہ سے جو خطرات آپ آج محسوس کر رہے ہیں ان خطرات کے کافور ہونے کی توقع کل بھی نہیں کی جا سکتی اور اگر ان کی وجہ سے آپ اسلامی نظام کے قیام کو ملتوی کر رہے ہیں تو پھر اس کو ہمیشہ کے لیے ملتوی ہی سمجھیے۔

اصل قوت اسلام ہے

کسی قوم کے لیے دوسری قوموں کی طرف سے بے خوف اور مطمئن ہونے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے بجز اس ایک راستہ کے کہ اپنے وسائل و ذرائع اور اپنی مادی اور جنگی قوتوں کے لحاظ سے وہ تمام معاصر قوتوں سے بازی لے جائے۔ لیکن پاکستان جیسے محدود ذرائع رکھنے والے ملک کے لیے، بالخصوص جبکہ وہ ہر طرف سے وسیع ذرائع رکھنے والی رقیب طاقتوں سے گھرا ہوا ہے، ایسی عظمت حاصل کر لینا کہ وہ دنیا کی قوموں سے ڈرنے کے بجائے خود ان کے لیے خطرہ بن جائے اگرچہ محال نہیں ہے لیکن قومی راستوں سے یہ مقام حاصل کرنا کم از کم ایک مدت دراز تک کے لیے محال ہے۔ البتہ اس کا ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ پاکستان کے باشندے ایک 'قوم' بننے کے بجائے 'ملتِ مسلمہ' بننے کی ہمت کریں اور پاکستان کو پاکستانی قومیت کا وطن بنانے کی جگہ اس کو اسلامی دعوت اور اسلامی تحریک کا مرکز بنائیں۔ یہ اسلامی تحریک بلاشبہ ایک ایسی چیز ہے جس کی طرف بلا امتیاز نسل و قوم تمام دنیا کو بلایا جا سکتا ہے اور تمام نسل انسانی کے لیے اس کے اندر کشش ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی قومی اور وطنی چیز نہیں ہے بلکہ ایک اصولی چیز ہے۔ اس کو تمام دنیا پر غالب کرنے کے لیے مادی وسائل و ذرائع کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اس کی طرف دعوت اور اس کے مظاہرہ کی ضرورت ہے۔ اس کو دنیا سے منوانے کے لیے مادی اور جنگی قوتوں کی پشت پناہی درکار نہیں ہوگی، بلکہ اسلامی تعلیمات کی خود اپنی قوت اور جاذبیت اس کے لیے فوج اور لشکر کا کام دے گی۔ دنیا کی قومیں اس کو کسی قوم کا غلبہ سمجھ کر اس کے خلاف بغاوت کرنے کے

بجائے ان لوگوں کے خلاف بغاوت کریں گی جو اس کے خلاف نفرت پھیلانے کی یا اس کی مزاحمت کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح اگر آپ چاہیں تو آپ دفعتہً اپنی اور اپنے اس ملک کی حالت بدل دے سکتے ہیں۔ آج ہر طرف سے دوسرے آپ کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں اور آپ ان سے ڈر رہے ہیں لیکن کل — اگر آپ نے اپنی حالت بدل لی — آپ تمام دنیا کے لیے رحمت بن جائیں گے اور سب آپ کی راہ دیکھیں گے۔ عربوں کی قوم ایک نہایت چھوٹی سی قوم تھی ان کے وسائل و ذرائع نہ صرف محدود بلکہ بمنزلہ صفر تھے اگر وہ محض اپنے قومی وسائل کے بل پر لاکھ برس بھی کوشش کرتے تو شاید اونٹوں کی چرواہی سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عزت سے ان کو سرفراز کیا اور وہ اس کو لے کر اٹھے اور چشم زدن میں مراکش سے لے کر دیوار چین تک پھیل گئے اور زمین کے ہر گوشے میں انسانیت کے نجات دہندوں کی حیثیت سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہ راہ آپ کے لیے بھی کھلی ہوئی ہے اگر آپ اسلامی دعوت اور اسلامی سیرت کے ساتھ اس راہ پر چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو کامیابی حاصل نہ ہو۔

یہ خیال نہ کیجیے کہ ترکوں نے مذہب اور خلافت سے جو دستبرداری کا اعلان کیا، اس کی وجہ خدانخواستہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں مذہب اور خلافت کے لیے دنیا میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ ترکوں کے پاس نہ مذہب تھا اور نہ خلافت بلکہ ایک بے جان سی ملوکیت تھی جس کو انہوں نے خلافت کا نام دے رکھا تھا۔ اس طرح کی کسی چیز کے لیے بلاشبہ موجودہ زمانہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور اچھا ہوا کہ ترکوں نے اس ڈھونگ کو ختم کر دیا! ہم آپ کو ترکوں کی دفن کی ہوئی لاش کو اکھاڑنے کی دعوت نہیں دے رہے ہیں بلکہ اس نظامِ اسلامی کو قائم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں جو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ سلطان عبدالحمید اور سلطان عبدالمجید کی خلافت کے احیاء کے لیے نہیں پکار رہے ہیں!

امامت اقوام کا منصب

سائنس کی ترقیوں نے اب چھوٹی چھوٹی قومی اور وطنی ریاستوں کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب دنیا ایک عالمگیر ریاست (World State) کے قیام کی ضرورت بے چینی کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ اس کی اسی مخفی خواہش کا اظہار پہلی جنگِ عظیم کے بعد

جمعیتِ اقوام (League of Nations) کی صورت میں ہوا تھا اور اب دوسری جنگِ عظیم کے بعد اقوامِ متحدہ (U.N.O) کی شکل میں ہوا ہے۔ لیکن ایک عالمگیر ریاست کے لیے جو بنیادی اصول درکار ہیں، دنیا ان سے ناآشنا ہے۔ اس وجہ سے ایک بچے کی طرح دنیا اپنے درد کا اظہار تو کرتی ہے لیکن نہ تو وہ اس درد کو بیان کر سکتی ہے اور نہ اس کے علاج کا ہی اس کو علم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح جمعیتِ اقوام کا ناقص علاج ناکام رہا اسی طرح اقوامِ متحدہ (U.N.O) کا غلط علاج بھی ناکام ہو رہا ہے۔ روس ایک اصولی تحریک لے کر اٹھا تھا اور بہتوں کو یہ گمان تھا کہ وہ اس دنیا کے اس مطالبہ کو پورا کر دے گا، لیکن اس کو اپنے اصولوں کی کمزوری کی وجہ سے بالآخر اپنے خول میں سمٹ جانا پڑا۔ ہم کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ دنیا کی اس ضرورت کو صرف اسلامی نظام ہی پورا کر سکتا ہے۔ لیکن کسی نظام کو پیش کرنے کا کام کوئی فرد واحد — خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو — انجام نہیں دے سکتا۔ یہ کام درحقیقت ایک ملک کے کرنے کا ہے اور اگر پاکستان اس کام کا بیڑا اٹھا لے تو اس کی اپنی مشکلات کا بھی اس میں علاج ہے اور دنیا کی ساری مشکلات کا بھی اس میں خاتمہ ہے۔ ہماری دلی آرزو اور دعا ہے کہ پاکستان اس کام کو انجام دینے کی توفیق پائے اور دنیا کی امامت کی ذمہ داریاں سنبھالے!

ہندوؤں کی مذہبی حکومت کا ہوّا

دوسرا عذر جو پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی بے بنیاد ہے اور اس کے بے بنیاد ہونے کے متعدد وجوہ ہیں، جن میں سے بعض کی طرف میں اشارہ کروں گا۔

اول تو اس بات کو خوب یاد رکھیے کہ ہندوستان میں ہندو اگر مذہبی حکومت نہیں قائم کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو اپنی مسلمان اقلیت کا لحاظ ہے۔ جہاں تک اقلیتوں کا تعلق ہے، ان کے حقوق تلف کرنے کے لیے ہندوؤں کی ایک لادینی جمہوری ریاست بھی اسی طرح بے رحم ثابت ہو سکتی ہے جس طرح ان کی ایک مذہبی حکومت ہو سکتی ہے۔ البتہ وہ مذہبی حکومت کا نام اگر نہیں لے رہے ہیں اور نہیں لے سکتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مذہب کی بنیاد ذات پات کے ایسے امتیازات پر ہے کہ ان کی قوم خود مذہبی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتی اور اگر کوئی مذہبی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے خلاف

سب سے پہلے خود ہندو قوم بغاوت کرے گی۔ اس وجہ سے یہ چیز ہمارے ڈرنے کی نہیں ہے بلکہ آپ کو خواہش کرنی چاہیے کہ ایسا ہو۔ اگر آپ پاکستان میں اسلام کی حکومت قائم کریں اور ہندو اس کے جواب میں ہندوستان میں اپنی مذہبی حکومت قائم کر دیں تو یہ مقابلہ ان شاء اللہ آپ کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ اس مقابلہ میں اسلام کی وہ خوبیاں اور صلاحیتیں تمام دنیا پر واضح ہو جائیں گی جو ایک مدت سے لوگوں کے سامنے نہیں ہیں، ان کے واضح ہونے کے بعد آپ گھاٹے میں نہیں بلکہ نفع میں رہیں گے!

غیر مسلموں کے حقوق

دوسری بات یہ ہے کہ ہندوؤں اور غیر مسلموں کو اگر ہماری مذہبی حکومت سے کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو اس حالت میں ہو سکتی ہے، جبکہ اس کے زیرِ سایہ ان کے حقوق تلف ہونے کا کوئی اندیشہ ہو یا ایک لادینی ریاست میں ان کو زیادہ حقوق پانے کی توقع ہو۔ اگر یہ باتیں نہ ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ ایک لادینی ریاست ہی کے قیام پر اصرار کریں۔ میں اسلام کے متعلق جو تھوڑا بہت علم رکھتا ہوں، اس کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی لادینی جمہوری ریاست اپنے اندر بسنے والی اقلیتوں کو جو زیادہ سے زیادہ حقوق دیتی ہے، اسلامی حکومت اپنے دائرہ کے اندر بسنے والی غیر مسلم رعایا کو اس سے کہیں زیادہ حقوق دیتی ہے، البتہ اسلام نے حقوق اور ذمہ داریوں میں فرق کیا ہے۔ ذمہ داریوں کا بوجھ صرف ان لوگوں پر ڈالا ہے جو اسلام پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن حقوق میں سٹیٹ کے اندر بسنے والے ہر فرد کو یکساں شریک کیا ہے — خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ہو۔ ایک اسلامی سٹیٹ کے اندر غیر مسلموں کے حقوق نمائشی نہیں ہوتے بلکہ واقعی اور قطعی ہوتے ہیں اور اسلامی سٹیٹ ان کے لیے خلق اور خالق دونوں کے آگے جواب دہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس لادینی جمہوری ریاستوں کے اندر اقلیتوں کے حقوق محض نمائشی ہوتے ہیں جو کاغذ پر تو نظر آتے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں نہ تو ان کا کوئی وجود نظر آتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی لادینی جمہوری ریاست اقلیت کے کسی فرد کو وزارت کے منصب پر سرفراز کر دے لیکن کوئی اقلیت اپنے حقوق پر اصرار کر کے کسی

جمہوری ریاست کے اندر پنپ نہیں سکتی۔ غیر مسلموں کو اگر شکایت ہو سکتی ہے اور بجا طور پر ہو سکتی ہے تو آپ کی ان زیادتیوں کی وجہ سے ہو سکتی ہے جو آپ نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ان پر کی ہیں اور جن کے سبب سے آپ نے ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کو بھی نقصان پہنچایا ہے اور اسلام کو بھی سخت بدنام کیا ہے! لیکن یہ ساری حرکتیں تو آپ کر گزرے اور آپ نے ذرا نہ سوچا کہ ان کے اثرات آپ کے کروڑوں بھائیوں پر اور آپ کے دین پر کیا پڑیں گے، لیکن جب صحیح کام کرنے کا وقت آیا ہے اور جس کو انجام دے کر آپ اسلام کی، ہندوستان کے مسلمانوں کی، پاکستان کے غیر مسلموں کی اور خود اپنی ایک سچی خدمت انجام دے سکتے ہیں تو آپ ڈر رہے ہیں کہ ادھر آپ نے اس کا ارادہ کیا اور ادھر ہندوستان کے مسلمان تباہ ہو گئے! بلاشبہ مذہبی حکومت کا نام لینے سے غیر مسلموں کو کچھ بدگمانیاں ہوں گی۔ لیکن یہ بدگمانیاں اسی وقت تک باقی رہیں گی جب تک ان کے سامنے ان کی صحیح صورت نہیں آئے گی۔ لیکن جونہی اس کا اصلی نقشہ ان کے سامنے آیا، وہ اس کو ایک لادینی جمہوری ریاست پر بہرحال ترجیح دیں گے اور اس کے زیرِ سایہ رہنا اپنی خوش قسمتی سمجھیں گے۔ بشرطیکہ آپ اسلامی حکومت قائم کریں۔

علماء اور مشائخ سے گذارش

آخر میں مجھے علماء و مشائخ سے یہ عرض کرنا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔ انہوں نے جس پاکستان کے حصول کے لیے اللہ اور رسول کے نام پر اپیل کی تھی، وہ حاصل ہو چکا ہے اور اس کی دستور ساز اسمبلی نے اپنا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ یہ دستور ساز اسمبلی آپ کی نمائندہ ہے، اس وجہ سے آپ اس کے فیصلوں کے متعلق خدا کے آگے ذمہ دار ہوں گے۔ بظاہر اس دستور ساز اسمبلی کے لیے دو ہی امکانات ہیں، یا یہ ان وجوہ کی بناء پر جن کو میں شروع تقریر میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں، دستور میں اس امر کا اقرار کرے گی کہ پاکستان کی بادشاہی خدا کی ہے اور اس کے نظام اور قانون کی بنیاد خدا کی شریعت پر ہے، یا وقت کے حالات اور اربابِ کار کے رجحانات سے دب کر ایک لادینی جمہوری ریاست کے قیام کا فیصلہ کرے گی۔ یہ دونوں باتیں یکساں نہیں ہیں، بلکہ دونوں میں آسمان و زمین کا فرق

ہے۔اگر پہلی بات ہوئی تو نہ صرف دستور بدلے گا بلکہ اس ملک کا پورا نظام بدلے گا، اور مذہب جو ہمارے موجودہ نظامِ زندگی کے بے شمار شعبوں میں سے محض ایک شعبہ اور نہایت حقیر شعبہ ہے،اس تبدیلی کے بعد اصلی مرکزی جگہ حاصل کرے گا، اور ہر چیز اس کے تابع ہوجائے گی۔تعلیم میں مرکزِ نگاہ یہ ہوگا،تہذیب وتمدن میں معیار یہ قرار پائے گا،قانون اور قضا میں اصلی جگہ اس کو حاصل ہوگی، معاشی نظام اس کے سانچے میں ڈھلے گا، اور سیاسی نظام اس کی بنیاد پر قائم ہوگا،جس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوگا کہ موجودہ نظام میں جو بڑے ہیں وہ آئندہ نظام میں چھوٹے ہوجائیں گے اور جو موجودہ نظام میں چھوٹے ہیں وہ آئندہ نظام میں بڑے ہوجائیں۔ اسی طرح اگر دوسری شکل ہوئی تو اس کے نتائج بھی نہایت دور رس ہوں گے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ایک لادینی جمہوری ریاست کی طرف سے اس کے ساتھ دو ہی طرح کے سلوک کی توقع کی جاسکتی ہے، یا تو وہ چشم پوشی اور اغماض کا سلوک کرے گی، یا عناد کی پالیسی اختیار کرے گی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ دونوں طرح کے سلوک لادینی حکومتیں دو مختلف طرح کے حالات کے اندر کرتی ہیں۔جن ملکوں کے اندر مذہبی احساس کمزور ہوتا ہے وہاں لادینی حکومتیں بالعموم چشم پوشی کی پالیسی اختیار کرتی ہیں اور پیشِ نظر یہ بات ہوتی ہے کہ نظام غالب کے تحت یہ خفیف مذہبی احساس خود اپنی موت مرجائے گا،اس کو مارنے کے لیے ہتھیار اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔لیکن جہاں مذہبی شعور قوی اور مذہبی ادارے طاقتور ہوں اور لادینی حکومت محسوس کرتی ہو کہ اس کی جڑیں اس زمین میں اس وقت تک پوری طرح نہیں پھیل سکتی ہیں جب تک مذہبی جڑیں نہ اکھاڑ دی جائیں، وہاں وہ پوری طاقت کے ساتھ اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ مذہب کے نام ونشان بھی باقی نہ چھوڑے۔میرا اندازہ ہے کہ پاکستان کے حالات اسی طرح کے ہیں اس وجہ سے اگر اس ملک میں کسی لادینی ریاست کے قیام کا فیصلہ ہوا تو اس کی تعمیر مذہب کی تخریب کے بعد ہی ممکن ہوسکے گی اور لادینیت کے ائمہ مجبور ہوں گے کہ اس سرزمین کو تمام مذہبی آثار اور محرکات سے اس طرح صاف کردیں جس طرح کمال اتاترک اور اس کے ساتھیوں نے ترکی کو تمام مذہبی باقیات سے صاف کردیا تھا۔

گروہی تعصّبات کو خیر باد کہیے

ان نتائج کی روشنی میں حضرات علماء اپنی ذمہ داریوں کو خود سمجھ سکتے ہیں۔اگر فی الواقع ان

کو مذہب عزیز ہے تو ان کو اپنے گروہی تعصبات کو خیر باد کہہ کر بیک آواز مذہبی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنا چاہیے۔آپ کو علم ہوگا کہ بعض بہانہ ساز لوگوں کی طرف سے علماء کے فقہی اختلافات اور گروہی تعصبات کو اسلامی نظام حکومت کے خلاف بطور ایک الزام کے پیش کیا جاتا ہے۔ اس الزام کو دور کرنا ہمارے علماء کا فرض ہے۔ ہر گروہ کے علماء کو یہ اعلان کردینا چاہیے کہ اسلامی حکومت کسی متعین فقہ پر مبنی نہ ہوگی کہ مختلف گروہوں کے تعصبات کو اس کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کیا جائے اسلامی حکومت کی بنیاد اللہ اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت اور اجتہاد اور شوریٰ پر ہوگی۔ ان ہی اصولوں پر خلافتِ راشدہ کی بنیاد تھی اور اسی نظام کے اندر لوگ رائے کی حد تک اپنے اختلافات کو باقی رکھتے ہوئے بھی اولی الامر کے فیصلوں کی اطاعت کرتے تھے۔ یہی طریقہ ہماری اسٹیٹ کا بھی ہوگا۔ یہ طریقہ آزادیٔ رائے کی بھی بہتر طریق پر حفاظت کرتا ہے اور اسٹیٹ کی آئینی اور انتظامی دقتوں کو بھی رفع کردیتا ہے۔

صوفیا ومشائخ کے کارنامے

میں حضرات مشائخ وصوفیا کو بھی ان کی تاریخ یاد دلانا چاہتا ہوں۔میرا خیال ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جب اسلامی حکومت نے اپنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خصوصیت کھودی اور آہستہ آہستہ اسلامی نظام میں انتشار پیدا ہوگیا اور اس بات کا ڈر ہوا کہ اصلاح ودعوت کا کوئی نظام باقی نہ رہنے کی وجہ سے مسلمان دینی بے حسی اور گمراہی میں مبتلا ہوجائیں گے تو ہمارے بہت سے بزرگوں نے مسلمانوں کو اس بے دینی کے فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق دعوت وارشاد کے الگ الگ حلقے بنالیے اور اس طرح لوگوں کو اپنے اپنے حلقہ سے وابستہ کرکے حتی المقدور ان کو بے دینی اور گمراہی سے بچانے کی کوشش کی۔ان بزرگوں کی ان کوششوں سے ایک طرف تو غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت پہنچی اور دوسری طرف مسلمانوں میں بھی دینی روایات زندہ رہیں لیکن بعد میں ان حلقوں نے گدیوں کی صورت اختیار کرلی اور پھر آہستہ آہستہ ان گدیوں کے ساتھ ایک طرف تو لوگوں کے ذاتی مفاد وابستہ ہوگئے اور دوسری طرف ان کی تمام ہما ہمی خدمتِ دین کے بجائے رسوم وبدعات پر منحصر رہ گئی۔ اپنی اس تاریخ پر اگر ہمارے مشائخ غور کریں اور شخصی وقار اور ذاتی مفاد کے

پہلوؤں کو نظر انداز کر کے غور کریں تو وہ محسوس کریں گے کہ ان کے بزرگ اسلاف نے جس مقصد حق کی خاطر اپنے یہ الگ الگ زاویے بنائے تھے اب اس مقصد کے لیے اس نظام شرعی کے قیام کا موقع اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیا ہے جو اس مقصد کے انجام دینے کا اصلی ذریعہ ہے۔ اس موقع کے پیدا ہو جانے کے بعد اب دعوت و ارشاد اور بیعت و ارادت کی تمام انفرادی کوششوں کو ایک مرکز میں مرتکز کرنے کی سعی کرنی چاہیے اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ دعوت و ارشاد کے جس مرکزی منارۂ نور کے گر جانے کے سبب سے ہمارے بزرگوں کو یہ الگ الگ چراغ جلانے پڑے تھے، اب اس منارہ کو از سر نو تعمیر کرنے کی صورتیں پیدا ہو گئیں ہیں اور اس کو تعمیر کر دینے کے بعد ایک ہی مرکز سے تمام دنیا کو روشنی پہنچائی جا سکے گی، اب اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ چھوٹے چھوٹے دیے جلا کر باد حوادث سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کو دامنوں کے نیچے چھپا کر رکھا جائے جیسا کہ ہمارے بزرگوں کو کرنا پڑا تھا، بلکہ اب اگر ہم وقت سے فائدہ اٹھائیں تو ایک ایسا پاور ہاؤس تعمیر کر سکتے ہیں جو حوادث کے علی الرغم اور طوفان کے برخلاف دنیا کو اپنی روشنی سے منور رکھ سکتا ہے۔

یہ فیصلہ کن وقت ہے

مجھے امید ہے کہ ہمارے علماء اور مشائخ سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہوگی کہ اسلامی تحریک اب اس ملک میں ایک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو گئی ہے۔ اب اس ملک میں یا تو خالص اسلام رہے گا یا خالص کفر، کفر اور اسلام کی وہ ملی جلی حالت اب یہاں باقی نہیں رہے گی جو اب تک رہی ہے۔ اب ان میں سے جو کچھ بھی آئے گا، پوری شوکت اور پورے دبدبہ کے ساتھ آئے گا اور وہی حکمران بن کر رہے گا۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ آنے والا اسلام ہو اور وہی اس سرزمین پر حکمران بن کے رہے اور اس کوشش میں اگر ضرورت پڑے تو ہمیں سب کچھ قربان کر دینا چاہیے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تنظیمِ اسلامی کی قرارداد

[۱۹۶۷ء میں کچھ دوستوں نے مل کر تنظیم اسلامی کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ تنظیم اگرچہ بعض اسباب سے عملی صورت اختیار نہ کر سکی لیکن اس کا تصور اب بھی میرے ذہن میں زندہ ہے۔ اس تقریر میں اسی تصور کو میں نے پیش کیا ہے۔]

بھائیو اور دوستو!

ایک طویل مدت کے بعد ہم خیال و ہم مقصد دوستوں کی صحبت جو میسر آئی ہے تو معلوم نہیں دل کے کتنے گوشے ہیں جن کے دریچے کھل گئے ہیں اور کتنے سوئے ہوئے خیالات ہیں جو جاگ پڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ساری باتوں کو ایک صحبت میں کہہ ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ یہ تو جب بھی کہی جائیں گی مختلف قسطوں اور مختلف مجلسوں ہی میں کہی جائیں گی۔ اس وقت تو صورت حال یہ ہے کہ سرا نہیں مل رہا ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے، کیا بات کہی جائے، کیا نہ کہی جائے اور شروع کر کے بات کہاں ختم کی جائے۔ اس الجھن کی وجہ سے آپ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنی گفتگو صرف اس قرارداد کی وضاحت تک محدود رکھوں جو اپنے پورے ماله اور ماعلیہ کے ساتھ آپ کے سامنے آ چکی ہے۔

اس قرارداد کی وضاحت کرنے میں اس وجہ سے نہیں اٹھا ہوں کہ اس میں کوئی ابہام و اجمال ہے۔ یہ اپنے مقصد و مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ جس طرح میں نے اس کو

سمجھ لیا ہے اسی طرح آپ نے بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میری اس وضاحت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس میں جو نصب العین اور جو طریقۂ کار اپنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے بعض دلائل آپ کے سامنے عرض کروں تاکہ اس کی پوری اہمیت آپ کے سامنے آجائے۔

ہم نے اس قرارداد میں اللہ کا نام لے کر ایک ایسی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا ہے 'جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد کرے۔' قرارداد کا یہ جملہ دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک اس حقیقت کی طرف کہ آپ تنظیم کو بجائے خود غایت و مقصد نہیں سمجھتے بلکہ اس کو صرف دین کی عائد کردہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اپنے لیے مدد و معاون سمجھتے ہیں۔ دوسری اس بات کی طرف کہ آپ اپنا نصب العین دین کو سمجھتے ہیں اور اس دین کو اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں پر حاوی مانتے ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، وہ درحقیقت ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہی ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے، لیکن قائم ہو جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے۔ آپ کو اس خطرے سے ہر قدم پر ہوشیار رہنا ہے۔ اس چیز نے نہ صرف جماعتوں اور تنظیموں کو تباہ کیا ہے بلکہ ملتوں اور امتوں کو بھی بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اس تغیر کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ اصل مقصد غائب ہو جاتا ہے بلکہ مقصد وسیلہ اور ذریعہ کا ایک ادنیٰ خادم اور چاکر بن کے رہ جاتا ہے۔ پھر تنظیم مقصد کی خدمت نہیں کرتی بلکہ مقصد کو اپنی خدمت اور اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہے۔ مذہب کے نام پر قائم ہونے والی جماعتوں کے لیے یہ چیز خاص طور پر خطرناک ہے۔ اس لیے کہ جب اس طرح کی کوئی جماعت خود اپنے وجود اور اس کے قیام و بقا کو مقصود بنا لیتی ہے تو وہ مذہب کی بھی جن چیزوں کو اپنے اس مقصد کی راہ میں مزاحم پاتی ہے ان کو بدل کر اپنے جماعتی اغراض کے سانچہ میں ڈھال لیتی ہے۔ مذاہب کی تاریخ شہادت

دیتی ہے کہ اس چیز نے بے شمار تحریفات کی راہیں کھولی ہیں اور اس سے بڑے بڑے فتنے ظہور میں آئے ہیں۔ اس خطرے کے پیشِ نظر اس قرارداد میں اس امر کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ تنظیم بجائے خود غایت و مقصد نہ بننے پائے بلکہ وہ اصل مقصد کے وسیلہ و ذریعہ کی حد تک محدود رہے۔ قرارداد کے اس پہلو پر مجھے بہت سی باتیں کہنی ہیں جو آگے کے مراحل میں بالتدریج آپ کے سامنے آئیں گی۔ اس کے لیے لازماً اس کے تنظیمی ڈھانچہ میں ایسی حد بندیاں کرنی پڑیں گی جو اس کو بے راہ روی اور گمراہی سے محفوظ رکھیں۔

جہاں تک دوسری چیز یعنی دین ہی کو نصب العین بنانے کا تعلق ہے، یہ کم از کم ہمارے اور آپ کے لیے محتاجِ دلیل نہیں۔ ہم خدا کے فضل سے مسلمان ہیں اور ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی اصلی ترقی و فلاح مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔ مذہب کے بغیر انسان بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، جیسا کہ نظریہ ارتقاء کے قائلین کہتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ ایک حیوان ناطق جیسا کہ ارسطو نے انسان کی تعریف کی ہے۔ ہم ان دونوں میں سے کسی تعریف کو بھی انسان کی صحیح تعریف نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک انسان ایک روحِ یزدانی کا حامل ہے، جیسا کہ قرآن 'وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ' کے الفاظ سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہی روحِ یزدانی ہے جو انسان کا شرفِ خصوصی ہے اور اسی کی بدولت انسان مسجودِ ملائک بنا ہے۔ یہی روحِ ملکوتی اگر انسان کی روحِ بہیمی پر غالب رہے تو انسان حقیقی انسان ہے ورنہ وہ بس دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اس روحِ ملکوتی کے روحِ بہیمی پر غالب رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کے ارادے کی باگ خدا کی شریعت کے ہاتھ میں ہو۔ اگر انسان کا ارادہ شریعت کے ہاتھ میں نہ ہو اور اس کی عقل خدا کی وحی سے رہنمائی حاصل نہ کرے تو، جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ کپڑوں میں ملبوس ایک جانور ہے۔ یہ جانور گدھا بھی ہو سکتا ہے، کتا بھی ہو سکتا ہے اور بندر اور خنزیر اور ایک خوفناک درندہ بھی ہو سکتا ہے! چنانچہ قرآن نے شریعت سے بے قید انسانوں کو مذکورہ تمام جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہ محض برائے تشبیہ نہیں ہے بلکہ اظہارِ حقیقت ہے۔ اگر ہمارے پاس حقیقت کو دیکھ لینے والی آنکھیں ہوتیں تو ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ہمارے متمدن شہروں میں کپڑوں میں ملبوس کتنے چوپائے اور درندے انسانوں کے

بھیس میں پھر رہے ہیں اور اس صفحہ ارضی پر قوموں کی قومیں ہیں جو متمدن کہلانے کے باوجود اپنی سرشت کے اعتبار سے درندوں سے زیادہ سفاک اور خونخوار بن گئی ہیں!

ہمارے لیے شریعت کے انتخاب کا معاملہ بھی کوئی پیچیدہ معاملہ نہیں ہے۔ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام تمام دنیا کا مشترک دین ہے اور قرآن خدا کی آخری اور کامل کتاب اور محمد رسول اللہ ﷺ خدا کے آخری رسول ہیں۔ اس وجہ سے یہ عین ہمارے عقیدے کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی زندگی اسلام کے احکام و ہدایت کے تحت گزاریں اور اسی کی دعوت دوسروں کو بھی دیں۔

یہ دوسروں کو دعوت دینا بھی عین ہماری فطرت بشری کا اقتضاء اور ہماری اپنی اصلاح وترقی کا لازمہ ہے۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ انسان تنہا نہیں پایا جاتا۔ وہ ایک مدنی الطبع ہستی ہے۔ وہ کسی خاندان کے فرد، کسی قبیلہ کے رکن، کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے لیے وہ ان سب کا محتاج ہے۔ اسی بنا پر انسان کو (Social Animal) [سماجی حیوان] کہا گیا ہے۔ جس طرح مچھلی پانی سے مستغنی نہیں ہو سکتی اسی طرح انسان معاشرے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اگر انسان معاشرہ سے بے تعلق ہو کر اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر اجاگر کر سکتا تو اسلام رہبانیت کی ممانعت نہ کرتا۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نباتات میں سے (Creepers) سے مشابہ ہے۔ جس طرح انگور کی بیل صحیح طور پر اسی صورت میں پروان چڑھتی ہے جب اس کو کوئی سہارا ملے، بغیر اس سہارے کے وہ سکڑ کے رہ جاتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی صحیح طور پر اسی صورت میں پروان چڑھتا ہے جب اس کو معاشرے کا سہارا ملے، بغیر اس سہارے کے اس کی صلاحیتیں سکڑ کے رہ جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ یہ سہارا اس کے روحانی تقاضوں کے موافق ہو۔ جس طرح انگور کی بیل اس سہارے کے اثرات میں سے حصہ لیتی ہے جس پر وہ چڑھتی ہے اسی طرح انسان اس معاشرے کے خیر وشر سے متاثر ہوتا ہے جس میں وہ زندگی گزارتا ہے۔ انگور کی بیل کو نیم پر چڑھا دیجیے تو اس کے پھل کڑوے کسیلے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان اگر برے معاشرے میں زندگی گزارے تو وہ برا بن سکتا ہے۔

انسان کی اس فطرت نے اس کے لیے ایک سخت مشکل پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف تو اس کی فطرت کی رو سے یہ واجب ہے کہ وہ معاشرے سے وابستہ رہے، اس سے بے تعلق نہ ہو۔ دوسری طرف اس پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنے لیے سازگار معاشرہ تلاش کرے اور اگر معاشرہ سازگار نہ ہو تو اپنے روحانی واخلاقی تقاضوں کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ اس کو سازگار بنانے کی جدوجہد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ جدوجہد نہ کرے تو اس کی اخلاقی وروحانی موت یقینی ہے۔ اگرچہ کوئی شخص کسی دوسرے کی اصلاح پر اختیار نہیں رکھتا — دوسرے کی اصلاح اللہ کی توفیق پر منحصر ہے — لیکن ہر شخص خود اپنی اصلاح کے لیے اس جدوجہد پر اپنے امکان اور اپنی صلاحیتوں کے حد تک مامور ہے۔

اس وجہ سے ہمارے پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے اگر اس کی قدرت رکھتا ہو۔ اگر ہاتھ سے اس کی اصلاح کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے اگر اس کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر اس کی صلاحیت بھی نہ رکھتا ہو تو ادنیٰ درجہ ایمان یہ ہے کہ اس کو دل سے برا جانے — یعنی اس میں کسی نوعیت سے بھی تعاون نہ کرے — اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے!

معاشرہ سے متعلق افراد کی ذمہ داریوں کو واضح کرنے کے لیے حضور ﷺ نے معاشرہ اور افراد کو ایک کشتی کے مسافر سے تشبیہ دی ہے۔ ایک کشتی میں کچھ لوگ عرشے پر سفر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کے نیچے کے حصے میں۔ فرض کیجیے کہ نیچے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں پانی لینے کے لیے اوپر جانے کی مشقت اٹھانی پڑتی ہے، کیوں نہ ہم اپنے حصے میں کشتی کے پیندے میں سوراخ کر لیں اور اوپر والے یہ خیال کر کے کہ وہ اپنے حصہ کی کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں ان کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ سوراخ کرنے کے لیے ان کو آزاد چھوڑ دیں تو سوراخ ہو جانے کے بعد کشتی جو ڈوبے گی تو اوپر والوں اور نیچے والوں سب کو لے کر ڈوبے گی۔ یہی حال معاشرے کا ہے۔ اس میں اچھے بھی ہوتے ہیں، برے بھی ہوتے ہیں۔ اگر اچھے لوگ معاشرہ کے خیر وشر سے بے تعلق ہو جاتے ہیں تو بروں کی برائی سے جو آفت ظہور میں آتی ہے اس میں اچھے اور

برے دونوں ہی حصہ پاتے ہیں۔

حدیثوں میں ایک بستی کا ماجرا بھی بیان ہوا ہے جس سے یہ حقیقت مزید واضح ہوتی ہے۔ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کے متعلق فرشتہ کو حکم دیا کہ جا کر اس کو الٹ دو۔ فرشتہ نے عرض کی کہ باری تعالیٰ اس میں تو تیرا ایک ایسا بندہ بھی ہے جو برابر تیری عبادت میں لگا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے سمیت بستی کو الٹ دو۔ اس لیے کہ اس کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پر غیرت سے تمتمایا نہیں!

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ہمارے لیے اپنے معاشرہ کے خیر وشر سے بے تعلق رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نہ ہماری فطرت اس بے تعلقی کی روادار ہے نہ ہمارا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے۔ دوسروں کی اصلاح سے قطع نظر ہم خود اپنی اصلاح وفلاح کے لیے اس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے معاشرے کو اپنے روحانی و اخلاقی تقاضوں کے لیے سازگار بنانے کی کوشش کریں۔ اس کوشش سے دوسروں کی اصلاح ہو یا نہ ہو لیکن ہماری اصلاح ہوگی، اس سے ہماری اپنی صلاحیتیں پروان چڑھیں گی اور ہماری اپنی فطرت کے مضمرات بروئے کار آئیں گے۔ جو شخص یہ کام کرتا ہے وہ خود اپنا فرض انجام دیتا ہے اور دوسروں سے زیادہ وہ خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص یہ فرض انجام دیتا ہے تو اس کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو معاشرہ کا محسن سمجھنے لگے۔ بلکہ وہ یہ سمجھے کہ اس نے اپنا ہی فرض انجام دیا ہے۔ جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اوپر احسان کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم معاشرہ کی کسی برائی کی اصلاح کرتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ صرف اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔ دین میں دوسروں کے نیک و بد سے متعلق ہم پر جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے وہ ہمارے ذاتی فرض ہی کی حیثیت سے عائد کی گئی ہے۔

زیرِ بحث قرارداد میں یہ تصور اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے اور اس کے دو بڑے اہم فائدے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی شخص دعوت و اصلاح کا کوئی کام کرتے ہوئے یہ نہیں سمجھے گا کہ وہ کسی دوسرے کا کام کر رہا ہے بلکہ وہ یہی سمجھے گا کہ اپنا ہی کام کر رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ کوئی شخص دوسروں کی اصلاح میں اتنا مستغرق نہیں ہوگا کہ وہ خود اپنی اصلاح سے

غافل اور بے پروا ہو جائے۔ یاد رکھیے کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ دوسروں کی اصلاح کی کوشش اصلاً خود اپنی ہی اصلاح کی کوشش کا ایک حصہ ہے۔ جو شخص دوسروں کی اصلاح میں رات دن سرگرم ہے لیکن اسے خود اپنی اصلاح کی فکر نہیں ہے وہ محض نمائشی مصلح ہے۔ جو خود بھٹک رہا ہو وہ دوسروں کی رہبری نہیں کر سکتا۔ انگور کی وہ بیل سوکھ جاتی ہے جس کی اپنی جڑ اکھڑی ہوئی ہو اگرچہ اس کو کتنے ہی خوبصورت سہارے پر چڑھا دیجیے۔ اس زمانے میں چونکہ زیادہ تر مدعیانِ اصلاح ایسے ہی ہیں جنھیں خود اپنے دین و ایمان کا کچھ ہوش نہیں لیکن دوسروں میں دین کی سوغات بانٹنے کے لیے خشکی و تری کا سفر کرتے پھرتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اصل نقطہ پر لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی جائے۔ چنانچہ قرارداد میں اس حقیقت کو یوں واضح کیا گیا ہے۔

'ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔'

اس تصور کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ اس تنظیم کا ڈھانچہ ایسا بنایا جائے کہ وہ اپنے اعضاء و ارکان کی اصلاح و تربیت کا ایک جامع ادارہ بن جائے۔ اس عزم کا اظہار قرارداد میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

'لہٰذا پیشِ نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں فرد کی دینی و اخلاقی تربیت کا کماحقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقاید کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباعِ سنت سے ان کا ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حرام و حلال کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔'

ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے تنظیم کیا وسائل و ذرائع اختیار کرے گی؟ اس کا جواب دینا بروقت میرے لیے مشکل ہے۔ اس کا جواب بہت کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس تنظیم کو کن صلاحیتوں کے افراد حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنی مجموعی کوشش سے کیا اسباب و وسائل فراہم کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ افراد اور وسائل کی وسعت کے ساتھ ساتھ امکانات کا جائزہ لینا اور ان کے مطابق قدم اٹھانا تنظیم کے ارباب حل وعقد کا کام ہے۔ لیکن اتنی بات بدیہی ہے کہ اس مقصد کے بروئے کار لانے میں اس امر کی پوری کوشش کی جائے گی کہ جو قدم بھی اٹھے اسوۂ انبیاء کی روشنی میں اٹھے اور جماعت کی تربیت اس نہج پر ہو جس کی طرف کتاب وسنت میں رہنمائی کی گئی ہے!

ہم اپنی تربیت کے لیے سب سے پہلے تو صحیح علم کے محتاج ہیں۔ صحیح علم سے میری مراد دین کا علم ہے۔ اس زمانے میں دین کا علم عنقا ہو رہا ہے۔ اس کے حصول کے وسائل و ذرائع بھی روز بروز کم سے کمتر ہوتے جا رہے ہیں اور لوگوں کے اندر اس کی رغبت بھی بالکل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر دین کا علم ہی مٹ گیا تو پھر دین کے باقی رہنے کا کیا امکان ہے! یہ امر بھی بدیہی ہے کہ اس زمانے میں دین کا روایتی علم بالکل غیر مفید ہے۔ یہ زمانہ عقلیت کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں لوگ ہر چیز کی دلیل و حجت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مجرد یہ بات لوگوں کو اپیل نہیں کرتی کہ فلاں بات دین کی بات ہے۔ دین پر آج جو اعتراضات ہو رہے ہیں وہ کل کے اعتراضات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ اعتراضات جدید مغربی فکر و فلسفہ کی پیداوار ہیں اور ان کو نہایت زور و قوت کے ساتھ پھیلانے والے خود ہمارے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ جب تک ان اعتراضات و شبہات کا موثر ازالہ نہ ہو اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ آپ دین کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔ افسوس ہے کہ اس خدمت کی صلاحیت رکھنے والے آج ہمارے اندر اگر مفقود نہیں تو اتنے کم ہیں کہ وہ دین کے محاذ کو کسی طرح بھی سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے حاملانِ دین پیدا کرنے کی مؤثر جدوجہد کی جائے جو جدید علوم وافکار سے بھی کماحقہٗ آگاہ

ہوں اور کتاب وسنت کے دلائل و براہین پر بھی وہ براہ راست نظر رکھتے ہوں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہمارا دین دنیا میں بے دلیل نہیں آیا ہے۔ وہ بہتر سے بہتر فطری و عقلی دلائل سے مسلح ہو کر آیا ہے جو ہر دور کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ بشرطیکہ ان کو اجاگر کرنے والے اور ان کو دنیا کے سامنے حالات کے مطابق پیش کرنے والے موجود ہوں۔

دوستو! یہ کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس قسم کے افراد صرف اردو میں لکھی ہوئی چند کتابیں پڑھ لینے سے نہیں پیدا ہوں گے بلکہ اس کے لیے کتاب وسنت اور علومِ اسلامیہ سے براہ راست گہری واقفیت ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی صلاحیت ہم میں سے ہر شخص اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتا۔ لیکن معتد بہ تعداد ہمارے اندر جب تک ایسے لوگوں کی نہ ہو گی ہم ان ذمہ داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے جو دین سے متعلق اس زمانے میں ہم پر عائد ہوتی ہیں۔

جہاں تک عامۃ المسلمین کو دین کی دعوت دینے کا تعلق ہے اس کے بارے میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اس زمانے میں مجرد تذکیر کافی نہیں ہے بلکہ وسیع پیمانے پر تعلیم و تفہیم کی ضرورت ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ لوگ دین کی باتیں بھولے ہوئے ہیں، اگر انہیں یاد دلا دی جائیں تو وہ ان کو اختیار کر لیں گے۔ بلکہ اشاعتِ باطل کے وسیع ذرائع نے اس زمانے میں عام اذہان کے اندر بھی دین اور دینی احکام سے متعلق بے شمار غلط فہمیاں بھر دی ہیں جن کو دور کرنے کا سامان کرنا ان لوگوں پر واجب ہے جو آج ملک کے عوام کی اس پہلو سے کوئی خدمت کرنا چاہتے ہوں۔ آج اخبارات گھر گھر پہنچ رہے ہیں، ریڈیو کھیتوں اور کھلیانوں تک میں موجود ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ زندگی کے جدید شیطانی نظریات سے ہمارے عوام بے خبر ہیں یا وہ ان سے بالکل بے تعلق ہیں۔ ان سے تاثر کے معاملے میں شہری اور دیہاتی آبادی میں کچھ فرق ہونا تو ایک قدرتی امر ہے لیکن دیہاتی آبادی کو ان فتنوں سے بالکل الگ تھلگ خیال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کے

اندر کام کرنے کے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو موجودہ حالات میں ان کے لیے مؤثر اور مفید ہوں۔

جہاں تک ملک کے ارباب اقتدار کا تعلق ہے، ان کے بارے میں بھی ہمارے ہاں سخت افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو ان کی اصلاح کے معاملے میں بالکل بے تعلق ہیں۔ انہیں ان کے خیر و شر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ان کے شر کو بھی خیر ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو ان کے خیر کو بھی شر قرار دیتے ہیں اور ہر حالت میں ان کی مخالفت کرنا ان کے ہاں جزو ایمان ہے۔

آپ کی یہ قرارداد ان تینوں طریقوں کو غلط قرار دیتی ہے اور دین کی روشنی میں ایک چوتھا طریقہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔

جہاں تک پہلے طریقے یعنی لاتعلقی کے رویہ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کوئی پرایا جھگڑا نہیں ہے جس سے علیحدہ رہنے میں آدمی کے لیے سعادت ہو بلکہ یہ ہم میں سے ہر شخص کے اپنے دین و ایمان کا معاملہ ہے۔ میں پیغمبر ﷺ کی واضح تعلیمات کی روشنی میں بتا چکا ہوں کہ جو شخص معاشرہ کے خیر و شر سے بے پروا ہے وہ خود اپنے دین و ایمان سے بے پروا ہے اور اس کی یہ بے پروائی اس کی ساری دینداری کو غارت کر کے رکھ دے گی۔ ہم جس کشتی پر سوار ہیں، اپنے امکان کے حد تک، کسی کو اس کے پیندے میں سوراخ کرتے ایک تماشائی کی طرح نہیں دیکھ سکتے!

دوسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ جو چیز غلط ہے اگر وہ ارباب اقتدار کی طرف سے ظہور میں آئے تو اس کی غلطی اور بھی سنگین ہو جاتی ہے، اس لیے کہ اس کے یہ اثرات بہت دور رس ہوں گے۔ اگر کوئی شخص اس غلطی کو ثواب قرار دے تو یہ اس پر خاموش رہنے سے بھی بڑا جرم ہے۔ یہ رویہ اگر خوف یا طمع کی بنا پر اختیار کیا جائے تو یہ

اسلام میں صریح نفاق ہے جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ اور اگر یہ اس بنیاد پر اختیار کیا جائے کہ اس سے حکومت کو ضعف پہنچتا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ اول تو حکومت کو ضعف پہنچ سکتا ہے تو غلط چیز سے نہ کہ صحیح چیز سے ثانیاً حکومت بجائے خود مقصد و غایت نہیں ہے بلکہ اسلام میں وہ اللہ کے قانونِ عدل و قسط کا ذریعہ ہے۔ اس وجہ سے حکومت کی مصلحت کے لیے بھی کسی شر کو خیر قرار دینا اپنے دین و ایمان پر کلہاڑی مارنا ہے۔

تیسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ ارباب اقتدار کی ہر بات کو ہدف تنقید بنا لینا یہاں تک کہ ان کے خیر کو بھی شر قرار دینا اور اس مخالفت میں اس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی برائیاں بھی ان کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رو سے جائز ہے نہ اسلام کی رو سے! یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحیح بات بھی ارباب اقتدار کو اپیل نہیں کرتی۔ جن لوگوں کی ذہنیت یہ بن جاتی ہے، وہ خیر خواہی کے جذبے سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں درآنحالیکہ یہ جذبہ دعوت دین کی اصل روح ہے۔ اگر انسان خیر خواہی کے جذبے سے خالی ہو تو اس کی ہر بات نفرت اور عناد کی تخم ریزی کرتی ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ دین کا نام لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں ایک نفرت انگیز چیز بنانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں دین کو جو نقصان پہنچا ہے وہ دین کے کھلے ہوئے دشمنوں کے ہاتھوں بھی نہیں پہنچا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی ایک نفسانی جنگ میں دین کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس طرح بلاوجہ دین کو ان تمام لوگوں کے سامنے ایک حریف بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں جن سے ان کی لڑائی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ انسانیت اور خلق کی محبت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ ملک میں زلزلے آئیں، قحط پڑے، سیلاب آئیں اور وبائیں پھیلیں تاکہ یہ ان سب چیزوں کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا کر اپنے اقتدار کے لیے راہ ہموار کریں۔ ایسے بے درد اور سنگدل لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ یہ دین کی کوئی

خدمت انجام دے سکیں گے محض خام خیالی ہے۔

آپ نے جو قرارداد پاس کی ہے، اس میں آپ نے ان تمام طریقوں سے الگ اپنے لیے 'الدین النصیحۃ' کی راہ اختیار کی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کے خیر وشر سے بے تعلق نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ یہ خیر خواہی کے خلاف ہے۔ اسی طرح آپ کسی کے شر کو خیر بھی نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ یہ بھی حق اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ علیٰ ہذالقیاس آپ کسی کی مخالفت کے جوش میں اس کی نیکی کو بدی نہیں ٹھہرا سکتے اس لیے کہ یہ سچائی اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ دین کو ہوسِ اقتدار کی جنگ میں ایک ہتھیار کے طور پر کبھی استعمال نہیں کریں گے بلکہ جس کے سامنے بھی اس کو پیش کریں گے اللہ کے دین کی حیثیت سے پیش کریں گے کہ اسی میں اس کی بھی بھلائی ہے اور اسی میں آپ کی بھی بھلائی ہے۔ یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے اور یہی آپ کو اختیار کرنا ہے۔

رفیقو! میں سمجھتا ہوں کہ ایک واضح چیز کی وضاحت کرنے میں آپ کا بہت سا وقت میں نے لیا۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور اپنے لیے اور آپ کے لیے دعا کرتا ہوں کہ ہم نے جو کچھ طے کیا ہے اس پر ہم عمل کرنے کی توفیق پائیں۔

اقول قولی هذا و استغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین و المسلمات!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۷ء)

مقالہ ۳۲

تنظیمِ اسلامی کے لیے ہدایات

[تنظیم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق رائے ہو جانے کے بعد ارکان کے اجتماع میں یہ تقریر کی گئی۔]

عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم وہمت عطا فرمائے اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے۔ میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند کہ اس کی ضرورت اور اہمیت مجھ پر واضح تھی لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں۔ کوئی بھاری بوجھ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے اس آخری دور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا اب وقت وفرصت کا لمحہ لمحہ اس پر صرف کرنا چاہتا تھا۔[1] چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لیے پہل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے ان کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس

۱۔ مراد تفسیر تدبر قرآن کی تحریر وتسوید ہے۔

کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے۔ جس کے سبب سے نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا۔ جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہرحال اب میں پورے شرح صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور ان تمام دوستوں کا دل سے شکرگزار ہوں جنہوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے!

میرے ذمہ اس وقت آپ تمام شرکائے مجلس کو بعض ضروری ہدایت دینے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ یہ ہدایات ان کاموں سے متعلق ہیں جو آپ کو یہاں سے رخصت ہونے کے بعد کرنے ہیں۔ براہ کرم ان کو نوٹ کر لیجیے۔

جماعتی تنظیم سے متعلق اس وقت آپ کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ تنظیم کے نظام و دستور سے متعلق آپ کے سامنے جو تجویزیں ہیں وہ مقامی رفقاء سے مشورہ کے بعد قلم بند کر کے شیخ سلطان احمد صاحب کے پاس بھیج دیجیے تاکہ مجلسِ مشاورت ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ حتی الوسع اس بات کی کوشش کیجیے کہ تجاویز کے بارے میں اگر اختلاف رائے ہو تو وہ غور و بحث سے مقامی رفقاء ہی کے اندر طے ہو جائے تاکہ آگے کا کام آسان ہو جائے۔ اگر غور و بحث کے بعد بھی کسی امر میں اختلاف باقی رہ جائے تو اس کو نوٹ کر دیا جائے۔

اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح و تربیت سے متعلق جو کام آپ کو کرنے ہیں ان کے بارے میں مفصل ہدایات تو افرادی قوت کا جائزہ لینے کے بعد ہی دی جا سکیں گی لیکن چند کام ایسے ابتدائی اور بدیہی نوعیت کے ہیں کہ ان کا اہتمام بلا تاخیر آپ کو کرنا چاہیے۔

پہلا کام نماز کا اہتمام ہے۔ نماز ہمارے دین میں ایمان کا اولین تقاضا ہے۔ قرآن و حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اسلامی تنظیم کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوئی ہے اور انبیاء علیہم السلام نے اصلاح و تربیت کا پہلا قدم اسی سے اٹھایا ہے۔ آپ بھی اس کی پابندی کے لیے مضبوط عہد کیجیے اور اپنے عزیزوں، قریبوں، دوستوں، پڑوسیوں اور محلہ والوں کو بھی دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کی تلقین کیجیے۔ نماز کے اہتمام میں یہ بات بھی داخل ہے کہ حتی الوسع محلہ کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کیجیے۔ بغیر کسی عذر معقول کے اس میں کوتاہی نہ کیجیے اور دوسروں کو بھی نماز باجماعت کی عظمت و اہمیت سمجھانے کی کوشش کیجیے۔

دوسرا کام یہ ہے کہ اپنے دینی علم میں اضافہ کا اہتمام کیجیے۔ جن مقامات پر یہ ممکن ہو کہ کسی ذی علم کی رہنمائی میں قرآن مجید کا اجتماعی مطالعہ کیا جا سکے وہاں حلقہ تدبر قرآن قائم کیجیے اور ہفتہ میں کم از کم ایک دن اس کام کے لیے خاص کیجیے کہ کچھ وقت قرآن کے فکر و مطالعہ میں بسر ہو۔ اس کے ساتھ اگر حدیث کی ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جائے جو اخلاقی احادیث پر مشتمل ہیں، مثلاً ریاض الصالحین وغیرہ تو اس سے مزید خیر و برکت ہوگی۔ اگر کسی ذی علم کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو عام حلقہ مطالعہ اسلامی قائم کیجیے اور منتخب اسلامی کتب کا التزام سے مطالعہ کیجیے۔ اس قسم کے حلقوں میں اپنے ان دینی بھائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دیجیے جن کے اندر آپ دین اور علم دین کی رغبت محسوس کریں۔

آپ لوگوں میں سے جن لوگوں نے جدید تعلیم پائی ہو ان کو میں یہ مشورہ بھی دوں گا کہ وہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں تاکہ وہ قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ کر سکیں۔ بظاہر یہ کام مشکل نظر آتا ہے لیکن شوق اور طلب سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے شہروں میں جس عالم سے بھی اس کام میں آپ کو مدد ملنے کی توقع ہو اس سے استفادہ کیجیے۔ ہم خود بھی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس مسئلہ پر غور کریں گے کہ آسان طریقہ سے آپ کو عربی زبان سکھانے کی کیا شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔ لاہور میں اس

سلسلہ میں ہم نے جو تجربے کیے ہیں ہم ان سے بھی آپ کو آگاہ کریں گے تاکہ جن مقامات پر اس نہج پر درس جاری ہو سکے وہاں اس نہج پر درس جاری کیے جائیں۔

تیسرا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے مقامات پر اپنے ہم خیال اور رفیق تلاش کیجیے جن کے تعاون سے پیشِ نظر مقصد کو تقویت حاصل ہو۔ جو اس جدوجہد میں آپ کے لیے سہارا بن سکیں اور جن کے لیے آپ سہارا بن سکیں۔ جو آپ کی اصلاح کریں اور جن کی آپ اصلاح کریں۔ جماعتی زندگی کی یہی خیر و برکت ہے جو انفرادی زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ یہ زمانہ بہت برا ہے لیکن اس برے زمانے میں بھی اچھی روحیں اور نیک نفوس موجود ہیں۔ ضرورت ٹٹولنے اور جستجو کی ہے۔ جب آپ جستجو کریں گے تو اللہ کے بے شمار بندے ایسے مل جائیں گے جو آپ کی رفاقت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کتنے نفوس ہوتے ہیں جن کے اندر دینی حس موجود ہوتی ہے! لیکن کوئی اس کو اکسانے والا نہیں ہوتا اس وجہ سے وہ دبی ہوئی رہتی ہے۔ آپ ایسے نفوس تلاش کیجیے، ان تک پہنچیے ان سے تبادلہ خیالات کیجیے اور اس کام میں ان کو تعاون کی دعوت دیجیے۔

آپ کی اجتماعی طاقت جتنی ہی بڑھتی جائے گی اتنی ہی ان کاموں کی انجام دہی آپ کے لیے آسان ہوتی جائے گی، جو افراد اور معاشرہ کی اصلاح سے متعلق آپ پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

یہ چند ابتدائی کام ہیں جو اس قرارداد کی روشنی میں، جو آپ نے پاس کی ہے، فی الفور شروع کیے جاسکتے ہیں۔ آگے اللہ تعالیٰ مزید کاموں کی راہیں کھولے گا اگر ہمارے اندر اس کے دین کی خدمت کے لیے اخلاص ہوگا۔ اب دعا کیجیے کہ ہمیں اس کام کے لیے سچا عزم حاصل ہو اور ہر قدم پر توفیقِ الٰہی ہماری رہنمائی فرمائے۔ آمین!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۷ء)

مسلمان نوجوانوں کے فرائض

[ایک تقریر جو 1967ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں اساتذہ، طلبہ اور طالبات کے سامنے کی گئی۔]

حضرات اساتذہ اور عزیز طلبہ و طالبات!

میں آپ کی اس ذرہ نوازی کے لیے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی اس علمی مجلس میں مجھے تقریر کی دعوت دی۔ میں نے آپ کے نمائندوں سے معذرت کر دی تھی کہ میں کوئی تقریر تو نہیں کروں گا البتہ آپ کے تجویز کردہ عنوان پر کچھ متفرق باتیں طلبہ و طالبات کے سامنے عرض کر دوں گا۔ تقریر کا معاملہ یہ ہے کہ نوجوانی میں تو آدمی تقریر شوقیہ کرتا ہے، ادھیڑ پن میں فرائض اور ذمہ داریوں کے تحت یہ کام کرنا پڑتا ہے لیکن بڑھاپے میں آ کر یہ چیز بوجھ بن جاتی ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ میں جوانی میں بھی اس ذمہ داری سے گھبراتا رہا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب اس دور میں میرے لیے یہ کام کتنا مشکل بن گیا ہوگا۔

بہرحال آپ کے دل رکھنے کے لیے کچھ باتیں کہوں گا، آپ ان کو نصیحت کے طور پر لیجیے۔ میں اگرچہ اپنے آپ کو نصیحت و موعظت کا اہل نہیں سمجھتا لیکن آدمی کو بعض حقوق مجرد اس بنیاد پر حاصل ہو جاتے ہیں کہ اس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ مجھے بھی 'بزرگی

بعقل است' والی بزرگی چاہے حاصل نہ ہوئی ہو لیکن 'بزرگی بسال' والی بزرگی تو بہرحال حاصل ہے۔

نصیحت و حکمت کا معاملہ یہ ہے کہ اگر سننے والوں کے دل نصیحت پذیر ہوں تو اس بات سے کچھ زیادہ فرق پیدا نہیں ہوتا کہ خود نصیحت کرنے والا واعظ بے عمل ہے یا نا صح باعمل۔ سعدی کی وہ حکایت شاید آپ کو یاد ہو کہ 'از لقمان پرسیدند کہ حکمت از کہ آموختی؟ گفت: از ناداناں!' لقمان سے پوچھا گیا کہ آپ نے حکمت کس سے سیکھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ نادانوں سے۔ میں یہی توقع آپ سے رکھتا ہوں۔

نوجوانوں کے فرائض سے متعلق مجھے آپ کے سامنے کوئی نئی بات نہیں کہنی ہے۔ میں بھی وہی بات کہوں گا جو بہتوں کی زبانی آپ نے سنی ہوگی۔ بعض باتیں بڑی اہم اور بڑے نکتے کی ہوتی ہیں لیکن وہ ہر مجلس میں بار بار دہرائے جانے کے سبب سے بالکل پامال اور فرسودہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ اس وجہ سے سننے والے ان کو کماحقہٗ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ صورتِ حال بڑی افسوس ناک ہے۔ اس طرح ہماری زندگی کے بہت سے بنیادی حقائق نے اپنی اصلی معنویت بالکل کھو دی ہے۔ لیکن حضرات حقیقت بہرحال حقیقت ہے، اس کو اس کی اصلی قدر و قیمت سے اس لیے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو بہتوں نے بیان کیا ہے یا بہت سے بیان کرنے والوں نے محض رسماً بیان کیا ہے۔

میرے نزدیک انہی مظلوم حقیقتوں میں سے یہ حقیقت بھی ہے کہ ہر قوم کے مستقبل کا انحصار اس کے نوجوانوں پر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی عظیم سچائیوں میں سے ایک عظیم سچائی ہے۔ خواہ ہم اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ قومیں اپنے رقبوں، اپنی عمارتوں، اپنے باغوں اور چمنوں، اپنے دریاؤں اور پہاڑوں سے باقی نہیں رہتی ہیں بلکہ اپنی آئندہ نسلوں اور اپنے نوجوانوں سے باقی رہتی ہیں۔ نوجوان اچھے ہوں تو قوم زندہ رہے گی۔ اگر اس کے پاس دریا اور پہاڑ نہ ہوں گے تو وہ اپنے لیے نئے دریا اور نئے

پہاڑ پیدا کر لے گی۔ برعکس اس کے نوجوان مردہ ہوں تو اشبیلیہ، غرناطہ اور قرطبہ کی عظمتیں تعمیر کرنے والے بھی صرف تاریخ کی ایک داستانِ عبرت بن کے رہ جاتے ہیں!

یہی نکتہ ہے کہ دنیا کی ہر زندہ رہنے والی قوم نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت کو دی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں کو یہ بات عزیز ہوتی ہے کہ صفحۂ عالم میں ان کا مادی وجود بھی قائم رہے اور ان کی معنوی ہستی بھی کارفرما رہے، انہوں نے اپنے بام و در کی آرائش کے بجائے اپنے آگے آنے والے اخلاف کی تہذیب و تربیت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم نہیں ہوں لیکن سپارٹا کے لوگوں سے لے کر آج تک قابلِ ذکر قوموں کے جو حالات سرسری طور پر معلوم ہوئے ہیں، ان کی بنا پر یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ رومی و یونانی ہوں یا انگریز و امریکن، دنیا کے نقشے پر کوئی پائدار نقش اسی قوم نے چھوڑا ہے جس نے اپنے آنے والی نسل کی فکر کی ہے۔ سپارٹا والوں کے متعلق میں نے کہیں پڑھا ہے کہ وہ اپنی عمارتوں میں کوئی تراشا ہوا پتھر لگانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ عمارتوں میں تراشے ہوئے پتھر لگانا قوم کے اندر تن آسانی اور تعیش پسندی کے رجحان کی دلیل ہے۔ اسی طرح اپنی آئندہ نسلوں کی صحت مندی کے معاملے میں میں نے سنا ہے کہ وہ اس قدر حساس تھے کہ اس کے لیے انہوں نے بعض ظالمانہ طریقے بھی اختیار کر لیے تھے، مثلاً یہ کہ وہ کمزور بچوں کو سرے سے زندہ ہی نہیں رہنے دیتے تھے۔

ہمارے ہاں، یعنی اسلام میں، اولاد کی اصلاح و تربیت کا جو اہتمام رہا ہے اس کے لیے دوسری چیزوں سے قطعِ نظر کر کے اگر صرف قرآن ہی پر نظر ڈالیے تو اس کی اہمیت واضح کر دینے کے لیے وہ کافی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی وصیت اپنی اولاد کو، حضرت اسحٰقؑ و حضرت یعقوبؑ کی وصیت و نصیحت اپنی ذریت کو، حضرت لقمانؑ کی تلقین اپنے بیٹے کو۔ یہ ساری سرگزشتیں اسی لیے بیان ہوئی ہیں کہ ہم ان سے یہ سبق حاصل کریں کہ اچھے اسلاف کے نام اور کام اچھے اخلاف ہی سے باقی رہتے ہیں۔ حضرت نوحؑ کی سرگزشت پڑھیے تو

دل تڑپ تڑپ جاتا ہے کہ ان کو اپنے بیٹے کی نااہلی کا کتنا غم تھا اور انہوں نے اصلاح و تربیت کے لیے کیا کیا زحمتیں اٹھائیں اور کس کس طرح اپنے رب کے آگے آہ و فغاں کی۔

حضرات! یہ چیز بالکل فطرت انسانی ہے۔ افراد ہوں یا قومیں ان کا مادی اور معنوی وجود ان کے اخلاف ہی کے واسطے سے باقی رہتا ہے اور اس بقا کی خواہش ایک امر فطری ہے۔ جس قوم کے اندر یہ خواہش مردہ ہو جاتی ہے یا اس کے لیے جو اہتمام مطلوب ہے وہ اس کے اندر باقی نہیں رہتا تو وہ قوم دنیا کے نقشے سے مٹ جاتی ہے۔

اس وجہ سے مبارک ہے وہ قوم جس کے ذمہ دار اجتماعی بقا کے اس رمز سے آشنا ہیں اور وہ آنے والی نسل کو اس عظیم ذمہ داریوں کے لیے تیار کر رہے ہیں جو ان کے کندھوں پر آنے والی ہیں۔ لیکن عزیز طلبہ اور طالبات! میں یہاں اجتماعیات کے ایک اور رمز سے بھی آپ کو آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ مستقبل کی ذمہ داریاں بہرحال آپ کے کندھوں پر آنے والی ہیں اور مستقبل آپ کو اپنے باٹ اور اپنی ترازو سے تولے گا۔ وہ اس معاملے میں کسی رو رعایت اور کسی عذر و معذرت کے قبول کرنے کا روادار نہ ہوگا۔ اگر آپ اپنی ذمہ داریوں کے لیے نااہل ثابت ہوں گے تو وہ اس بنا پر آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا کہ آپ کے پچھلوں نے آپ کے معاملے میں اپنی ذمہ داریاں کما حقہٗ ادا نہیں کیں۔ انہوں نے ادا کیں یا نہیں کیں؟ یہ سوال خارج از بحث ہو جائے گا۔ کسوٹی پر آپ ہوں گے نہ کہ ہم! فیصلہ آپ کی اہلیت و نااہلیت کا ہوگا نہ کہ ہماری! جوابدہ آپ ہوں گے نہ کہ آج کے لوگ! اگر آپ نااہل ثابت ہوں گے تو زمانہ آپ کے خلاف بے لاگ فیصلہ سنا دے گا اور دنیا کے نقشے سے آپ کا وجود مٹ جائے گا:

تِلْكَ أُمَّةٌ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ.

اگر آپ یہ محسوس بھی کرتے ہیں کہ آج آپ کے ذمہ دار آپ کے حق کو صحیح طور پر نہیں ادا کر رہے ہیں جب بھی آپ اپنے فرض کو پہچاننے کی کوشش کریں اور مستقبل میں

اپنے بل بوتے پر اپنی بازی جیتنے کی تیاریاں کریں۔ لائق اولاد باپ کی کمزوریوں کو اپنی کمزوریوں کے لیے عذر نہیں بناتی بلکہ اپنی محنت و قابلیت سے اپنا نام بھی روشن کرتی ہے اور باپ کا نام بھی۔

عزیز طلبہ و طالبات! اگر آپ میرا نقطہ نظر اچھی طرح سمجھ گئے ہیں تو اب میں آگے بڑھتا ہوں اور یہ عرض کرتا ہوں کہ قوم کی خلافت و وراثت سنبھالنے کے لیے آپ کا مقدم فرض یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو ہر اعتبار سے صحت مند اور تندرست نسل بنانے کی کوشش کریں۔ ہر اعتبار سے صحت مند اور تندرست بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جسمانی، عقلی اور ایمانی و اخلاقی تینوں ہی اعتبارات سے! جب تک ان تینوں ہی اعتبارات سے ہمارے نوجوان تندرست نہ ہوں اس وقت تک نوجوانوں کے اندر قوت پیدا نہیں ہو سکتی اور جب تک ان کے اندر قوت نہ پیدا ہو اس وقت تک وہ اس ملت کی خلافت و وراثت کے حامل ہونے کے اہل نہیں ہو سکتے جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی قوموں کی امامت کے منصب پر مامور فرمایا ہے۔ اب میں بالاختصار صحت کے ان تینوں پہلوؤں پر کچھ باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔

صحت جسمانی

جسمانی صحت کی اہمیت میرے نزدیک اس پہلو سے نہیں ہے کہ آپ کوئی بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے والے پہلوان یا گھونسہ باز بن جائیں۔ میں سانڈ اور کٹے کی صحت پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں بلکہ انسان کی صحت پر گفتگو کر رہا ہوں۔ انسان کے لیے صحتِ جسمانی کی اہمیت اس پہلو سے ہے کہ یہ چیز عقلی اور اخلاقی صحت کے لیے بمنزلہ بنیاد ہے۔ عقل کے نشوونما اور اعلیٰ ایمانی اور اخلاقی تقاضے پورے کرنے کے لیے جسمانی صحت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کمزور، مریض اور ناتواں جسم کے اندر عقل بھی مریض و ناتواں ہوتی ہے اور ضعیف الاعضاء اور ضعیف القویٰ لوگ ایمانی و اخلاقی تقاضے بھی پورے کرنے میں ضعیف

ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ لازم نہیں کہ جس کا جسم تندرست ہو اس کی عقل اور اس کا اخلاق بھی تندرست ہو۔ بہت سے لوگ جسما بڑے تندرست ہوتے ہیں لیکن عقلی اور اخلاقی اعتبار سے بالکل احمق اور سفلہ ہوتے ہیں۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ عقلی واخلاقی تندرستی کے لیے جسمانی تندرستی بھی ضروری ہے۔

میں کوئی طبیب یا ڈاکٹر نہیں ہوں۔ اور نہ میرے پیش نظر اس وقت صحت کے لوازم وشرائط پر کوئی خطبہ دینا ہے۔ میں ایک عام آدمی کی حیثیت سے جانتا ہوں کہ جسمانی صحت کے لیے چند چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کا اہتمام حتی الامکان ہر شخص کے لیے ضروری ہے:

۱) سادہ اور ستھری غذا۔

۲) تازہ اور صاف ہوا۔

۳) محنت اور ورزش۔

۴) ضبطِ نفس۔

جہاں تک سادہ اور ستھری غذا کا تعلق ہے، اس کا اہتمام اگر آپ کے لیے بہت آسان نہیں تو زیادہ مشکل بھی نہیں ہے بشرطیکہ آپ غذائیات کے متعلق کچھ علم اور تجربہ حاصل کرلیں اور اس کے لیے کچھ زحمت اٹھانے اور کچھ اہتمام رکھنے کی اپنے اندر عادت پیدا کرلیں۔ آپ اس بات سے واقف ہوں گے کہ صحت کے لیے نہ بہت قیمتی غذا کی ضرورت ہے، نہ اس کے لیے تنوعات اور چٹخاروں کی احتیاج ہے۔ اگر آپ غیر ضروری اور مضرِ صحت چیزوں کا استعمال ترک کردیں اور چٹخاروں کے درپے نہ ہوں تو آپ میں سے ہر شخص اگر نہیں تو اکثر لوگ بآسانی اپنے لیے صاف ستھری غذا کا اہتمام کرسکتے ہیں اور اگر آپ سادہ غذا اور سادہ لباس کو جماعتی حیثیت سے اختیار کرنے کا اپنے اندر ولولہ

پیدا کریں تو آپ اس کو فیشن کی حیثیت بھی دے سکتے ہیں اور اس سے ہر شخص کی مشکل آسان ہوسکتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم کھانا تو مغلوں کے دورِ زوال کا پسند کرتے ہیں اور لباس انگریزوں اور فرانسیسیوں کے دورِ زوال کا! ہماری یہ زوال پسندی ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ آپ لوگوں نے تو تاریخ پڑھی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ مغلوں نے ایوانِ نعمت کے یہ دسترخوان جس وقت بچھائے ہیں یہ تاریخ کا وہ منحوس دور ہے جب انہیں دلی کا لال قلعہ انگریزوں کے لیے خالی کردینا پڑا۔ اس دسترخوان کے ساتھ ان کی حکومت کی بساط بھی الٹ گئی۔ جس دور میں انہوں نے یہ تمام ممالک فتح کیے ہیں اس دور میں وہ ان لذات سے ناآشنا تھے۔ اس زمانے میں تو ان کے نوجوانوں کا یہ حال تھا کہ وہ خشک گوشت کے ٹکڑے اپنے گھوڑے کی زین کے نیچے رکھ لیتے۔ جب وہ گھوڑے کے پسینے سے کچھ نرم ہوجاتے تو جہاں بھوک لگتی اس کو چاب لیتے۔ اس غذا نے ان کے اندر یہ طاقت پیدا کی کہ جدھر کا انہوں نے رخ کیا ادھر کی دنیا الٹ دی۔ کم و بیش یہی حال انگریزوں کا بھی رہا ہے۔ جس دور میں انہوں نے تمام دنیا کو زیرنگیں کیا ہے ان کے نوجوانوں کی سخت جانی وسخت کوشی مثالی رہی ہے۔ یہ دور تو ان کے زوال کا دور ہے اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اس کو ان کی ترقی کا دور سمجھتے ہیں۔

صاف ستھری ہوا کے لیے آپ صبح خیزی کی عادت پیدا کیجیے۔ صبح خیزی کی عادت ہمیشہ سے بیدار بخت لوگوں کی عادت رہی ہے۔ آپ کو علامہ اقبالؒ کا وہ شعر یاد ہوگا جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ جس سحر سے شبستانِ وجود لرزتا ہے وہ طلوعِ آفتاب سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ مومن کی اذان سے پیدا ہوتی ہے! اس اذان سے دنیا کو آپ ہی نے آشنا کیا، لیکن اب آپ خود اس کی لذتوں سے ناآشنا ہوگئے۔ سویرے اٹھیے، دوسروں کو خوابِ غفلت سے جگائیے۔ خالقِ کائنات کی بندگی کیجیے۔ اور پھر کھلے میدانوں اور چمنستانوں میں، جن کی آپ کے اس شہر میں کمی نہیں ہے، سیر کیجیے اور تازہ ہوا کا لطف اٹھائیے!

ورزش اور محنت کا مقصود اپنے آپ کو سخت کوش اور سخت جان بنانا ہے تاکہ آپ

چاق و چوبند رہیں، سردی اور گرمی کو برداشت کر سکیں، بھوک اور پیاس کا مقابلہ کر سکیں اور وقت پڑنے پر سخت سے سخت مشقت جھیل سکیں۔ بہترین ورزش وہ ہے جو آدمی کو میدانِ جنگ کی سختیوں کے لیے تیار کرے۔ ہمارے اسلاف میں اسی قسم کی ورزش کا ذوق و شوق تھا۔ آپ بھی اپنے اندر اس کا شوق پیدا کیجیے۔ نزاکت عورتوں کے لیے حسن ہے لیکن نوجوانوں کے لیے اس سے بڑا کوئی عیب نہیں!

ضبطِ نفس، صحت کے نہایت اہم لوازم میں سے ہے۔ جب تک آپ اپنی خواہشات، اپنے جذبات اور اپنی شہوات پر کنٹرول کرنا نہیں سیکھیں گے اس وقت تک ان تمام تدبیروں کے باوجود بھی، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، آپ حقیقی صحت نہیں حاصل کر سکیں گے۔ اس زمانے میں ایسے نوجوان بہت کم نظر آتے ہیں جن کے چہروں پر فتوت کا جمال نظر آتا ہو۔ معاف کیجیے گا میں آپ پر کوئی طعن نہیں کر رہا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں نوجوانوں کو دیکھیے تو عام طور پر چہرے کملائے ہوئے اور آنکھیں دھنسی ہوئی، رنگ اڑے ہوئے، گال پچکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں غذا خالص نہیں مل رہی ہے بلکہ اس میں بڑا دخل ہے نگاہ کی آوارگی، دل کی ہرزہ گری اور جذبات و خواہشات کی بے راہ روی کو اور یہ چیزیں وہ ہیں جو نہ صرف غارت گرِ اخلاق و دین و ایمان ہیں بلکہ غارت گرِ حسن و صحت بھی ہیں۔ آپ اگر اپنے جذبات و خواہشات کو ضبط میں رکھنا سیکھ جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ نانِ جویں کھا کر بھی آپ کے چہروں پر اس جمالِ فتوت کا عکس نظر آئے گا جو علی مرتضیٰؓ کے چہرے پر تھا!

حضرات! میں جس جمال کا ذکر کر رہا ہوں اس کا تعلق جسم کی جلد اور اس کے رنگ و روغن سے نہیں ہے بلکہ اس کا منبع باطن کی صحت ہے۔ جس کے باطن میں صحت ہوتی ہے وہ ضابطِ نفس ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کے لیے 'حصور' کا لفظ آیا ہے۔ اس صفت کے مدارج و مراتب ہیں، لیکن باطن میں یہ نور اسی صفت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نور حضرت مریمؑ اور حضرت یحییٰؑ کی وراثت ہے۔ جس کے اندر اس نور کی کوئی جھلک ہوگی اس کی چمک

اس کی پیشانی کے افق پر نظر آئے گی اور خوش قسمت ہے وہ نوجوان جو اس جمالِ یوسفی میں سے کوئی حصہ پائے۔ جن پیشانیوں پر اس جمال کی کوئی کرن ہوتی ہے اگر ان کا رنگ کالا بھی ہو تو وہ رشکِ آفتاب و ماہتاب ہوتی ہیں۔

حضرات! اصلی روحانی طاقت کا خزانہ بھی اسی ضبطِ نفس کے اندر ہے۔ جو اپنے نفس سے شکست کھا جاتا ہے وہ ہر ایک سے مار کھا جاتا ہے۔ برعکس اس کے جو اپنے نفس پر فتح پا جاتا ہے وہ ہر میدان میں شیطان کو زیر رکھتا ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم میں پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسروں کو پچھاڑ لے بلکہ اصلی پہلوان وہ ہے جو اپنے نفس کو پچھاڑ لے!

صحتِ عقلی

حضرات! عقلی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ ماضی و حاضر کے عقلی و فکری اندوختوں سے فائدہ اٹھائیں اور پھر اپنی عقل کو کام میں لا کر اس اندوختہ میں اگر کچھ اضافہ کر سکیں تو اضافہ کریں۔ انسانیت کا اصل خزانہ درحقیقت یہی عقلی و فکری خزانے ہیں۔ اسی کے تحفظ، بقا اور ترقی کے لیے یہ کالج، یونیورسٹیاں، لائبریریاں اور لیبارٹریاں قائم ہیں اور آپ درحقیقت اسی لیے اس جامعہ میں جمع ہوئے ہیں کہ آپ اپنی عقل کو درست کریں۔

عقل انسان کے اندر خدا کا بخشا ہوا نور ہے۔ یہی چیز انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہے۔ دنیا میں ساری بہار اسی کی لائی ہوئی ہے۔ انسانیت کے گلِ سرسبد وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی عقلوں کو استعمال کیا اس لیے کہ آج انسانیت کے اندوختہ میں جو کچھ بھی ہے انہی کا عطیہ ہے۔

ان دانشوروں اور عاقلوں کی کوشش سے ہمارے علوم میں اب اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ کسی ایک انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ ان سب کا احاطہ کر سکے۔ اگر آپ اپنی تمام

توانائیاں صرف کر دیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ کسی ایک فن میں آپ کمال حاصل کر لیں۔ میرے نزدیک آج علم میں ادنیٰ درجہ یہی ہے کہ آپ کسی ایک فن میں کمال حاصل کر لیں اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ اس فن میں درجہ کمال سے آگے بڑھ کر درجہ اجتہاد حاصل کر لیں تاکہ آپ اس فن پر کچھ اضافہ کر کے اپنے بعد والوں کے لیے کوئی علمی وراثت چھوڑ سکیں۔ دنیا ہر لحہ ترقی کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی ہم قدمی کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان اس علمی و عقلی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہ رہیں ورنہ انہیں ہر میدان میں پیچھے رہنا پڑے گا۔

اگر آپ میری اس بات کی اہمیت اچھی طرح سمجھ گئے ہیں تو لازم ہے کہ آپ دو باتوں کا اہتمام کریں۔ ایک اس بات کا کہ آپ اپنے اوقات کا لحہ لحہ اعلیٰ قدر و قیمت رکھنے والی علمی وفنی چیزوں کے مطالعہ پر صرف کریں۔ ادنیٰ درجے کی چیزوں پر اپنا وقت ضائع کرنا اپنے اوپر حرام قرار دے لیں۔ تیسرے درجہ کی چیزیں تو درکنار، دوسرے درجے کی چیزیں بھی آپ کے لیے اضاعتِ وقت کے حکم میں داخل ہیں۔ اس زمانے کے نوجوانوں کو جب میں سرسری، سطحی، عامیانہ اور مزخرف چیزیں پڑھتے دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ناقص اور بے مغز چیزیں پڑھنا فاسد اور مسموم غذا سے زیادہ انسان کے لیے مہلک ہے۔ اس زمانے میں پریس کی سہولت نے جس طرح علوم کے انبار لگا دیے ہیں اسی طرح خرافات کے بھی انبار لگا دیے ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے نوجوان اسی دوسری قسم کے انبار سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ اس پر مزید ستم یہ ہے کہ اس زمانے میں وہ لٹریچر بھی بہت بڑی مقدار میں شائع ہو رہا ہے جو مولانا حالیؒ کے الفاظ میں 'عفونت کے لحاظ سے سنڈاس سے بھی بدتر ہے'۔ اس قسم کی چیزیں کسی قوم کے نوجوان اس زمانے میں پڑھتے ہیں جب اس قوم کی موت کا وقت قریب ہوتا ہے۔ آپ اپنی قوم کے لیے موت کے بجائے زندگی کے پیامبر بنیں۔ اس معاملے میں آپ یورپ اور امریکا کی قوموں کی ریس نہ کریں۔ قومی عروج و زوال کے فلسفہ کی رو سے اب ان قوموں کا دم واپسیں ہے۔

دوسری اس بات کا اہتمام آپ کے لیے ضروری ہے کہ اس فکری و عقلی تربیت کے دور میں آپ اپنے دائرہ کے باہر کے سیاسی معاملات و مسائل میں عملاً کوئی حصہ نہ لیں۔ اس دور میں آپ ان میں عملاً کوئی حصہ لینے کے بجائے ان میں حصہ لینے کی اپنے اندر پختہ قابلیت پیدا کریں۔ کل ساری ذمہ داریاں آپ کے سر پر آنے والی ہیں۔ آپ ہی یونیورسٹیوں اور کالجوں کو سنبھالیں گے۔ آپ ہی اخباروں کے ذمہ دار ہوں گے۔ آپ ہی عدالتوں اور کچہریوں میں ہوں گے۔ آپ ہی قوم کے لیڈر، اسمبلیوں کے ممبر، صوبوں کے گورنر، ملک کے وزیر، ملک کے صدر اور باہر کے ملکوں میں ملک کے نمائندہ اور سفیر ہوں گے۔ اونچی سے اونچی کرسی پر آپ ہی بیٹھیں گے اور ملک و قوم کی باگ آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ ان ذمہ داریوں کے لیے آپ اپنے آپ کو تیار کریں۔ یہ تیاری کوئی آسان کام نہیں ہے کہ آج آپ کو پرائے جھگڑوں میں ٹانگ اڑانے کا موقع مل سکے۔ آپ کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ سیاست میں کوئی حصہ ہی نہ لیں۔ ضرور حصہ لیں لیکن یہ حصہ لینا فکری و نظری نوعیت کا ہو۔ آپ اپنے ملک کے معاملات و مسائل کو اچھی طرح سمجھیں۔ ان کے حل سوچیں اور ان کے لیے اپنے کو تیار کریں لیکن ان میں عملی مداخلت نہ کریں۔ خام کاروں کی مداخلت معاملات کو سنوارتی نہیں بلکہ بگاڑتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ 'بعض لوگ پکنے سے پہلے سڑ جایا کرتے ہیں۔' غالباً ان کا اشارہ ایسے ہی لوگوں کی طرف رہا ہوگا جو قبل از وقت اپنے آپ کو رموزِ مملکت کا ماہر سمجھنے لگتے ہیں اور قوم کے معاملات کو حل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ پکنے سے پہلے سڑنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

ایمانی و اخلاقی صحت

عزیز طلبہ و طالبات! اب میں چند باتیں ایمانی و اخلاقی صحت سے متعلق عرض کروں گا۔

سب سے پہلے اس بات کو یاد رکھیے کہ ایمانی و اخلاقی صحت عقلی صحت سے کوئی علیحدہ

شے نہیں ہے بلکہ یہ اسی کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ جس طرح عقل، انسانیت کا نور ہے اسی طرح ایمان عقل کا نور ہے۔ جس طرح انسان کو حیوان سے ممیز کرنے کے لیے خدا نے عقل عطا فرمائی ہے اسی طرح عقل کو جلا دینے کے لیے خدا نے ایمان کی روشنی عطا فرمائی ہے۔ عقل بڑی نعمت ہے لیکن اس میں یہ نقص بھی ہے کہ وہ بسا اوقات اسی دنیا کی فانی اور محدود لذتوں اور کاوشوں میں گھر کے رہ جاتی ہے جس کے سبب سے وہ ان حقائق کو نہیں دیکھ پاتی جن پر انسانی زندگی کی ابدیت کی بنیادیں ہیں۔ یہ کوتاہی ایک بڑی خطرناک کوتاہی ہے۔ اس کے سبب سے انسان کا زاویہ نگاہ بہت تنگ، اس کے حوصلے بہت پست، اس کی چاہتیں بالکل مادی اور سفلی اور اس کی اخلاقی اقدار بالکل خودغرضانہ اور مفاد پرستانہ ہو کے رہ جاتی ہیں۔

عقل انسانی کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کا نور بھیجا ہے جو دنیا کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے ملا ہے۔ یہ نور عقلِ انسانی کی رہنمائی ابدیت کی منزلوں کی طرف کرتا ہے اور اس کو اس معراج پر پہنچاتا ہے جہاں فرش اور عرش دونوں کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ یہاں انسان اپنی حقیقی قدر و قیمت سے آشنا ہوتا ہے۔ اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ وہ ایک ابدی وجود رکھتا ہے۔ اس کو یہاں مرنے کے بعد پھر جینا بھی ہے۔ اس کے اقوال، اعمال اور عقائد، سب ایک ابدی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے اسے ان کو اسی دنیا کے نفع و ضرر کے محدود پیمانوں سے نہیں ناپنا تولنا چاہیے بلکہ مرنے کے بعد کی زندگی کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ اسے اسی حیاتِ چند روزہ کے لیے نہیں جمع کرنا چاہیے بلکہ اصلی فکر اس حیاتِ ابدی کے لیے ہونی چاہیے جو شروع ہو کر کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔

حضرات! اس وحیٔ الٰہی کا آخری اور کامل صحیفہ قرآن مجید ہے جس کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ اور جس کو لانے والے محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس وجہ سے آپ کو اپنی روحانی و ایمانی صحت کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی

طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ان سے روشنی حاصل کیے بغیر نہ آپ کی عقل اس عالمِ فانی کی تنگنائے سے باہر نکل سکتی نہ آپ کے اخلاق و کردار میں آفاقیت و ابدیت پیدا ہو سکتی۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ آپ صرف دنیا کی قوموں میں سے ایک قوم نہیں ہیں جس کو جغرافیہ کی حد بندیوں نے پیدا کیا ہو۔ بلکہ آپ خلافتِ الٰہی کے وارث، خیرِ امت اور زمین میں خدا کے قانون عدل و قسط کے علم بردار اور گواہ ہیں۔ آپ قوموں کے مقلد یا ان کے حریف نہیں بلکہ اپنے منصب کے لحاظ سے ان کے ہادی و مرشد ہیں۔ آپ کو صرف اپنے ہی لیے نہیں جینا ہے بلکہ اس پوری خدائی کے لیے جینا ہے۔ آپ کی دنیا اسی عالم آب و گل تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک ناپیدا کنار عالم — آخرت کا عالم بھی جڑا ہوا ہے۔ اس وجہ سے وہ محدود نگاہ جو ابھی تک چاند و مریخ تک بھی نہ پہنچ سکی، آپ کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ آپ نے دنیا کو عرش کا بھی سراغ دینا ہے۔ اسی طرح وہ کردار جو نسلی و قومی تعصبات کے خمیر سے پیدا ہوتا ہے، وہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ بلکہ وہ کردار آپ کا حصہ ہے جس پر صفاتِ الٰہی کا عکس اور نورِ محمدی کا جمال ہو!

اسی کتاب و سنت کے تعلق اور فیض سے ہمارے نوجوانوں کے اندر وہ قوت پیدا ہوگی جو علی مرتضیٰؓ کے اندر تھی۔ ہم مسلمانوں میں بوڑھوں کے لیے نمونہ صدیق اکبرؓ ہیں جن کو ذوشیبۃ المسلمین (مسلمانوں کے بڑے بوڑھے) کہا جاتا تھا۔ ادھیڑوں کے لیے مثال فاروق اعظمؓ اور عثمان غنیؓ ہیں۔ دونوں غازی، دونوں فاتح، دونوں شہید اور دونوں خدا کی زمین میں خدا کے قانونِ عدل و قسط اور حکومتِ الٰہیہ کے مظہر! اسی طرح نوجوانوں کے لیے مثال اور نمونہ علی مرتضیٰؓ ہیں! جن کی بابت آپ نے سنا ہوگا کہ **لافتیٰ اِلّا علی لاسیف اِلّا ذوالفقار**۔ اور ہاں عزیز طالبات! آپ بھی سن لیں کہ آپ کے لیے مثال عائشہ صدیقہؓ اور فاطمہ زہراؓ ہیں۔ جن کے علم و عقل کا یہ عالم تھا کہ ان کی روایات اور ان کے اجتہادات پر ہماری فقہ کی بنیادیں استوار ہوئیں اور جن کے زہد و تقویٰ اور طہارت کی شہادت قرآن مجید نے دی۔

عزیز نوجوانو! آپ اپنے اندر یہ فتوّت پیدا کیجیے۔ یہ فتوّت صرف جسمانی بلوغ، خون کے ہیجان، رگ پٹھوں کی قوت اور مرغن غذاؤں سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ ضبط نفس، عقلی صحت اور ایمانی واخلاقی تندرستی سے پیدا ہوتی ہے۔

ہماری قوم کو آج سب سے زیادہ ضرورت اسی چیز کی ہے۔ ہم آج اپنے ملک میں جن چیزوں کی کمی سے دوچار ہیں یہ ساری کمیاں پوری ہو جائیں گی لیکن جو اخلاقی زوال ہمارے ہر طبقے میں عموماً اور نوجوانوں کے طبقے میں خصوصاً نمایاں ہو رہا ہے۔ یہ وہ مرض ہے جو اگر جڑ پکڑ گیا تو اس کا علاج ناممکن ہوگا۔ ہمارا حاضر جیسا کچھ بھی ہے لیکن مستقبل کا انحصار تمام تر آپ کی صلاحیتوں پر ہے۔ میری دعا ہے کہ میری یہ معروضات آپ کے دل میں گھر کریں۔ آپ اپنے فرض کو پہچانیں اور آپ کے روز و شب، آپ کے اشغال ومعمولات اور آپ کے ظاہر و باطن میں وہ تبدیلی نمایاں ہو جو آپ کے دعا گوؤں اور آپ سے امیدیں باندھنے والوں کو ایک روشن مستقبل کی بشارت دے!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اپریل ۱۹۶۷ء)

٦

شخصیات

مقالہ ۳۴

ابو صالح اصلاحیؒ۔۱

۲۰ مئی ۱۹۶۵ء کو، قاہرہ کے قریب، پی، آئی اے کے طیارے کو جو المناک حادثہ پیش آیا وہ یوں تو پورے پاکستان کا ایک المیہ ہے، ہماری پوری قوم کو اس سے صدمہ پہنچا ہے اور میں اس میں قوم کے ساتھ برابر کا شریک ہوں، لیکن میرے لیے یہ حادثہ دہرے رنج وغم کا باعث ہوا ہے اس لیے کہ میرے جوان بیٹے ابو صالح اصلاحی نے بھی اس حادثے میں شہادت پائی۔ میں گوشت پوست کا بنا ہوا ایک کمزور انسان ہوں۔ عام حوادث سے بھی، جن کی خبریں اخباروں میں روز چھپتی رہتی ہیں، بہت زیادہ متاثر ہوتا ہوں، پھر ایک ایسے حادثے کے اثرات سے اپنے دل کو کیسے بچا پاتا جس نے میرے پورے آشیانے کو سوخت کر کے رکھ دیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ دن مجھ پر بہت سخت گزرے ہیں۔ اتنی عمر میں ایسے سخت دن مجھ پر نہیں گزرے تھے۔ اگرچہ حادثہ کی خبر سنتے ہی میں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دیا تھا کہ اے رب! اگر یہ تیرے غضب کا نتیجہ نہیں ہے تو میں تیرے فیصلے پر راضی ہوں۔ تو مجھے صبر و رضا کی توفیق عطا فرما! لیکن اس کے باوجود اس دوران میں میری عقل اور میرے دل میں برابر ایک جنگ برپا رہی ہے اور بارہا میں نے شب کی تنہائیوں میں یہ محسوس کیا ہے کہ میرے جذبات میری عقل پر غالب آ رہے ہیں۔ لیکن اب ان جذبات کا ذکر چھیڑ کر اپنے اور اپنے ہمدردوں کے غم میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر بعض ایسی باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس سلسلے میں رب کریم

کی طرف سے ظہور میں آئی ہیں اور جن سے مجھے اس غم و الم کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سفر میں ابوصالح مرحوم نے عمرہ کی نیت کی تھی اور اس کے لیے وہ تمام ضروری تیاریاں کر کے گھر سے نکلے تھے۔ ان کے اس ارادے کی اطلاع میرے برادر نسبتی چوہدری فضل الرحمان محمود سلمہ کو تو کئی ماہ پہلے سے تھی لیکن سفر سے پہلے پہلے انہوں نے اس کی خوشخبری اپنی امی کو اور ان کی وساطت سے گویا مجھے بھی دے دی تھی۔ میں مئی کے شروع میں زمینداری کے انتظامات کے سلسلے میں اپنے رقبے پر چلا گیا تھا۔ وہاں مجھے یکے بعد دیگرے ایسے کام پیش آتے گئے کہ توقع سے زیادہ دن لگ گئے۔ میری اس غیر معمولی تاخیر سے گھبرا کر میری اہلیہ اور میری چھوٹی لڑکی بھی وہیں پہنچ گئیں۔ حادثہ سے ایک دن پہلے میری اہلیہ نے ذکر کیا کہ ابوصالح مشرق وسطی کے سفر پر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا: یہ کیا نئی بات ہوئی، وہ تو چین، ماچین، امریکا اور انگلستان برابر جاتے ہی رہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: نئی بات یہ ہے کہ اب کے انہوں نے عمرہ کی نیت کی ہے۔ میرے پاس آئے تو کہتے تھے کہ امی! آپ تو مجھے دین سے بے پروا سمجھتی ہیں لیکن میں عمرہ کی نیت کیے ہوئے ہوں، اس سفر سے عمرہ کر کے لوٹوں گا۔ میں دن میں دفتر کے کام کرتا ہوں، رات کو حج کی دعائیں یاد کرتا ہوں۔ حج کے سفر نامے میں نے کئی ایک پڑھ لیے ہیں، اگر کوئی ایسا سفر نامہ آپ نے پڑھا ہو جس میں حج کی روحانیت بیان ہوئی ہو تو وہ مجھے بتایئے، ابا جان سے بھی پوچھیے گا۔ میں نے کہا: ہاں! یہ خبر تو بے شک نئی خبر ہے۔ اس اطلاع سے مجھے فی الواقع بڑی خوشی ہوئی تھی۔

ابوصالح نے اس نوجوانی کی عمر میں اخبار نویسی میں جو ناموری حاصل کر لی تھی اور زندگی کی جدوجہد میں اسے جو کامیابی پر کامیابی حاصل ہو رہی تھی وہ اگر ایک طرف قابل رشک تھی تو دوسری طرف ایک خاص پہلو سے میرے لیے وجہ تشویش بھی تھی۔ میرا دل اندر سے ڈر رہا تھا کہ مبادا! ان کامیابیوں کا نشہ اس کو آخرت سے غافل کر دے۔

چنانچہ میں اس کے لیے برابر دعا کرتا رہتا تھا کہ اے رب! تو نے اس کو دنیا دی ہے تو ہی دین کی راہ بھی اسے سجھا! اس کی امی برابر، جب وہ ہم سے ملنے آتا، نماز کی پابندی کی بحث اس سے ضرور چھیڑتیں۔ میں نے بھی اس سے ایک آدھ بار کہا کہ ابوصالح! تم قابل فخر بیٹے ہو! اگر تم دیندار بن جاؤ تو میں تمہارے جیسے بیٹے پر اپنے رب کا شکر بھی ادا کروں۔ اس میں غفلت ضرور تھی لیکن طبیعت بڑی نصیحت پذیر تھی۔ دین کے لیے اس میں حمیت بھی بہت تھی۔ اب میں اس کی اس غربت کی موت کا خیال کرتا ہوں، ان آگ کے شعلوں کا تصور کرتا ہوں جن میں اس کا جسم اور میرا دل کباب ہوا ہے، ایک حریق اور غریق مومن کے لیے اس شہادت کو یاد کرتا ہوں جس کا ذکر حدیثوں میں ہے اور پھر اس کی عمرہ کی اس نیت کا دھیان کرتا ہوں تو میرا سینہ اس اچھی امید سے لبریز ہو جاتا ہے کہ کیا عجب! رب رحیم و کریم نے اس الھڑ نوجوان کو اپنی جنت میں لے جانے کے لیے یہ مختصر راستہ ہی پسند فرمایا ہو! یہ امید میرے غم کو اتنا کم کر دیتی ہے کہ بعض اوقات تو میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ گویا کوئی حادثہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس غمناک حادثہ پر اتنے اللہ کے بندوں اور بندیوں نے تار، خطوط، بالمشافہ ملاقاتوں اور بالواسطہ پیغاموں کے ذریعے سے میری اور میرے خاندان کی تعزیت کی ہے کہ میں ان کا شمار نہیں کر سکتا۔ ان کی ہمدردیوں میں بڑا اخلاص اور ان کی دعاؤں میں بڑا سوز و درد مجھے محسوس ہوا ہے۔ کتنوں نے غریبوں کو کھانے کھلائے ہیں، کتنوں نے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کی ہے، کتنوں نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ہے اور کتنوں کے خطوط اور ان کی ملاقاتوں سے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے دل اس حادثہ سے مجھ سے بھی زیادہ زخمی ہیں۔ بہتوں نے اطلاع دی ہے کہ ہم اور ہمارے اہل و عیال راتوں کو اٹھ اٹھ کر اور رو رو کر مرحوم کے لیے دعائیں کر رہے ہیں۔ ان میں عوام کے ساتھ ایسے علماء و صلحاء بھی شامل ہیں جن کے علم و تقویٰ کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ میں یہ ہمہ گیر تاثر جب دیکھتا ہوں تو اس کا اہل نہ اپنے آپ کو پاتا ہوں نہ

مرحوم ابوصالح کو! مجھے یہ چیز بالکل خدا ساز نظر آتی ہے۔ رب کریم و کارساز نے جب اپنے ایک بندے کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہا تو اس کی موت کو ایک ایسی شکل دے دی کہ اس کے لیے بے شمار ہاتھ دعا کے واسطے روتی ہوئی آنکھوں اور تڑپتے ہوئے دلوں کے ساتھ خودبخود اٹھ گئے۔ اب میں یہ گمان کس طرح کروں کہ دعا کے لیے جو ہاتھ اس نے خود اٹھوائے ہیں انہیں وہ محروم لوٹائے گا! اس خیال سے میری روح مسرت سے وجد میں آجاتی ہے اور سارا غم والم کافور ہو جاتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ میرے بعض بزرگوں اور ہمدردوں نے اس حادثہ پر مجھے تعزیت کے بجائے مبارکباد کے خطوط لکھے ہیں۔ یہ مبارک باد دینے والے حضرات علم اور تقویٰ دونوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ میں یہ حسن ظن رکھتا ہوں کہ انہوں نے محض مجھے تسلی دینے کے لیے مبارکباد نہیں دی ہے بلکہ ابو صالح کی یہ موت ان کے نزدیک فی الواقع شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔ شہادت کا درجہ ایک بہت بڑا درجہ ہے۔ اگر ابو صالح نے یہ درجہ حاصل کیا تو بہت بڑا درجہ حاصل کیا۔ شہادت کی موت پر ہزاروں زندگیاں قربان! میں تصور بھی نہیں کرتا تھا کہ میرے حقیر خاندان میں کوئی اس درجہ کا سزاوار قرار پائے گا۔ جب میں اس کے اس درجے کا خیال کرتا ہوں، جو یقیناً رب کریم نے محض اپنے فضل سے بخشا، تو میری روح اپنے رب سے سخت شرمسار ہوتی ہے کہ میں نے ابو صالح کی موت کا غم کیوں منایا، اس پر سجدہ شکر کیوں نہ بجا لایا! اللہ تعالیٰ ان تمام دوستوں اور ہمدردوں کو جزائے خیر دے جنہوں نے اس حقیقت کی طرف مجھے توجہ دلائی۔

ایک اور چیز، جو سب سے زیادہ میرے غم کو دور کرنے میں معین ہوئی، وہ میرے ایک دیرینہ رفیق کا خواب ہے۔ میں اگرچہ خواب کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن یہ ایک ایسے شخص کا خواب ہے جس کے خوابوں کے سچے ہونے کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ میں ایک زمانے میں ان کے ساتھ کم و بیش دس ماہ بورسٹل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں گزار چکا ہوں۔ اس زمانے میں انہوں نے پیش آنے والے معاملات سے متعلق نہایت حیرت انگیز

خواب دیکھے اور ان کے سارے خواب سچے ثابت ہوئے۔ انہوں نے ۳۰/۳۱ مئی کی درمیانی رات میں، صبح تقریباً چار بجے، مندرجہ ذیل خواب دیکھا جو خود ان کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

ابو صالح اصلاحی مرحوم، رات کے لباس میں ہلکے رنگ کے بوشرٹ اور پاجامے میں ملبوس ہشاش بشاش نظر آئے۔ کہنے لگے کہ مجھے صرف آدھ گھنٹہ تکلیف رہی۔ اب میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں (یہ بات انہوں نے دو تین دفعہ کہی)۔ میں نے کہا: آپ کے والد مولانا اصلاحی صاحب اس حادثہ کی وجہ سے سخت غمزدہ ہیں۔ کہنے لگے ہاں! ٹھیک ہے، انہیں سخت غم ہے اور کیوں نہ ہو، اب پوری ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آن پڑی ہیں۔

نیز کہنے لگے: آپ میرا (Message) (پیغام جو اوپر نقل ہوا) میرے گھر والوں کو پہنچا دیں۔ میں نے کہا (اور احساس یہ تھا کہ میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں) کہ یہ خواب کی باتیں شاید وہ مانیں یا نہ مانیں، میں جا کر کیا Message دوں گا۔ لیکن انہوں نے باصرار دو تین دفعہ کہا کہ آپ کو اس سے کیا، آپ پیغام دے دیں، وہ مانیں یا نہ مانیں ان کی مرضی!

خواب خاصا لمبا تھا، باتوں کی ترتیب پوری طرح یاد نہیں رہی لیکن گفتگو کے وہ حصے ذہن پر ابھی تک نقش ہیں جو اوپر لکھ دیے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا کہ ان کے تین چار دوست ان کے قریب ادھر ادھر پھر رہے ہیں اور بغیر ڈاڑھی مونچھ کے سفید قمیص اور پتلون میں ملبوس ہیں۔ ان میں سے ایک نے ابو صالح سے پوچھا: بھئی! نماز کا وقت ہو رہا ہے (اس وقت واقعی فجر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا) ہمیں وضو کرنا ہے جگہ تو بتاؤ۔ اس پر ابو صالح نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میرے میز والے کمرے کے ساتھ غسل خانہ ہے، وہاں وضو کر لیں!

اس خواب کی تعبیر تو اربابِ تعبیر بتا سکیں گے لیکن چند باتیں اس کی مجھ پر بالکل واضح ہیں اور وہی میرے لیے موجبِ اطمینان وتسلی ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ خواب دیکھنے والے ایک ایسے صاحب ہیں جن سے اگرچہ ایک مدت سے میرا کوئی ربط ضبط نہیں ہے لیکن وہ واحد شخص ہیں جن کے بارے میں میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ان کے خواب سچے ثابت ہوتے ہیں، اس وجہ سے ان کے واسطہ سے ابو صالح مرحوم کا کوئی پیغام میرے لیے اطمینان کا پہلو رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حادثے کے بعد دو تین دنوں کے اندر اندر میں نے غم کے تمام اسباب کا تجزیہ کر کے ان میں سے اکثر پر قابو پا لیا تھا۔ لیکن ایک سوال میرے لیے برابر سوہانِ روح رہا ہے کہ حادثہ کے وقت اور حادثہ کے بعد ربِ کریم نے ابو صالح کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ رات میں جب یہ سوال میرے ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے تو نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔ میرے دل میں یہ خواہش بھی بار بار پیدا ہوئی کہ کوئی بات میرے سامنے ایسی آئے جس سے میرے دل پر سے یہ پہاڑ ذرا سرکے، خواب ہی میں سہی۔ لیکن میں خود خواب اول تو دیکھتا کم ہوں اور جو دیکھتا ہوں وہ یاد نہیں رہتے۔ اب جب سے یہ خواب علم میں آیا ہے، خیال یہی گزرتا ہے کہ یہ میرے اسی سوال کا جواب ہے اور اگر یہ واقعی میرے سوال کا جواب ہے تو بہت ہی خوب اور نہایت مبارک جواب ہے۔

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست!

خواب میں ابو صالح کے لباسِ شب خوابی کا جو رنگ نمایاں ہوا ہے گھر میں دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کے سلیپنگ سوٹ کا رنگ فی الواقع وہی تھا۔ اسی طرح ان کا وہ کمرا جس میں ان کے کھانے کی میز ہے ان کے صاف ستھرے غسل خانے سے متصل ہے۔ ان چیزوں کا کوئی تصور خواب دیکھنے والے صاحب کو پہلے سے نہیں تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس حادثے نے مجھے اندر سے بالکل ہلا ڈالا تھا لیکن اب میرے رب نے مجھے سنبھال لیا ہے۔ کبھی کبھی تنہائی میں رونے کو اب بھی جی چاہتا ہے لیکن الحمدللہ! اس معاملے میں مجھے اپنے پروردگار سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرا دل بالکل مطمئن ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اسی میں سب کی بہتری ہے — مرحوم کی بھی، اس کے ننھے ننھے بچوں کی بھی، اس کی غمزدہ بیوہ کی بھی، اس کے غمگین ماں باپ اور بھائیوں بہنوں کی بھی! میں اس موقع پر ان تمام مخلصین اور ہمدردوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مرحوم کے لیے دعائیں کی ہیں اور تعزیت کے کلمات سے ہمارے غم میں شرکت کی ہے۔ جن مخلصین نے خطوط لکھے ہیں اگر میرے لیے ممکن ہو سکا تو میں ان کے جواب لکھوں گا اور ان کا شکریہ ادا کروں گا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو مجھے امید ہے کہ یہ مخلصین مجھے معذور سمجھیں گے اور مرحوم کو اور اس کے بچوں کو اپنی دعاؤں میں برابر یاد رکھیں گے۔

اگر ابو صالح کا غم تنہا میرا ہی غم ہوتا تو میں اس کا ذکر ان صفحات میں نہ کرتا بلکہ اس کو اپنے سینے کا راز بنا کر اس کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا۔ لیکن حادثے کی نوعیت نے اس کو ایک قومی غم بنا دیا ہے۔ اب ابو صالح تنہا میرے نہیں تھے بلکہ اپنی پوری قوم کے تھے۔ اس کی صلاحیتیں پوری قوم کا سرمایہ تھیں۔ اس نے زندگی مختصر پائی لیکن شاندار پائی! کہنے کو تو وہ کوہستان سے طلوع ہوا، مشرق میں چمکا، قاہرہ میں غروب ہو گیا لیکن اتنی ہی مدت میں اس کے قلم نے ملک کی صحافت کی تاریخ میں اس کے کام اور نام کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ ۳۶ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے، لیکن اتنی ہی عمر میں اس نے صحافت میں وہ مقام حاصل کیا کہ آج ہماری صحافت کے اساطین و عمائد اس کو جدید دورِ صحافت کے بانیوں کی صف اول میں شمار کرتے ہیں! باپ کی نگاہوں میں بیٹا ہمیشہ بچہ ہی رہتا ہے اور وہ تو ابھی بچہ ہی تھا لیکن اس کے قلم کی پختگی، شگفتگی اور معنی آفرینی پر مجھے بھی سخت حیرانی ہوتی تھی اور میں دل میں کبھی کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ اگر اس لڑکے کو زندگی ملی تو میرا خاندان بھی صحافت اور اردو زبان کی کچھ خدمت کر جائے گا۔ اس کی زندگی کا یہ پہلو اجتماعی نوعیت رکھتا ہے اس وجہ

سے میں نے یہ چند حرف لکھ دیے ہیں اور اگر طبیعت نے ساتھ دیا تو شاید میثاق کے آئندہ شمارے میں اس کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کو بھی روشنی میں لانے کی کوشش کروں جن سے باپ ہونے کے سبب سے میں ہی واقف ہوں۔ عجب نہیں کہ ہونہار نوجوانوں کو ان سے فائدہ پہنچے۔ یہ فائدہ مدِّنظر نہ ہوتا تو، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ایک حرف بھی اس غم کا ظاہر کرنا میں پسند نہ کرتا۔ رونا تنہائی ہی کا اچھا ہوتا ہے۔

اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ جون ۱۹۶۵ء)

ابو صالح اصلاحیؒ ۔۲

میثاق کا یہ شمارہ نہایت پریشانی کے حالات میں مرتب ہوا ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا لکھا گیا ہے اور کیا چھپا ہے۔ تاخیر تو عام حالات میں بھی اس رسالہ کا معمول بن چکی تھی، لیکن اب تو جن حالات و مسائل میں میں گھر گیا ہوں، نہیں کہہ سکتا کہ بے نظمی و بے قاعدگی کے ساتھ بھی یہ پرچہ جاری رہ سکے گا یا نہیں۔ اس دوران میں مجھے نقل مکان کی الجھنوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، اس لیے کہ ابو صالح مرحوم کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے مجھے رحمان پورہ سے منتقل ہو کر فیروز پور روڈ پر آنا پڑا اور اب تک کوئی ایسا مکان حاصل نہیں ہو سکا ہے جس میں ان بچوں کے ساتھ یکجا قیام کی صورت پیدا ہو سکے۔ میثاق کا دفتر بھی ابھی ایک عارضی جگہ پر ڈال دیا گیا ہے۔ ہر چیز الجھی ہوئی ہے اور صرف اللہ ہی کو علم ہے کہ اس الجھاؤ کے سلجھنے کی کوئی شکل نکلے گی یا نہیں!

میں اب ایک عرصے سے تفسیر تدبر قرآن اور حلقۂ تدبر قرآن کے سوا دوسرے تمام کاموں سے تقریباً الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ ذمہ داریاں خواہ گھر کی ہوں یا باہر کی ان سے جی گھبراتا تھا۔ معاش کی مجبوریوں کے سبب سے زمینداری کی تھوڑی سی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی لیکن یہ کام بھی مارے باندھے ہی کرتا تھا۔ لڑکوں نے اپنی ذمہ داریاں خود نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھال لی تھیں اور اب وہ اس قابل تھے کہ مجھے امید تھی کہ

مجھ سے متعلق جو بعض ذمہ داریاں باقی رہ گئی ہیں ان سے وہ مجھ سے زیادہ خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ لیکن ابو صالح مرحوم کی ناگہانی موت نے حالات کا سارا نقشہ ہی بدل دیا۔ اب نہ صرف میری ذمہ داریاں مجھ سے ازسرنو توجہ کا مطالبہ کر رہی ہیں بلکہ مرحوم ابو صالح نے اپنی ذمہ داریاں بھی میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دی ہیں۔ اس نے چھوٹے چھوٹے چھ بچے چھوڑے ہیں جن میں سب سے بڑی بچی کی عمر کل آٹھ سال ہے۔ ان بچوں کی اٹھان ایک خاص نہج پر ہوئی ہے۔ مجھ سے دور رہنے کے سبب سے یہ مجھ سے اچھی طرح مانوس بھی نہیں ہیں۔ ان کے بھولے پن کا یہ عالم ہے کہ میری ایک پوتی جو شکل و شباہت اور مزاج و عادات میں اپنے مرحوم باپ کا کامل نمونہ ہے، ایک شب میں سوتے وقت اپنی نانی اماں سے پوچھ بیٹھی کہ 'اماں! اللہ میاں کس چیز کی فراک پہنتے ہیں؟' انہوں نے جواب دیا کہ 'نور کی!' یہ جواب اس کے حافظے میں محفوظ رہ گیا۔ صبح کو جب وہ اٹھی اور اس کی نانی اس کو نہلا کر اس کی فراک بدلنے لگیں تو وہ مچل گئی کہ میں تو نور کی فراک پہنوں گی! اور نور کی فراک کے لیے ایسی بضد ہوئی کہ سارے گھر کے لیے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے جدید کلامی دلائل کے ساتھ مداخلت کرنی پڑی تب کہیں جا کر یہ نزاع ختم ہوئی۔

مولانا شبلی نعمانی ؒ نے اپنے بھائی مولوی اسحاق مرحوم کا جو دردانگیز مرثیہ لکھا ہے وہ بچپن میں مجھے پورا زبانی یاد تھا اور اس کے جو شعر مجھے خاص طور پر پسند تھے ان میں وہ شعر بھی تھا جس میں مولانا نے مولوی اسحاق مرحوم کے بچوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

یہ شعر میں اکثر نہایت رقت انگیز انداز میں پڑھا کرتا تھا۔ اب یہ راز کھلا کہ یہ شعر مجھے اس درجہ کیوں پسند تھا۔ معلوم ہوا کہ مولانا نے اس شعر میں اپنے ہی درد دل کی کہانی

نہیں سنائی تھی بلکہ اس میں میرا درد دل بھی شامل کر دیا تھا۔ میرا یہ ایک مستقل نظریہ ہے کہ آدمی کو شعر وہی پسند ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے دل کی صدائیں سنتا ہے۔

مجھے اچھی طرح علم ہے کہ آدمی پر ذمہ داریاں خدا ڈالتا ہے اور وہی ان کے اٹھانے کی توفیق و ہمت بھی عطا فرماتا ہے۔ میں جو خوف و ہراس محسوس کر رہا ہوں یہ محض علم کی کمی اور طبیعت کی سہل پسندی کا نتیجہ ہے۔ جو امتحان باقی ہیں وہ ہو کے رہیں گے۔ وہ اس وجہ سے نہیں ملتوی ہو جائیں گے کہ میں امتحان سے گھبراتا ہوں اور کمر کھول کر اب ستانے اور آرام کرنے کا خواہشمند ہو گیا ہوں۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جس سے کسی حال میں مفر نہیں ہے۔ اسی سے بندے کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی اور اس کی کمزوریاں دور ہوتی ہیں۔ آدمی کا بڑھاپا بھی اس کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔ بڑھاپے میں جس طرح جسمانی بیماریاں اور کمزوریاں لاحق ہوتی ہیں اسی طرح عقلی و ایمانی بیماریاں بھی لاحق ہوتی ہیں۔ آدمی جب عصائے پیری کا محتاج ہوتا ہے تو بہت سی غلط چیزوں پر تکیہ کرنے لگتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی توحید کے معاملے میں بڑا غیور ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کا بندہ کسی اور پر اعتماد کرے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس عمر میں آ کر میرے اندر بھی ایک غلط قسم کا اعتماد پیدا ہو چلا تھا۔ اگرچہ میری کوئی ضرورت ابو صالح سے وابستہ نہیں تھی مگر ایک باپ کو اپنے بیٹے پر جو فخر و ناز ہوتا ہے غیر محسوس طور پر وہ میرے اندر بھی تھا۔ اس کی شہرت و ناموری سے میرے دل کو خوشی ہوتی تھی۔ لوگ اس کی تعریفیں کرتے تھے تو میرے خون میں اضافہ ہوتا تھا۔ اس کے بھرے گھر کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوتا تھا۔ میں جب پیار سے یا غصہ سے اس کو بیوقوف کہتا تھا اور وہ مسکرا کر نگاہیں نیچی کر لیتا تھا تو مجھے فخر ہوتا تھا کہ میں ملک کے ایک نامور صاحب قلم اور چوٹی کے صحافی کو بیوقوف کہہ دیتا ہوں اور وہ میرے اس خطاب پر خوش ہوتا ہے — اس طرح غیر محسوس طور پر میں نے ابو صالح کے اعتماد پر اپنے دل کے اندر پندار کا ایک صنم خانہ تعمیر کر لیا تھا۔ قدرت نے ۲۰ مئی ۱۹۶۵ء کی صبح کو اس صنم خانے کو ڈھا دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے اس حادثے سے بڑا غم ہوا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ

اس حادثے کے بعد سے میرے اور میرے پروردگار کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں رہا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا خاتمہ اس حال میں کرے کہ میرا دل اعتماد غیر کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔

مرحوم کے بعض دوستوں کی باصرار یہ خواہش ہے کہ میں اس کے ابتدائی حالات اور اس کے مزاج کی خصوصیات پر ایک مضمون لکھ دوں۔ یہ مضمون میں ان شاء اللہ لکھ دوں گا لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میری کوشش یہ ہے کہ دل پر اس کے تصور کا جو غلبہ ہے وہ کچھ کم ہو تاکہ میں کچھ پڑھنے لکھنے اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہو سکوں۔ میرا یہ گمان نہیں ہے کہ ابو صالح میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔ نہیں! اس میں نقائص بھی تھے لیکن میں اس کے نقائص میں اپنے نقائص کا عکس دیکھتا تھا۔ اس کی امی جب اس طرح کی کسی چیز کی شکایت کرتیں تو میں ان کو جواب دیتا کہ اس چیز کی فکر نہ کرو، یہ چیز اس نے باپ سے وراثت میں پائی ہے۔ جس طرح باپ کے دماغ کو عمر اور تجربے نے درست کر دیا ہے اسی طرح عمر اور تجربہ سے اس کا دماغ بھی درست ہو جائے گا۔ مجھ سے، میرے خاندان کی روایات کے زیر اثر، اس کو ایک حجاب سا رہا لیکن یہ حجاب محض ظاہر کا پردہ تھا، اس پردے کے پیچھے جس طرح وہ میرے دل میں بسا ہوا تھا اسی طرح میں بھی اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ بھائیوں، بہنوں اور عزیزوں سے اسے نہایت گہری محبت تھی۔ اپنی چھوٹی بہن — مریم صدیقہ — کو پیار سے ہمیشہ 'منی!' کہتا تھا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش بلا تاخیر پوری کرتا تھا۔ پچھلے دنوں وہ بیمار ہو گئی تو اس کی تیمار داری اور دیکھ بھال میں اس نے رات دن ایک کر دیے۔ اس کے آپریشن کی نوبت آئی تو لاہور میں جو بہتر سے بہتر انتظام ممکن تھا اس نے وہ کیا۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی — ابو سعد سلمہٗ — بھارت میں ہے اس کے لیے وہ مجھ سے زیادہ فکر مند رہتا تھا۔ اپنے دوسرے چھوٹے بھائی ابو سعید سلمہٗ کو اس نے تعلیم دلائی اور اب اگست ۱۹۶۵ء میں اس کے امریکہ جانے کا پروگرام تھا۔ طبیعت نہایت خوددار، فیاض اور غمگسار پائی تھی۔ اس کے اخلاق سے متعلق نہ صرف یہ کہ کبھی کوئی شکایت

سننے میں نہیں آئی بلکہ اس کے خاص دوستوں نے بقید قسم یہ شہادت دی کہ اس سے زیادہ پاکیزہ نگاہ نوجوان انہوں نے نہیں دیکھا! میں جانتا ہوں کہ یہ چیز اس میں بربنائے تقویٰ نہیں تھی بلکہ محض طبیعت کے ترفع کا نتیجہ تھی لیکن میں مطمئن تھا کہ اس ترفع نے اسے بہت سے فتنوں سے محفوظ رکھا۔ اس ترفع ہی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ معیار زندگی اونچا رکھنے کے باوجود مکان پر نام کی تختی نہیں لگواتے تھے، گھر پر فون نہیں رکھتے تھے، اخبار میں اپنی تصویر نہیں چھپواتے تھے۔ بلکہ تاکید تھی کہ اگر کسی گروپ کے ساتھ ان کی تصویر بھی ہو تو ان کی تصویر کاٹ کر گروپ کی تصویر اخبار میں دی جائے۔ اسی طرح اپنے مخصوص کالم پر — جس کی اخباری دنیا میں بڑی دھوم تھی — کبھی اپنا نام نہیں دیا۔

صحت بہت اچھی تھی، آنکھیں ہمیشہ ہنستی ہوئی رہتی تھیں۔ مطالعہ بہت کرتے تھے اور معلومات بہت وسیع تھیں لیکن مطالعہ اور معلومات کا بوجھ چہرے بشرے سے نمایاں نہیں ہوتا تھا۔ چہرہ ہمیشہ تازہ گلاب کی طرح شگفتہ رہتا۔ تفریحات میں سے صرف احباب کے ساتھ مجلس آرائی سے دلچسپی تھی۔ ان کے اکثر احباب عمر میں ان سے بڑے تھے لیکن مشہور روایت یہی ہے کہ جس مجلس میں ہوتے اپنے حسن بیان، اصابت رائے اور وسعت معلومات کی وجہ سے نمایاں رہتے۔ دل میں دنیا حاصل کرنے کی خواہش تھی لیکن بڑی خودداری اور اصول کے ساتھ! پچھلے دنوں انہیں ایک خاص حلقے کی طرف سے بڑی اہم پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے نہایت بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دی۔ حلقہ ملاقات و تعلقات ہر طبقے میں بہت وسیع تھا لیکن اس سے ذاتی فوائد حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ البتہ اس سے دوسرے ضرورت مندوں کو فائدے پہنچائے۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی کمزوریوں سے درگزر فرمائے اور اس کی نیکیوں کو قبول فرمائے!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ جولائی ۱۹۶۵ء)

مولانا اختر احسن اصلاحیؒ

میں اور مولانا اختر احسن — اصلاحی مرحوم دونوں ایک ہی ساتھ ۱۹۱۴ء میں مدرسۃ الاصلاح — سرائے میر، اعظم گڑھ — کے ابتدائی درجوں میں داخل ہوئے اور مدرسہ کا تعلیمی کورس پورا کر کے ایک ہی ساتھ ۱۹۲۲ء میں فارغ ہوئے۔ اس کے بعد مولانا اختر احسن تو مدرسہ ہی میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوگئے اور میں دو اڑھائی سال اخبارات میں اخبار نویسی کرتا پھرا۔ ۱۹۲۵ء میں استاذ امام مولانا فراہیؒ نے مجھے یہ ایماء فرمایا کہ میں اخبار نویسی کا لاطائل مشغلہ چھوڑ کر ان سے قرآن حکیم پڑھوں۔ میرے لیے اس سے بڑا شرف اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں فوراً تیار ہوگیا اور مولاناؒ نے مدرسہ ہی میں درسِ قرآن کا آغاز فرما دیا جس میں مدرسہ کے دوسرے اساتذہ کے ساتھ مولانا اختر احسن مرحوم بھی شریک ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ پورے پانچ سال قائم رہا۔

طالب علمی کے دور میں تو ہم دونوں کے درمیان ایک قسم کی معاصرانہ چشمک و رقابت رہی — تعلیم کے میدان میں بھی اور کھیل کے میدان میں بھی۔ لیکن مولانا فراہیؒ کے درس میں شریک ہونے کے بعد ہم میں ایسی محبت پیدا ہوگئی کہ اگر میں یہ کہوں تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ ہماری یہ محبت دو حقیقی بھائیوں کی محبت تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے غالباً سال ڈیڑھ سال بڑے رہے ہوں گے۔ انہوں نے اس بڑائی کا حق یوں ادا کیا کہ جن علمی خامیوں کو دور

کرنے میں مجھے ان کی مدد کی ضرورت ہوئی، اس میں انہوں نے نہایت فیاضی سے میری مدد کی۔ بعض فنی چیزوں میں ان کو مجھ پر نہایت نمایاں تفوق حاصل تھا۔ اس طرح کی چیزوں میں ان کی مدد سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ اس پہلو سے اگر میں ان کو اپنا ساتھی ہی نہیں استاذ بھی کہوں تو شاید بے جا نہ ہو۔

مولانا فراہیؒ کے درس میں اگرچہ مدرسہ کے دوسرے اساتذہ بھی شریک ہوتے لیکن میرے واحد ساتھی مولانا اختر احسن ہی تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خاص توجہ بھی ہم ہی دونوں پر رہی۔ مولانا اختر احسن اگرچہ بہت کم سخن آدمی تھے لیکن ذہین اور نہایت نیک مزاج۔ اس وجہ سے ان کو برابر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خاص قرب اور اعتماد حاصل رہا۔ انہوں نے حضرت استاذؒ کے علم کی طرح ان کے عمل کو بھی اپنانے کی کوشش کی، جس کی جھلک ان کی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہوئی اور مجھے ان کی اس خصوصیت پر برابر رشک رہا۔

مولانا اختر احسن کو استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کا بھی شرف حاصل ہوا حالانکہ مولانا کسی کو خدمت کا موقع مشکل ہی سے دیتے تھے۔ یہ شرف ان کو ان کی طبیعت کی انہی خوبیوں کی وجہ سے حاصل ہوا، جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ مدرسۃ الاصلاح کے ذریعہ سے جو تعلیمی اور فکری انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے، اس میں سب سے بڑی رکاوٹ موزوں اشخاص نہ ملنے کے سبب سے تھی۔ مولانا اختر احسن مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت سے اس تعلیمی مقصد کے لیے بہترین آدمی بن گئے تھے۔ اگر ان کو کام کرنے کی فرصت ملی ہوتی تو توقع تھی کہ ان کی تربیت سے مدرسۃ الاصلاح میں نہایت عمدہ صلاحیتوں کے اتنے اشخاص پیدا ہو جاتے جو نہایت وسیع دائرے میں کام کر سکتے۔ لیکن ان کو عمر بہت کم ملی، اور جو ملی اس میں بھی وہ برابر مختلف امراض کے ہدف رہے، تاہم اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا حوصلہ عطا فرمایا تھا۔ اپنی مختصر زندگی میں انہوں نے مدرسۃ الاصلاح کی بڑی خدمت کی۔ اور خاص بات یہ ہے کہ اپنی

اس خدمت کا معاوضہ انہوں نے اتنا کم لیا کہ اس ایثار کی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے مل سکے گی۔

میں نے ۱۹۳۵ء میں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی ترتیب وتہذیب اوراشاعت کے لیے مدرسۃ الاصلاح میں دائرۂ حمیدیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کے زیر اہتمام ایک اردو ماہنامہ 'الاصلاح' کے نام سے جاری کیا تاکہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے افکار سے اردو خواں طبقہ کو بھی آشنا کیا جائے۔ اس ادارے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے عربی مسودات کی ترتیب وتہذیب کا کام مولانا اختر احسن مرحوم نے اپنے ذمہ لیا اور رسالہ کی ترتیب کی ذمہ داری میں نے اٹھائی۔ مولانا اختر احسن مرحوم اگرچہ تحریر وتقریر کے میدان کے آدمی نہیں تھے، لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے ترجمہ کے کام میں انہوں نے میری بڑی مدد فرمائی اور رسالہ میں بھی ان کے مضامین وقتاً فوقتاً نکلتے رہے۔ رسالہ تو کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا لیکن دائرۂ حمیدیہ الحمدللہ! برابر استاذ امام کی عربی تصنیفات کی اشاعت کا کام کر رہا ہے اور اس کے کرتا دھرتا مولانا اختر احسن مرحوم کے تلامذہ ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعی مشکور فرمائے!

مولانا اختر احسن مرحوم پر یہ چند سطریں میں نے مولانا کے ایک شاگرد عزیزی محمد عنایت اللہ سبحانی کے اصرار پر لکھ دی ہیں۔ اگر مجھے استاذ مرحوم کی سیرت لکھنے کی سعادت حاصل ہوتی تو اس میں بسلسلہ تلامذۂ فراہیؒ ان کا ذکر تفصیل سے آتا۔ لیکن اب بظاہر اس طرح کے کسی کام کا موقع میسر آنے کی توقع باقی نہیں رہی۔ اب تو بس یہ آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں استاذ مرحوم کے ساتھ برادر مرحوم کی معیت بھی نصیب کرے!

مولانا محمد علی جوہرؒ

فاضل محترم مولانا رئیس احمد جعفری نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق میں چند تاثرات قلم بند کروں۔ میں اس فرمائش کی تعمیل کے لیے آمادہ تو ہو گیا ہوں لیکن یہ بات مضمون کے پہلے مرحلہ ہی میں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مولانا سے صرف نسبت غائبانہ عقیدت ہی کی حاصل ہے، ان سے ملنے جلنے کے مواقع تو درکنار ان کو دور دور سے دیکھ لینے کی سعادت بھی شاید دو تین بار سے زیادہ مجھے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تحریکِ خلافت کے شباب کے زمانے میں، سن ٹھیک طرح یاد نہیں (غالباً ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں) مولانا مدرسۃ الاصلاح، —— سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ یوپی۔ بھارت —— کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ میں اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں آخری درجوں کا طالب علم تھا۔ اس جلسہ میں مجھے یاد ہے کہ مولانا کا نام سن کر مدرسہ کے وسیع میدان میں بے پناہ خلقت جمع ہوئی۔ مولانا کے ساتھ وقت کے بعض دوسرے اکابرو مشاہیر بھی تشریف لائے میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کسی جلسہ میں بھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے لیکن اس جلسہ میں وہ بھی شریک ہوئے۔ بڑا عظیم اجتماع تھا۔ میں نے اس سے پہلے اس سے بڑا اجتماع کوئی نہیں دیکھا تھا۔ جلسہ کھلے میدان میں تھا۔ ہوا نہایت تند چل رہی تھی۔ اس زمانہ تک لاؤڈ سپیکر کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے اندیشہ تھا کہ مولانا کی تقریر سنی نہ جاسکے گی جس سے جلسہ میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔

لیکن جب مولانا تقریر کے لیے کھڑے ہوتے تو ان کے رعب و دبدبہ نے ہر شخص کو اس طرح مرعوب و مسحور کر لیا کہ جو شخص جس جگہ کھڑا یا بیٹھا تھا وہیں پیکرِ تصویر بن کر رہ گیا! مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بلند اور پرشکوہ آواز ہوا کی تندی اور مجمع کی غیر معمولی وسعت کے باوجود ہر گوشہ میں پہنچنے لگی۔ اور تقریر کے اثر کا عالم یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو رو نہ رہی ہو۔ یہ مجمع بالکل دیہاتیوں کا تھا، اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت تھوڑے سے تھے ان دیہاتیوں کے لیے مولانا محمد علیؒ جیسے شخص کی کسی تقریر کو سمجھنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ لیکن ان کی تقریر میں ایمان و یقین کی ایسی گرمی اور سوز و درد کی ایسی گھلاوٹ تھی کہ اس سے متاثر ہونے کے لیے شاید اس کو زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس موقع کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جو قابلِ ذکر ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر جب ختم ہوگئی تو ہم نے دیکھا کہ مجمع کے ایک کنارے سے ایک بوڑھا دیہاتی اٹھا اور وہ مجمع کو چیرتا پھاڑتا سیدھا سٹیج کی طرف چلا۔ اگرچہ سٹیج تک پہنچنے میں اس کو سخت مزاحمتوں سے سابقہ پیش آیا لیکن وہ اپنی دھن کا ایسا پکا نکلا کہ اس نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا۔ اور پہنچتے ہی ان کی داڑھی پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص لہجہ میں بولا:

محمد علی! جو تو نے کیا وہ کسی سے نہ ہو سکا! یہ کہہ کر جب وہ واپس مڑا تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ 'اس طرح کی داد بھی آپ کے سوا مجھے کسی اور سے نہیں ملی!'

اس موقع پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا ایک اور پہلو میرے سامنے اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے تاثرات سے واضح ہوا۔ اس جلسہ میں تقریر کر کے مولانا محمد علیؒ اعظم گڑھ شہر کے لیے روانہ ہوگئے جہاں شب میں ان کو ایک جلسہ عام میں تقریر کرنی تھی۔ وہ گئے تو ان کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح کا سارا جلسہ بھی چلا گیا، یہاں تک کہ خود مولانا فراہی بھی جو مدرسہ کے ناظم تھے، ان کی تقریر میں شرکت کے لیے ان کے ساتھ چلے گئے۔ انہوں نے

چلتے وقت ہمیں یہ ہدایت کی کہ کچھ کٹے ہوئے کاغذ اور چند اچھی پنسلیں ان کے سامان میں رکھ دی جائیں تاکہ وہ اعظم گڑھ میں ہونے والی مولانا محمد علیؒ کی تقریر نوٹ کر سکیں۔ یہ معاملہ میرے لیے نہایت حیرت انگیز تھا۔ میں اس بات سے تو واقف تھا کہ مولانا فراہیؒ مولانا محمد علیؒ اور مولانا آزادؒ سے محبت کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کی تقریر سے مولانا کا اس درجہ متاثر ہونا کہ وہ خود اس کے نوٹ کرنے کا اہتمام کریں میرے تصور سے مافوق تھا۔ مولانا نہ تو جذباتی آدمی تھے، نہ کوئی سیاسی آدمی۔ وہ ایک محقق، ایک فلسفی اور ایک حکیم تھے۔ وہ، جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، وعظ و تقریر کے جلسوں میں، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، بمشکل ہی سے شریک ہوتے تھے۔ لیکن مولانا محمد علیؒ کی تقریر میں شریک ہونے کے لیے نہ صرف یہ کہ سفر کے لیے آمادہ ہوگئے بلکہ ان کی تقریر کے نوٹ لینے کے لیے یہ اہتمام فرمایا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اس اہتمام نے میرے دل میں مولانا محمد علیؒ کی عظمت بہت بڑھا دی۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علیؒ ایک عظیم سیاسی لیڈر ہی نہیں بلکہ وہ علمی و عقلی اعتبار سے بھی ایسے بلند پایہ آدمی ہیں کہ مولانا فراہیؒ جیسے لوگ بھی ان کی تقریروں کو یہ درجہ دیتے ہیں کہ ان کے نوٹ لیتے ہیں۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مولانا محمد علیؒ کی تقریر میں وہ کیا چیز تھی جس سے استاذ مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے —— دوسری صبح کو جب مولانا فراہیؒ مدرسہ پر واپس آئے تو منتظمین میں سے بعض نے ان سے دبی زبان سے یہ شکایت کی کہ مولانا محمد علیؒ کے ساتھ ان کے چلے جانے کے سبب سے خود مدرسہ کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ مولاناؒ نے اس کا جواب یہ دیا کہ:

'جو کام کی باتیں تھیں، وہ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہہ دی تھیں، اس کے بعد کسی اور تقریر کی اب کیا ضرورت باقی رہی تھی!'

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات اس اعتماد اور یقین کے ساتھ فرمائی کہ ہر شخص پر یہ

بات واضح ہوگئی کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو مدرسہ کے جلسہ کے درہم برہم ہو جانے کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہے۔ ان کے نزدیک سننے کی باتیں وہی تھیں جو مولانا محمد علیؒ نے کہہ دی تھیں اور لوگوں نے وہ سن لی تھیں، اس کے بعد جلسہ کا جاری رہنا، ان کے نزدیک، گویا اضاعتِ وقت کے حکم میں تھا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد متعدد بار مولانا محمد علیؒ کی تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

'محمد علی کی تقریر میں ایمان ہوتا ہے۔'

ایک مرتبہ بطور لطیفہ کے یہ بھی فرمایا کہ:

'چونکہ محمد علی بہت ذہین آدمی ہیں اس وجہ سے لوگوں کو قرآن کے نظم کی طرح ان کی تقریروں اور تحریروں کے نظم کو سمجھنے میں بھی بسا اوقات زحمت پیش آتی ہے!'

پھر فرمایا کہ:

'کچھ اسی قسم کا حال مولانا محمد قاسمؒ کی تقریروں اور تحریروں کا بھی ہے۔'

اگرچہ بڑوں کے اس ذکر کے درمیان اپنا بیان کچھ مناسب نہیں لیکن جن کا کل سرمایہ، زندگی صرف وہ چند چھوٹی بڑی نسبتیں ہی ہوں جو بڑوں سے ان کو حاصل ہوئیں وہ اگر ان کو بیان نہ کریں تو آخر اپنے طرۂ افتخار کی آرائش کے لیے سامان کہاں سے لائیں گے! اس وجہ سے مجھے یہ واقعہ ذکر کرنے کی اجازت دیجیے کہ یہی جلسہ، جس کا اوپر ذکر ہوا، اوّل اوّل مجھے پبلک میں روشناس کرانے کا ذریعہ بنا۔ وہ اس طرح کہ مجھے مدرسہ کی تعلیم و تربیت کا نمونہ دکھانے کے لیے مدرسہ کے ذمہ داروں کی طرف سے اس جلسہ میں ایک تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی۔ چنانچہ میں نے اس میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر میری اپنی ہی تیار کردہ تھی اور اگرچہ کسی پبلک جلسہ میں یہ میری بالکل پہلی تقریر تھی لیکن میری عمر اور علم کے اعتبار سے نہایت کامیاب رہی — مولانا محمد علیؒ اور سٹیج پر بیٹھے ہوئے

دوسرے اکابر نے اس کی بڑی تحسین فرمائی۔ یہاں تک کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھلہ، حسن تقریر اپنے تفسیری رسائل کا ایک سیٹ اپنے دستخط سے مزین فرما کر مجھے بطور انعام عنایت فرمایا۔ اس کے بعد مجھے دور دور سے جلسوں کی شرکت کے لیے دعوت نامے ملنے لگے اور میں کبھی کبھی جلسوں میں شریک بھی ہونے لگا۔ لیکن میں نے یہ لے زیادہ بڑھنے نہیں دی۔ ایک مرتبہ تو انہوں نے مجھ سے یہاں تک فرمایا کہ زیادہ تقریریں کرنے سے آدمی کا دل سیاہ ہو جایا کرتا ہے! ظاہر ہے کہ جس چیز کو وہ اس درجہ ناپسند فرماتے ہوں اس کی طرف زیادہ راغب ہونا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ جولائی ۱۹۶۳ء)

مقالہ ۳۸

علامہ اقبالؒ

علامہ اقبال اپنی قوم کو چھوڑ کر جوارِ رحمتِ الٰہی میں پہنچ گئے۔

ربنا اغفرلنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان.

یہ دور ہمارے عروج و اقبال کا دور نہیں، بدبختی و ادبار کا دور ہے۔ ہم پاتے کم ہیں، کھوتے زیادہ ہیں۔ اونچے درجے کے اشخاص ہم میں اولاً تو پیدا نہیں ہوتے اور اگر دو چار پیدا ہوتے ہیں تو قبل اس کے کہ ان کے جانشین پیدا ہوں، وہ اپنی جگہ خالی چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ اپنی قوم کے ان لوگوں کو گنیے جن کے دم سے آج ہماری آبرو قائم ہے اور پھر دیکھیے کہ ایک ایک کر کے ان کی صف کس طرح ٹوٹتی جا رہی ہے اور کوئی نہیں جو ان کی جگہ لینے کے لیے آگے بڑھے۔ قوموں کے مرنے اور جینے کا ایک اصول ہے جو ہمارے موجودہ فلسفۂ قلت و کثرت سے بالکل مختلف ہے۔ ہم صرف سروں کو گننے کے عادی ہو رہے ہیں حالانکہ زندگی سروں سے نہیں بلکہ دماغوں اور دماغوں سے زیادہ دلوں سے ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

جن لوگوں کے سامنے معاملہ کی یہ حقیقت، اپنی پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہے، کون بتا سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی موت نے ان کے دلوں کا کیا حال کیا! دنیا تقدیر

سے شکوہ سنج ہوتی ہے تو سر پیٹتی ہے، اور دشمن کی چیرہ دستیوں سے چڑتی ہے تو انتقام لیتی ہے، لیکن اقبال کا نوحہ خواں کیا کرے وہ تو صرف خدا ہی سے شکوہ کر سکتا ہے۔
انما اشکوبثی وحزنی الی اللّٰہ!

غالباً ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے۔ استاد مرحوم مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، طلبہ کی مجلس میں اقبال کا شکوہ پڑھ رہے تھے۔ میں اس مجلس میں موجود تھا۔ یہ پہلی مجلس ہے جس میں میں نے شعر کے اثر کو آنکھوں سے دیکھا۔ آنکھوں سے اس لیے کہ اس وقت تک میرے دماغ میں شعر کی خوبیوں اور نزاکتوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ میں مجلس میں بیٹھا ہوا صاف سن رہا تھا کہ اقبال کے شعروں کی صدائے بازگشت در و دیوار سے بلند ہو رہی ہے اور آنکھوں سے علانیہ مشاہدہ کر رہا تھا کہ آسمان سے کوئی چیز برس رہی ہے اور ساری زمین ہل رہی ہے۔ میں نے آج تک کوئی مجلس اتنی پُر اثر نہیں دیکھی اور اس ایک مرتبہ کے علاوہ شاید کبھی میرے دل نے شاعر بننے کی آرزو نہیں کی۔ لیکن یہ آرزو پوری نہیں ہوئی کیونکہ میں نے اقبال بننے کی آرزو کی تھی اور اقبال صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ آج بیس بائیس برس کے بعد اس مجلس کی لذیذ یاد پر رونا بھی آتا ہے اور ہنسی بھی!! ہنسی بچپنے کی اس سادہ لوحی پر کہ شاعر ہونا تو درکنار اقبال کے شعروں کو سمجھنے کی اہلیت بھی پیدا نہیں ہوئی اور رونا اس لیے کہ وہ عظیم الشان ہستی آج اٹھ گئی جو حوصلوں اور ولولوں کو دعوتِ رفعت و سبقت دینے کے لیے ایک نشانِ پرواز اور دماغوں کی رہنمائی و قیادت کے لیے "پہاڑی کا چراغ" تھی۔

شاید وکٹر ہیوگو نے کہا ہے "زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم الشان ہو لیکن تاریخ اپنے فیصلہ کے لیے ہمیشہ موت کا انتظار کرتی ہے"۔ دنیا کے لیے ممکن ہے یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہو۔ لیکن اقبال کے لیے تاریخ نے اپنے اس کلیہ کو توڑ دیا۔ اقبال کی عظمت کی گواہی دلوں نے ان کی زندگی میں دے دی، اب تاریخ کے لیے صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ وہ دلوں کے تاثرات کو محفوظ اور قلم بند کر لے۔

اقبال اس بزم میں یا تو بہت بعد میں آئے تھے، یا بہت پہلے۔ اتنے بعد کہ اہلِ مجلس کے دماغوں اور دلوں میں ان کے خیالات و افکار کے لیے ایک چھوٹے سے نقطے کے برابر بھی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ یا اتنے پہلے کہ جس صبحِ صادق کے وہ منتظر تھے نہ صرف یہ کہ افق میں ابھی اس کی صبحِ کاذب کا کوئی نشان بھی نمودار نہ ہوا تھا۔ بلکہ دنیا پر ابھی نصف شب کی ہولناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اقبال کو اللہ تعالیٰ نے تسخیرِ قلوب و ارواح کے لیے اس نفوذ میں سے ایک حصہ عطا فرمایا تھا، جسے وہ صرف اپنے ان بندوں کو مسلّح فرماتا ہے جو وقت کی فاتحیت کا تاج پہن کر آتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں دنیا نے دیکھا کہ جس شخص کی باتیں اہلِ مجلس کے لیے اتنی بیگانہ تھیں کہ ایک شخص بھی ان کو سمجھنے والا نہ تھا۔ اب اتنی مانوس و محبوب ہو گئی ہیں کہ ہر بزم و انجمن کا افسانہ ہیں اور کوئی دل ایسا نہیں ہے جو اقبال کی عظمت کے آگے جھک نہ گیا ہو۔

اقبال نے جس جرأت کے ساتھ ہمارے علم و عمل کے ایک ایک گوشہ پر تنقید کی اور جس بے خوفی کے ساتھ اپنی دیکھی ہوئی راہوں پر چل پڑنے کی دعوت دی، اس میں پیغمبرانہ عزیمت کی نمود ہے۔ جہاں تک جرح و تنقید کا تعلق ہے، مولانا حالی کی زبان بھی تیغ و سناں سے کم نہ تھی، ان کا تیشہ بھی ہمارے عمل و اعتقاد کے ہر گوشہ کے لیے بے امان تھا۔ وقت کی سوسائٹی جن عناصر سے مرکب تھی ان میں سے ایک ایک کو چن کر حالی نے پکڑا اور قوم کی عدالت میں مجرم ٹھہرا کر ان کو بے دریغ سزا دے دی اپنی بے پناہ قوت سے ہمارے تمام اعمال و معتقدات کو ایک نئی راہ پر لگا دیا۔ لیکن حالی کا کام آسان تھا۔ وہ قوم کو زمانہ کے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اور زمانہ اپنی تمام رعنائیوں اور دلربائیوں کے ساتھ ان کی رفاقت کے لیے آمادہ کار ہو چکا تھا۔ ان کو جو دیواریں ڈھانی تھیں وہ خود متزلزل ہو چکی تھیں اور جو عمارت بنانی تھی اس کے لیے دستِ غیب خود چونہ اور گارا مہیا کر رہا تھا۔ وہ خزاں کی بلبل ضرور تھے مگر

موسم گل کی آمد آمد ان کو شہ بھی دے رہی تھی۔

مگر اقبال — اللہ اکبر! اس کی سطوت و جلالت کا کون اندازہ کر سکتا ہے وہ زمانہ سے جنگ کرنے کے لیے آیا تھا۔

زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز

ان کو جو پیغام دینا تھا، نہ صرف یہ کہ زمانہ اس سے آشنا نہیں رہ گیا تھا بلکہ وقت کی ذہنیت بالکل اس سے مختلف قالب پر ڈھل چکی تھی اور اس کائنات کی تمام قوتیں ہم کو ایک نئی سمت میں کھینچ لے جانے کے لیے نہ صرف پوری طرح طاقتور ہو چکی تھیں بلکہ ہم نصف سے زیادہ منزل اس راہ کی طے بھی کر چکے تھے۔ مگر اقبال تسخیرِ قلوب و ارواح کی ایک غیبی طاقت سے مسلّح ہو کر آیا اور اس نے ہم کو ایک بڑے خطرہ سے بچا لیا اور یقیناً یہ اسی کی برکت ہے کہ ہم جو ہر شکل و ہیئت کو قبول کر لینے کے لیے موم کی طرح نرم ہو چکے تھے، گو چٹان کی طرح سخت نہ ہو چکے ہوں لیکن اتنی صلابت ہم میں ضرور آ چکی ہے کہ ہر انگلی ہم پر تصرف نہیں کر سکتی۔ یہ خودی کا وہی احساس ہے جس کو اقبال نے پوری قوت سے جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی۔

اقبال کے فلسفہ پر غور کرنے والے، اس کا سراغ نٹشے اور برگسان میں لگانا چاہتے ہیں یہ اس لیے کہ ہماری منفعل اور مرعوب ذہنیت تصور بھی نہیں کر سکتی کہ یہ بادۂ تند مشرق کے کسی میکدہ کی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اقبال کے خیالات کا اصلی مصدر قرآن ہے۔ یوں تو اقبال نے کلمہ حکمت جہاں پایا اس کو لیا لیکن اس لیے کہ وہ اپنی چیز تھی۔ ورنہ جو خود کوہ نور کی دولت کا مالک ہو وہ فقیروں کی کوڑیوں پر کیا نگاہ ڈالتا!

اقبال نے تو یہ ننگ تک گوارا نہ کیا کہ قرآنی صداقتوں اور عربی حکمتوں کو زمانہ کا آب و رنگ دے کر خوشنما بنائے۔ وہی پرانا کیسہ اور وہی بے ترشے ہوئے نگینے۔ مگر جب اقبال نے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ان کو پیش کیا تو نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ اقبال کی دنیا ہی

الگ تھی۔ جب سب شفاخانہ حجاز میں زندگی ڈھونڈنے نکلے تو وہ ریگستانِ حجاز میں موت ڈھونڈتا تھا۔ جب مرمریں سلوں اور برقی قمقموں نے حرم کو جگمگا دیا تو اس نے چیخ کر کہا

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

اور بے لوث صداقت کا اعجاز دیکھو کہ ہم جو صرف ڈھلی ہوئی، ترشی ہوئی، ملمع کی ہوئی چیزوں ہی کے دیکھنے کے عادی ہیں۔ اقبال کی یہ سادگی ہم کو بھی دیوانہ بنالیتی ہے اور باوجودیکہ بغیر عقل و منطق کو ساتھ لیے ہم ایک قدم چلنے کے عادی نہیں مگر جب اقبال کوئی بات کہہ دیتے ہیں تو کوئی نہیں جو ان سے دلیل مانگے۔ شاید یہ بات سچ ہے کہ سچائی اگر سچے کی زبان سے نکلے تو وہ اپنی حمایت کے لیے منطق کی محتاج نہیں۔

اقبال اور ان کی شاعری سے قوم کی جو خدمتیں انجام پائی ہیں ان پر غور کرنا مؤرخ کا کام ہے۔ ہم صرف ایک بات کا حوالہ دینا چاہتے ہیں جس کو صرف اقبال ہی نے کیا اور وہی کر سکتے تھے۔

اگر اقبال نہ پیدا ہوتے تو یقیناً ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم ہمارے نوجوانوں کو اس طرح مسخ کر ڈالتی کہ ان کے اندر دین و ملت کے لیے حمیت و غیرت کا کوئی شائبہ باقی نہ رہ جاتا، وہ جس طرح ظاہر میں مسخ ہو گئے ہیں اس سے زیادہ ان کا باطن مسخ ہو جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اقبال کو بھیجا جو معلوم نہیں کس طرح ظلمات کے ان توبرتو پردوں کو چاک کر کے ان کے دلوں میں بیٹھ گئے اور جب تک ان کی روح شعر اس کائنات کے اندر کارفرما ہے اس وقت تک انشاء اللہ ان میں درد کی ایک کسک باقی رہے گی، اگرچہ دلوں کی جگہ سینوں میں پتھر پیدا ہونے لگیں۔

جب مایوسیاں گھیر لیتی تھیں، ہم اقبال کے شعروں میں ایک نشانِ امید دیکھتے تھے جب تاریکیاں چھا لیتی تھیں اقبال ہمارے لیے شعاعِ ہدایت بن کر چمکتے تھے۔ وہ روحوں کو

گرما دیتے تھے، دلوں کو تڑپا دیتے تھے۔ ان کی زبان سے ہم مشرق کے ضمیر کی صدائیں سنتے تھے، ان کی ہندی نغموں میں حجاز کی لے مضطرب تھی۔ وہ زمین کے تھے مگر ان کی پرواز آسمان تک تھی۔ وہ شاعر تھے مگر ان کی شاعری میں علمِ نبوت کی روح کارفرما تھی۔ وہ دنیا داروں کے بھیس میں قلندر اور دیوانوں کے رنگ میں دانائے راز تھے۔ خداوندا! ہمارا یہ شاعر کہاں گیا! اس کی روح پر تیری بے پایاں رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں!!

(ماہنامہ الاصلاح اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۳۸ء)

مقالہ ۳۹

مولانا ابوالکلام آزادؒ

پاکستان و ہندوستان کے متعدد مخلصین نے ہمیں کراچی کے ایک معاصر کے ایک مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے جو معاصر مذکور کی مارچ کی اشاعت میں 'پردہ اٹھنے کے بعد' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ پورا مضمون نہایت ہی توہین آمیز اور حد درجہ دل آزار ہے۔ یہ معاصر مولانا مرحوم کے متعلق اسی قسم کا ایک دل آزار مضمون اس سے پہلے بھی شائع کر چکا ہے۔ مولانا آزاد معاصر مذکور کی نظر میں جیسے کچھ بھی ہوں لیکن اب وہ اپنے رب کے پاس جا پہنچے! وفات پا جانے والوں سے متعلق ہمارے پیغمبر ﷺ کی ہدایت یہ ہے کہ اگر ان کی کچھ بھلائیاں ہمارے علم میں ہوں تو ان کا ذکر کریں، ورنہ کم از کم ان کی لغزشوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں۔ جو لوگ مولانا کے وفات پا چکنے کے بعد ان کا پردہ اٹھانے کی سعی میں سرگرم ہیں ان کے سینے ہمارے نزدیک خوف خدا سے بالکل خالی ہیں۔ وہ اپنے اس رویہ سے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کر رہے ہیں کہ وہ اسی دنیا میں ان کے پردے چاک کرے۔

مولانا آزاد مکہ میں نہیں پیدا ہوئے کھیم کرن میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ کوئی بڑے عالم نہیں تھے، بلکہ مسجد کو رہن رکھنے والے اور بدعتی آدمی تھے۔ سوال یہ ہے کہ ان

تحقیقات سے اقامتِ دین کے اس نصب العین کو کیا تقویت پہنچ رہی ہے جس کے یہ حضرات کل تک علم اٹھائے پھر رہے تھے! مولانا آزاد میں جو بڑائیاں اور خوبیاں تھیں وہ یہ نہیں تھیں کہ وہ بہت بڑے باپ کے بیٹے یا کسی بہت بڑی درسگاہ سے نسبت رکھنے والے تھے بلکہ یہ ساری خوبیاں ان کی ذاتی خوبیاں تھیں اور وہ اتنی شاندار تھیں کہ ان کے بدتر سے بدتر حاسد بھی ان کا انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ مولانا آزاد نے دوسروں کی نسبت سے خود شرف حاصل نہیں کیا بلکہ اپنی نسبت سے دوسروں کو شرف بخشا۔

مولانا کی عربی دانی کی بحث بھی ایک غیر ضروری اور غیر مفید بحث ہے۔ اور اگر یہ بحث کچھ مفید بھی ہے تو بہر حال ان لوگوں کے اٹھانے کی نہیں ہے جو خود عربی، فارسی، انگریزی، ہر چیز سے بے بہرہ ہیں۔

مولانا پر یہ طنز بھی ہمارے نزدیک ابھی قبل از وقت ہے کہ 'بھارت میں گائے کے ذبیحہ کی ممانعت سے لے کر توہین رسول تک کے اندوہناک واقعات رونما ہو گئے مگر حزب اللہ کے موسس امام الاحرار مولانا محی الدین المکنی بابی الکلام الدہلوی دم سادھے بیٹھے رہے!'

مولانا پر یہ طنز اس وقت موزوں رہے گا جب یہ حضرات بھارت کے کفرستان میں نہیں بلکہ پاکستان کے اسلامستان میں، جو سو فی صد مسلمانوں کا ملک ہے اور اسلام ہی کے نام پر حاصل کیا گیا ہے، کچھ کر کے دکھا سکیں۔ ابھی تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ جن حضرات کو اپنے ناخن تدبیر کی جولانیوں پر بڑا ناز تھا، رشتہ میں ایک ہی گرہ پڑ جانے سے، وہ اس طرح چکرا گئے ہیں کہ گرہ کھولنے کے بجائے سر کھجانے میں مصروف ہیں:

اس بے بسی میں یارو، کچھ بن پڑے تو جانیں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

بہر حال مولانا مرحوم کے متعلق اس طرح کی بحثیں جو لوگ چھیڑ رہے ہیں، ان کے

ظرف کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ مولانا آزاد ان حضرات کے نزدیک واقدی کی طرح کذاب ہیں۔ لیکن ان کی یہی ایک خوبی ان حضرات کی تمام خوبیوں پر بھاری ہے کہ ان کی ذات پر جب بھی اس قسم کے شریفانہ حملے کیے گئے تو انہوں نے ان کا نوٹس نہیں لیا، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ اپنے اس قسم کے کرم فرماؤں کے ساتھ ان کی مشکلات میں انہوں نے نہایت اچھا سلوک کیا۔ ان کی طبیعت میں بڑی بلندی تھی اور اس بلندی کی وجہ سے وہ لوگوں کی حاسدانہ باتوں کی کبھی پروا نہیں کرتے تھے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی عظمت و شہرت عطا فرما دی تھی کہ ان کو اپنی شہرت و عظمت کی تعمیر کے لیے دوسروں کی شہرت پر حملہ کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔

مولانا آزاد جیسے لوگوں پر اگر کسی کو بحث کرنی ہو تو ان کے افکار و نظریات پر کرے۔ اس لیے کہ اس طرح کے لوگوں کے افکار و نظریات سے ہزاروں انسانوں کی زندگیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ مولانا آزاد کے بعض افکار و نظریات سے ہمیں بھی اختلاف ہوا ہے اور ہم نے اپنے اس اختلاف کا اپنی تحریروں میں اظہار بھی کیا ہے لیکن اس اختلاف کے باوجود ہماری نظروں میں ان کی عزت و عظمت کبھی کم نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کی ذات پر اس قسم کے 'شریفانہ' حملے کرنے والوں کو توفیق دے کہ یہ اپنے زبان و قلم کی صلاحیتیں کسی مفید مقصد کے لیے استعمال کریں اور دوسروں کا پردہ اٹھانے کے بجائے اپنا پردہ قائم رکھنے کی کوشش کریں!

معاصر موصوف نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ مولانا مرحوم کے سارے تربیت یافتہ ملحد اور بے دین ہیں اور اس سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ مولانا بھی ایک ملحد و بے دین تھے۔ یہ نکتہ اگر صحیح ہے تو کیا یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اسی نکتہ کی روشنی میں ان بزرگوں کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے جن کے فیض تربیت کا یہ مظاہرہ معاصر موصوف نے کیا ہے اور جن کو اپنے صفحات میں وہ ہم رتبہ ابن تیمیہ و شاہ ولی اللہ قرار دیتا رہا ہے!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اپریل ۱۹۶۰ء)

مقالہ ۴۰

حاجی رشید الدین انصاریؒ

مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر۔ اعظم گڑھ — یوپی — بھارت) سے یہ غم انگیز اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مدرسہ کے ناظم جناب حاجی رشید الدین صاحب انصاری ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۹ء کی صبح کو رحلت فرما گئے۔ حاجی صاحب مرحوم، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے حقیقی بھائی تھے۔ مولانا کے انتقال کے بعد انہی نے مدرسہ کی نظامت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور پھر مدرسہ کی خدمت ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ اب اگرچہ کچھ سالوں سے ضعف و پیری کے سبب سے معذور و مجبور ہو گئے تھے، کسی عملی خدمت میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے تھے، لیکن مدرسہ کے ساتھ ان کا قلبی و روحانی تعلق قائم تھا اور یہ تعلق بہت سی برکتوں کا باعث تھا۔

مجھے حاجی صاحب مرحوم کے ساتھ ۱۳/۱۴ سال مدرسہ کی خدمت کا موقع ملا ہے۔ اس پوری مدت کے ذاتی تجربات کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کو نہایت شریف، نہایت کریم النفس، نہایت رقیق القلب، نہایت خدا ترس، نہایت محبت کرنے والا اور لوگوں کے کام آنے والا انسان پایا۔ وہ کسی کو ضرر پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کسی کی تکلیف اور پریشانی کا حال سنتے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اگر کوئی شخص اپنے کسی کام میں مدد کا طالب ہوتا تو خواہ وہ کوئی چھوٹا آدمی ہو یا بڑا، فوراً اس کی مدد کے لیے

اٹھ کھڑے ہوتے اور اس کا کام کر کے بہت خوش ہوتے۔

اپنے بڑے بھائی یعنی مولانا مرحوم سے ان کو محبت عشق کے درجہ تک تھی۔ مولانا مرحوم کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ ان دونوں بھائیوں کی محبت جاننے والوں کے حلقہ میں ضرب المثل رہی ہے۔ مولانا کی زندگی میں یہ اپنی وسیع زمینداری کا انتظام دیکھتے اور مولانا مرحوم اپنے علمی و مذہبی کاموں میں مشغول رہتے۔ مولانا کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ میرے اور رشید کے حال پر سعدی کی وہ حکایت صادق آتی ہے، جس میں انہوں نے دو بھائیوں کا حال لکھا ہے کہ 'دو برادر بودند۔ یکے علم آموخت دیگرے مال اندوخت۔' مولانا مرحوم کے فیض صحبت سے قرآن مجید کی تلاوت سے بڑی گہری دلچسپی ہوگئی تھی۔ روزانہ صبح کو تلاوت بڑے اہتمام سے کرتے اور چونکہ عربی نہیں جانتے تھے اس وجہ سے بہت سے اردو انگریزی ترجمے سامنے رکھ کر قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے۔ غالباً ۱۹۵۱ء یا ۱۹۵۲ء میں مجھ سے آخری ملاقات ہوئی تو چپکے سے میرے کان میں فرمایا کہ 'امین! چند رکعتیں تہجد کی بھی پڑھنے کی توفیق مل جاتی ہے۔' یہ سب مولانا مرحوم سے دلی محبت کا فیضان تھا۔

مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) دلی ہمدردی کا مستحق ہے کہ یکے بعد دیگرے اس کے دو ستون گر گئے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مولانا کے عزیز ترین اور قابل ترین شاگرد اور مدرسہ کے صدر مدرس مولانا اختر احسن صاحب مرحوم نے انتقال فرمایا۔ اور اب اکتوبر ۱۹۵۹ء میں مولانا کے عزیز ترین بھائی اور مدرسہ کے ناظم، جناب حاجی رشید الدین صاحب مرحوم نے رحلت فرمائی۔ یہ دونوں حادثے مدرسہ کے لیے بڑے ہی سخت ہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مرحومین کو جنت نصیب کرے اور مدرسہ کو ان کے نعم البدل عطا فرمائے!

میں اب کن لفظوں میں بتاؤں کہ ان دونوں ہی ہستیوں سے میرے ذاتی تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ دل کی بہت سی باتیں الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتیں اور جو بات ادا نہ ہو سکے

اس کا راز نہفتہ ہی رہنا بہتر ہے۔ بس ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہوں اور اپنے لیے اس بات کی دعا کہ جو فرصت حیات میسر ہے وہ رب کی رضا کے کاموں میں بسر کرنے کی توفیق حاصل ہو!

(ماہنامہ **میثاق** لاہور دسمبر ۱۹۵۹ء)

مقالہ ۴۱

مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ

اخبارات سے یہ معلوم کر کے بڑا صدمہ ہوا کہ جمعیت علمائے ہند کے ناظم، مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہاروی کا انتقال ہوگیا۔ یہ حادثہ مسلمانوں کی پوری قوم کے لیے ایک بڑا اہم حادثہ ہے۔ جو لوگ آج پاکستان کے گوشہ امن و عافیت میں پہنچ کر بھارت کے اپنے چھ کروڑ مسلمان بھائیوں کو دلوں سے نکال بیٹھے ہیں، وہ تو اس حادثے کی اہمیت کا کماحقہ اندازہ نہیں کر سکیں گے لیکن جو لوگ بھارت کے مسلمانوں کو بھولے نہیں ہیں اور انہیں اس مظلومیت کا بھی اندازہ ہے جس میں اس وقت ہمارے یہ بھائی مبتلا ہیں وہ کچھ اندازہ کر سکیں گے کہ مولانا مرحوم کی ذات ان کے لیے، ان کے اس دورِ ابتلاء میں، کتنا بڑا سہارا تھی۔ وہ فی الواقع ایک نڈر اور بہادر مسلمان تھے۔ انہوں نے تقسیم ملک کے بعد کے خطرناک حالات کا نہایت دانش مندی، نہایت بردباری، نہایت صبر و استقلال اور نہایت عزم و حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنی قوم کا حوصلہ قائم رکھنے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ میرا ذاتی تأثر تو یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھارت کے مسلمانوں کی خدمت کی جو توفیق انہیں میسر آئی اس میں کوئی دوسرا مشکل ہی سے ان کے برابر ہو سکے گا۔ انہوں نے ملک کی مشترک جدوجہد آزادی میں جو نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس کی وجہ سے کانگریسی حلقوں پر ان کا خاصا اثر تھا۔ انہوں نے اپنے اس پورے اثر کو بالکل بے لوث اور بالکل بے خوف ہو کر اپنی قوم کی حمایت و مدافعت میں صرف کیا۔ اللہ تعالیٰ

مولانا کی خدمت کو قبول فرمائے، پوری قوم کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے اور بھارت کے مسلمانوں کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے! ایک زمانہ میں مولانا مرحوم کے ساتھ راقم کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ اب یہ تعلقات تو دوری کے سبب سے ختم ہو چکے تھے لیکن اس دور میں مسلمانوں کی جو خدمت وہ کر رہے تھے اس کے سبب سے ان کی محبت اور ان کی قدر و عزت دل میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے! اب یہ دعائے مغفرت ہی واحد سوغات ہے جو اس مجاہدِ ملت کے لیے اتنی دور سے ہم بھیج سکتے ہیں۔ ہم میثاق کے تمام قارئین سے بھی مولانا مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اگست ۱۹۶۲ء)

مولانا محمد یوسفؒ

تبلیغی جماعت کے امیر، مولانا محمد یوسف صاحب نے اسی مہینہ کے شروع میں اچانک لاہور میں انتقال فرمایا۔ وہ حسبِ معمول اپنے سالانہ تبلیغی دورے پر دہلی سے پاکستان تشریف لائے تھے۔ اپنے رائے ونڈ کے اجتماع میں انہوں نے اپنے معمول کے مطابق کئی کئی گھنٹے کی تقریریں کیں۔ ان کے ایک وعظ میں راقم سطور بھی شریک ہوا۔ صحت اور عمر دونوں ہی اعتبار سے ابھی وہ بوڑھوں میں نہیں بلکہ جوانوں کی صف میں شمار کیے جانے کے لائق تھے۔ صحت کی کسی خرابی کا کوئی نشان ظاہر نہیں تھا۔ بعض دوستوں سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ کچھ نزلہ، زکام کی شکایت ہے اور یہ موسمی شکایت ان دنوں لاہور میں عام رہی ہے۔ رائے ونڈ سے لاہور تشریف لائے اور یہاں بھی وہ اپنے مرکز، بلال پارک، میں برابر اپنی دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ جس صبح کو انہوں نے انتقال فرمایا اس سے ایک دن پہلے بھی ان کے وعظ کی اطلاع تھی اور میں اس میں شریک ہونے کا بھی ارادہ رکھتا تھا لیکن محلے میں ایک میت ہو جانے کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔ دوسرے دن اچانک ایک دوست نے فون پر ان کی وفات کی اطلاع دی تو طبیعت کسی طرح اس خبر کی صحت باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی لیکن جب ان کے جنازے میں شریک ہونے کی دعوت ملی تو اس خبر کو واقعہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ ہی باقی نہیں رہا!

مولانا مرحوم کو اپنے مقصدِ زندگی، تبلیغِ دین، سے جو لگاؤ تھا اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی۔ وہ اس معاملے میں اپنے نامور باپ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے سچے جانشین تھے۔ وہ ایک لمحہ بھی اپنے اس مشن سے الگ ہو کر زندگی گزارنا گناہ سمجھتے تھے۔ ان کی تقریروں کے فقرے فقرے سے ان کی طبیعت کا جوش اور عزم ابلتا تھا۔ ان کے وعظ و بیان میں ایسی تاثیر و تسخیر تھی کہ وہ عام آدمیوں کے اندر سے تبلیغ و دعوت کے لیے بے شمار بوڑھوں اور جوانوں کو کھینچ لیتے تھے جو جماعتیں بنا بنا کر اپنے خرچ اور اپنے اہتمام سے اللہ کا کلمہ پہنچانے کے لیے نہ صرف پاکستان و ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں میں بلکہ افریقہ، یورپ، امریکا، آسٹریلیا، چین اور جاپان تک نکل جاتے تھے۔

رائے ونڈ میں تبلیغی جماعت کا جو سالانہ اجتماع ہوتا ہے، میں اس میں ایک دو بار شریک ہوا ہوں۔ اس کے لیے کسی پبلسٹی کا اہتمام میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اخبارات میں نہ اس کے آغاز کی خبر آتی ہے نہ اختتام کی۔ لیکن اس قسم کا کوئی اہتمام نہ ہونے کے باوجود ایک دیہات میں ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے ہیں، جن میں صرف ملک ہی کے ہر حصے کے نمائندے نہیں بلکہ دوسرے ملکوں کے نمائندے اور وفود بھی ہوتے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس میں صرف عوام ہی نہیں ہوتے بلکہ علماء، طلبہ، جدید تعلیم یافتہ، تاجر، کاروباری، ملازمت پیشہ، غرض ہر طبقے کے لوگ ہوتے ہیں اور ان سب کو ایک جنگل میں کھینچ کر جمع کر لینے والی ہستی صرف مولانا مرحوم کی پرکشش ہستی تھی۔ بس ان کا نام سن کر لوگ جمع ہو جاتے تھے اور ان کے وعظوں سے بہتوں کے اندر تبلیغ دین کے لیے اتنی گرمی پیدا ہو جاتی تھی جو سال بھر ان کو متحرک رکھتی تھی۔ ایسی بافیض ہستی کا اچانک ہمارے اندر سے یوں اٹھ جانا دینی نقطۂ نظر سے ایک عظیم سانحہ ہے۔ اس زمانے میں دین کے نام پر کاروبار کرنے والوں کی تو کمی نہیں ہے لیکن بے لوث و بے غرض اور صرف اجرِ آخرت کے لیے کام کرنے والوں کی بڑی کمی ہے۔ مولانا مرحوم دین کے ایک بے غرض و بے لوث خدمت گزار تھے جن کی بے نفسی و بے لوثی کا گہرا اثر دوسروں تک متعدی ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی خدمات کا اجر جزیل بخشے اور ہماری قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے! مولانا علیہ الرحمتہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک تبلیغی جماعت کے کارکنوں کے اندر توکل اور رضا خدمت اور عمل کی جو روح پھونکی ہے، ہمیں امید ہے کہ وہ برابر زندہ رہے گی اور اس الحاد و بے دینی کے دور میں ان کے ذریعے سے اللہ کے دین کی دعوت دنیا کے کونے کونے میں پہنچے گی۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ اپریل ۱۹۶۵ء)

مولانا احمد علی لاہوریؒ، حمید نظامیؒ

پچھلے ماہ میں، دو تین دنوں کے اندر اندر، ہماری قوم کو یکے بعد دیگرے اپنے دو بڑے آدمیوں کی وفات کے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک مولانا احمد علی صاحب، امیر جماعت خدام الدین، دوسرے حمید نظامی صاحب، ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت۔

مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ ہماری قدیم تعلیم و تربیت کی ایک نہایت اعلیٰ یادگار تھے۔ دینی علوم بالخصوص تفسیرِ قرآن میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ شریعت کے ساتھ ساتھ وہ رموز طریقت کے بھی محرم اسرار تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کی زندگی گوشہ نشینی کی زندگی نہیں تھی بلکہ جہاد اور عمل کی زندگی تھی۔ انہوں نے تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف، وعظ و ارشاد، ہر جہت سے اسلام کی خدمت کی اور وفات کے روز تک اسی خدمت میں مصروف رہے۔ حق کے معاملہ میں مداہنت اور مصلحت پرستی کے قائل نہیں تھے۔ اس وجہ سے جوانی اور بڑھاپے دونوں میں قید و بند کے مصائب سے دوچار ہوئے اور مومنانہ عزیمت کے ساتھ ان مصائب کے مقابلہ کی توفیق پائی۔ ان کی زندگی فقر و درویشی کی زندگی تھی اور، جہاں تک ہمیں علم ہے، انہوں نے اسی فقر و درویشی کی وراثت اپنے آل و اولاد کی طرف بھی منتقل فرمائی۔ ہمارے نزدیک کسی شخص کے عالم حقانی ہونے کی یہ ایک ایسی شہادت ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ہزاروں لاکھوں مسلمان

تلمذ یا بیعت کی نسبت رکھتے تھے جن میں امیر و غریب سب ہی قسم کے لوگ تھے لیکن اس مرجعیت اور مقبولیت کے باوجود وہ اس دنیا سے جس شاندار استغناء کے ساتھ دامن جھاڑ کے اٹھے ہیں وہ کم از کم اس دور دنیا پرستی میں بڑی چیز ہے۔ بلکہ میں تو اس کو ایک بے مثال چیز قرار دیتا اگر اس وقت مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ یاد نہ آ گئے ہوتے جو ابھی کل ہی ہم سے رخصت ہوئے ہیں۔ وہ بھی اپنے اندر سطوت تو فاتحوں کی رکھتے تھے لیکن زندگی انہوں نے قلندروں کی طرح گزاری اور اسی قلندرانہ شان کے ساتھ جان جان آفرین کے سپرد کی۔ اللہ تعالیٰ ان مرحومین کی تربت ٹھنڈی رکھے، ان کو اپنی مغفرت سے نوازے اور ان کی خدمتوں اور نیکیوں کا ان کو صلہ عطا فرمائے!

حمید نظامی مرحوم تھے تو نئی تعلیم کے ثمرات میں سے، لیکن ان کا شمار ان لوگوں میں کیا جائے گا جو اس تعلیم کے برے اثرات سے محفوظ رہے اور جنہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے قوم و ملت کو بڑے فائدے پہنچائے۔ ان کی صلاحیتیں تحریکِ پاکستان کے دور میں ابھریں اور اس شان سے ابھریں کہ دیکھتے دیکھتے وہ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے پورے ملک کے ذہنوں اور دماغوں پر چھا گئے۔ انہوں نے سنجیدہ اور بااصول اخبار نویسی کی ایک عمدہ مثال قائم کی اور اس طرح اردو صحافت کی آبرو اتنی بڑھائی کہ جو لوگ اردو اخبارات پڑھنا اپنے لیے کسرِ شان سمجھتے تھے وہ بھی اردو اخبار پڑھنے لگے۔ ان کی صحافتی زندگی ہر قسم کے نشیب و فراز سے گزری لیکن وہ اپنے اصولوں سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔ ایک زمانہ میں ان کے زور و اثر کا یہ عالم تھا کہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ وہ وزارت تو درکنار وزارت گری کے مقام تک پہنچ گئے تھے۔ پھر وہ دور آیا کہ ان کے اور ان کے اخبار کے لیے ہر لمحہ خطرہ ہی خطرہ نظر آتا تھا۔ لیکن ان کی سنجیدگی اور توازن اور ان کی جرأت میں کوئی فرق نہ اس حالت سے آیا نہ اس دوسری حالت سے! خود مارشل لاء کے دور میں بھی انہوں نے ملک کے حکمرانوں کو جس اخلاص اور جس جرأت کے ساتھ مشورے دیے ہیں اور جس صاف گوئی کے ساتھ قابلِ تنقید چیزوں پر تنقیدیں کی ہیں اس

کی قدر اسلام اور جمہوریت کا ہر قدر دان کرے گا اور ہمیشہ کرے گا۔ وہ اس معاملہ میں اسلام اور جمہوریت کے تمام مدعیوں پر بازی لے گئے اور نہایت شاندار بازی لے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی ان نیکیوں کو قبول فرمائے اور ہمارے ملک کی صحافت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے!

ان مرحومین کا ذکر کرتے ہوئے وہ بات مجھے پھر یاد آ رہی ہے جو ان صفحات میں بار بار لکھ چکا ہوں۔ یعنی یہ کہ اچھے اچھے لوگ ہمارے اندر سے یکے بعد دیگرے اٹھتے تو چلے جا رہے ہیں لیکن ان کی جگہیں لینے والے نہیں پیدا ہو رہے ہیں۔ نہ دین کے محاذ کے لیے نہ دنیا کے محاذ کے لیے! علم، عمل، اخلاق، کردار، صلاحیت، ہر چیز روز بروز زوال پذیر ہے۔ اور اس زوال کو روکنے اور تھامنے کے لیے کوئی تدبیر قوم کے ذمہ داروں کی طرف سے نہیں ہو رہی ہے۔ بلکہ ہمیں تو یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ اس وقت جو تدبیریں عمل میں لائی جا رہی ہیں وہ اس زوال کی رفتار کو تیز تر کرنے والی ہیں۔ قوموں کے اندر اچھے اشخاص جنگل کے خودرو درختوں کی طرح نہیں پیدا ہوتے بلکہ اعلیٰ تعلیم و تربیت، اچھے ماحول اور قابلِ تقلید مثالوں کی رہنمائی سے پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے قوم کے اربابِ حل و عقد کو بڑی فکریں کرنی پڑتی ہیں اور بڑے اسباب و وسائل فراہم کرنے پڑتے ہیں تب جا کر کہیں اس کا امکان ہوتا ہے کہ قوم کو برابر ایسے اشخاص ملتے رہیں کہ جن کے ہاتھوں میں اس کے مستقبل کے محفوظ ہونے کی توقع کی جا سکے۔

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ مارچ ۱۹۶۲ء)

مقالہ ۴۴

مولوی تمیز الدین خانؒ

مولوی تمیزالدین خان صاحب مرحوم سے ہمیں شخصاً ملنے کا تو کبھی موقع نہیں ملا لیکن ان کے غیر معمولی اوصاف کی وجہ سے ان کے لیے ہمارے دل میں ہمیشہ بڑا احترام رہا۔ ہمارے ملک کے صفِ اوّل کے لیڈروں میں وہ واحد شخص تھے جو عملاً، قولاً، صورتاً ہر اعتبار سے مسلمان تھے۔ اپنے عقائد اور مسلک کے لحاظ سے بھی جہاں تک ہمیں علم ہے وہ نہایت صحیح العقیدہ، شرک و بدعت کے تمام شوائب سے بالکل پاک تھے۔ بڑوں میں، خصوصاً چوٹی کے بڑوں میں، ہماری مشرقی تہذیب و روایات کی نمائندگی تو بس سمجھیے کہ تنہا انہی کے دم سے تھی۔ پھر اس اسلامیت و مشرقیت کے ساتھ ساتھ وہ موجودہ زمانے کے دساتیر و قوانین کے رموز و نکات سمجھنے کے معاملہ میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے بحیثیت سپیکر جس قابلیت، جس وقار اور جس فرض شناسی کے ساتھ قومی اسمبلی کی رہنمائی کی ہے وہ ہماری پوری پارلیمانی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن باب ہے۔ ہماری قومی اسمبلی کا جو کچھ حال رہا ہے اور جو کچھ ہے، ملکی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف مولوی تمیزالدین خان صاحب مرحوم کا کمال تھا کہ انہوں نے کسی نہ کسی حد تک اس کا بھرم قائم رکھا۔ ان کو پاکستان کے دونوں بازوؤں میں جو غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل تھی اس میں بلا استثناء کوئی شخص بھی ان کا شریک و سہیم نہیں تھا۔ سیاست کے خارزار میں الجھے رہنے کے باوجود انہوں نے ایک باہمہ و بے ہمہ زندگی کی ایک نہایت اعلیٰ مثال

قائم کی۔ صوبائی اور علاقائی تعصب کی وبا، جس میں ہمارے اہل سیاست اس وقت عام طور پر مبتلا ہیں، مولوی صاحب مرحوم اس سے بالکل محفوظ تھے۔ وہ قومی و ملکی معاملات کو ایک پاکستانی محب وطن کے نقطہ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسمبلی کے سپیکر کی حیثیت سے رواداری اور غیر جانبداری کی جو مثال انہوں نے قائم کی وہ ان کے جانشینوں کے لیے ایک روشن مثال ہے، کاش! وہ اس کی تقلید کر سکیں! ہمارے موجودہ دستور کے رُو سے سپیکر کا عہدہ صدر کے عہدہ کے بعد سب سے بڑا عہدہ ہے بلکہ بعض اعتبارات سے اس کو عہدہ صدارت کے ہم پایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس عہدہ پر پہنچنے کے بعد بھی جس شخص کی وضع قطع، معمولات، روایات اور نظریات میں کوئی ادنیٰ تغیر بھی رونما نہ ہو سکا اس کے ایک صاحب کردار شخص ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے؟ ہماری قوم کے پاس سب کچھ موجود ہے لیکن اعلیٰ کردار کے اشخاص کی بڑی کمی ہے۔ بالخصوص ہماری سیاست کا میدان تو باوقار اور اعلیٰ سیرت و کردار کے اشخاص سے بالکل ہی خالی ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولوی صاحب مرحوم کی قبر ٹھنڈی رکھے اور ہماری قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ ستمبر ۱۹۶۳ء)

علامہ عنایت اللہ خان مشرقیؒ

علامہ عنایت اللہ خان مشرقی رحمۃ اللہ علیہ ہماری قوم کے اندر ایک منفرد سیرت و کردار کے لیڈر تھے۔ اگرچہ ہمیں کبھی ان کے نظریات سے پورا پورا اتفاق نہ ہو سکا لیکن اس امر میں ہمیں کبھی شک نہیں ہوا کہ اپنی قوم کی سربلندی کے لیے ان کے دل کے اندر بڑا غیر معمولی جوش و جذبہ تھا۔ وہ اسلام اور غلبہ کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے اس وجہ سے اس دور میں مسلمانوں کی بے بسی پر ان کا دل بہت کڑھتا تھا۔ انہوں نے اس حیرت انگیز تضاد سے بڑا گہرا تاثر لیا کہ مسلمان قومیں اسلام کی مدعی ہیں لیکن دنیا میں ذلیل و خوار ہیں اور مغربی قومیں اسلام کی منکر ہیں لیکن نہ صرف مشرق کی غیر مسلم قوموں پر بلکہ خود مسلمانوں پر بھی حاوی اور غالب ہیں۔ جب انہوں نے اس صورتِ حال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تو ان کی نظر اس بات کی طرف گئی کہ ہم مسلمان صرف اسلام کی چند روایات کے پرستار بن کر رہ گئے ہیں اور اسلام کا اصلی کردار دنیا کی غالب قوموں نے اپنا رکھا ہے۔ ان غالب قوموں کے کردار میں سب سے زیادہ ابھری ہوئی چیز جو ان کو نظر آئی وہ ان کا عسکری جوش و جذبہ اور ان کی فوجی تنظیم تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یورپ اور ایشیا کے متعدد ملکوں میں عسکری تحریکیں بڑے زور و شور سے اٹھیں اور ستم رسیدہ ممالک کے حساس لوگوں کو ان تحریکوں نے اپیل کیا۔ علامہ مشرقی مرحوم بھی ایک نہایت حوصلہ مند انسان تھے۔ انہوں نے بھی وقت کے حالات سے بڑا گہرا اثر لیا اور اپنی قوم کے اندر عسکری تنظیم کا صور اس

زور سے پھونکا کہ فی الواقع ان کی تحریک نے پورے ملک میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں ایک خاص قسم کا زور تھا جو عسکری جوش و جذبہ رکھنے والے بوڑھوں اور جوانوں پر جادو کا اثر کرتا تھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے علماء کے سوا ہر طبقہ کو متاثر کیا۔ ان میں عسکری تنظیم کی حیرت انگیز قابلیت تھی۔ چنانچہ انہوں نے عملاً خاکساروں کا ایک لشکر تیار کر دیا۔ اس حقیقت کا کوئی مشکل ہی سے انکار کر سکے گا کہ ان کے ماننے والے ان کے فدائی تھے اور وہ اطاعت مطلق کے حد تک ان کی اطاعت کرتے تھے۔ اسلام کو ایک پرقوت سیاسی نظام کی حیثیت سے پیش کرنے میں بھی ان کا ایک خاص مقام ہے۔ وہ تمام سیاسی اصطلاحیں جو آج بہت سے لوگ اسلام کا سابقہ و لاحقہ بنائے ہوئے ہیں، انہی کی اوّلیات میں سے ہیں! ہمیں، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، علامہ مرحوم کے نظریات نے کبھی اپیل نہیں کیا لیکن ہم نے ان کو ہمیشہ اپنی دُھن کا پکا سمجھا۔ وہ ریاضی میں اتنی اونچی ڈگری رکھتے تھے کہ اپنے ملک میں بھی اور اپنے ملک سے باہر بھی اس کی بڑی قیمت وصول کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ساری زندگی ایک دوسرے ہی عشق میں گزار دی۔ کونسلوں اور اسمبلیوں کی ممبری اور وزارت و صدارت کے چکر میں بھی وہ کبھی نہیں پھنسے۔ حالانکہ اس میدان میں اترتے تو ان کے لیے بڑے امکانات تھے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کی سربلندی کے لیے جس چیز کو اپنا نصب العین قرار دے لیا تھا، اس سے انہیں کوئی چیز منحرف نہیں کر سکی۔ اپنی تحریک میں وہ کامیاب ہوئے یا نہیں لیکن اپنی تحریک کے ساتھ وفاداری میں وہ سو فی صد کامیاب رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ ستمبر ۱۹۶۳ء)

حسین شہید سہروردیؒ، مولانا داؤد غزنویؒ

قوم ابھی حسین شہید سہروردیؒ کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئی تھی کہ ملک کے نامور عالم، مولانا سید داؤد غزنویؒ نے بھی انتقال فرمایا۔ یہ دونوں حادثے سیاسی اور مذہبی اعتبار سے ہماری پوری قوم کے لیے بڑے ہی اہم ہیں۔ حسین شہید سہروردی ہماری قوم کے بڑے پختہ کار، ذہین اور جری لیڈر تھے۔ اس ملک میں جمہوریت کے نصب العین کے لیے جو کوشش انہوں نے کی اور جس عزم و ہمت کے ساتھ حمایت کی، جمہوریت کے قدر دان اس کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ہماری قوم میں صحیح معنوں میں عوامی لیڈر اب وہی اکیلے رہ گئے تھے۔ اب اگرچہ حالات نے ان کو کچھ عرصہ سے عملاً ملکی معاملات سے بہت کچھ الگ کر دیا تھا تاہم اس علیحدگی میں بھی وہ بہتوں کے لیے مرجع امید و اعتماد تھے۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد اب ہماری قوم میں ان کے درجے کا کوئی عوامی لیڈر باقی نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے!

مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ایک جید عالم دین ہونے کے ساتھ ایک نامور خانوادۂ علمی و دینی کی نہایت شاندار روایات کے حامل تھے۔ ان کی شخصیت بڑی جاذب و پرکشش تھی۔ علماء کے طبقہ میں جو چند اشخاص دین اور دنیا دونوں پر نگاہ رکھنے والے تھے، ان میں ان کو ایک امتیاز کا درجہ حاصل تھا۔ ان کے ظرف اور ان کی نگاہ دونوں میں بڑی وسعت

تھی۔ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں میں اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کے ہمیشہ وہ دل سے خواہاں رہے اور اس سلسلہ کی تمام مساعی میں ہر شخص کی نظر سب سے پہلے علماء کے طبقہ میں انہی کی طرف اٹھتی تھی۔ وہ شروع سے ایک عملی انسان تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں میں جو قومی و مذہبی تحریکیں اٹھیں ان میں وہ پوری سرگرمی کے ساتھ شریک ہوئے اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ جمعیت اہلِ حدیث کے لیے ان کی حیثیت روحِ رواں کی تھی۔ اپنی بھاری بھرکم شخصیت سے انہوں نے ایک بہت بڑے خلا کو بھر رکھا تھا جو اب ان کی وفات کے بعد پھر بشکل خلا ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان کے اعزا کو صبرِ جمیل سے نوازے اور ہماری قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ دسمبر ۱۹۶۳ء)

پنڈت جواہر لال نہرو

ماضی قریب میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان میں بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی موت ایک عظیم حادثہ ہے۔ اگرچہ وہ خدا اور مذہب کے منکر تھے لیکن اپنی قوم اور اپنے وطن کے سچے پرستار تھے اور اس معاملے میں وہ وفاداری اور پختہ زناری کی مثال قائم کر گئے۔ دنیا میں وزیر اعظم بہت گزرے ہیں اور بہت گزریں گے لیکن بھارت جیسے وسیع الاطراف اور مختلف الاقوام ملک میں ہر دل عزیزی کا جو مقام جواہر لال کو حاصل ہوا اس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے طویل دور حکومت میں اپنی قوم کے جسموں ہی پر نہیں بلکہ ان کے دلوں پر بھی حکومت کی ہے اور حکومت درحقیقت وہی ہے جو دلوں پر ہو!

پنڈت جی کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام اقتدار آئی ہے ہماری دلی آرزو ہے کہ وہ پنڈت جی کے ناتمام کاموں کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔ پنڈت جی جمہوریت کے بڑے دلدادہ تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ لیکن جمہوریت کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ جب تک اس کی پشت پر نہایت مضبوط اور ہر دل عزیز عوامی لیڈر نہ ہو اس کی حفاظت ناممکن ہے۔ جواہر لال کے بعد اب یہ چیز بھارت کو حاصل نہیں رہی۔ اس مسئلہ پر اب اس کے لیڈروں کو سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا، ورنہ جمہوریت کا مستقبل اب

اس ملک میں خطرناک اندیشوں سے دوچار ہے۔ اور اس کے جو بدل متوقع ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا جا سکے۔

پنڈت جی سیکولرزم کے بھی بڑے دلدادہ رہے۔ لیکن اس میں ان کو شدید ناکامی سے سابقہ پیش آیا۔ رجعت پسند عناصر نے اس سلسلے کی ان کی تمام مساعی کو ناکام بنا دیا اور پنڈت جی ان کے مقابل میں وہ زور نہ دکھا سکے جس کی ان سے امید تھی۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں ہمیں ان سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کے وجوہ سے بحث نہیں۔ وجوہ جو کچھ بھی ہوں بہرحال ہم یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے دور اقتدار میں مسلمانوں کا اس طرح شہر شہر میں قتل عام ہوگا جس طرح ہوا اور پنڈت جی اس کو اس طرح ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیں گے جس طرح انہوں نے برداشت کر لیا۔ ہمیں ان سے گاندھی جی کی جرأت کی امید تو نہیں تھی لیکن اس کمزوری کی بھی امید نہیں تھی جو ان سے ظاہر ہوئی۔ اگر وہ اپنے دور اقتدار میں صرف حکومت کے کارندوں اور اپنی پولیس ہی کو سیکولر ذہن کا بنانے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو بھارت میں مسلمان خود اپنی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور اس طرح کے واقعات ہرگز نہ پیش آتے جن کو دیکھ کر بھارت کے مسلمان تو درکنار خود انسان کے مستقبل کی طرف سے مایوسی ہو جاتی ہے۔

پنڈت جی کے جانشینوں سے ہمیں امید ہے کہ وہ اس مسئلہ میں پنڈت جی کی نہیں بلکہ مہاتما گاندھی جی کی پیروی کریں گے اور سر دے کر اپنے ملک کے ناموس کو وحشیوں اور درندوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو یہ رائے رکھتے ہوں کہ جو کام پنڈت جواہر لال نہرو سے نہ ہو سکا وہ لال بہادر شاستری کیا کر سکیں گے۔ کر سکنے اور نہ کر سکنے کا سوال نہیں ہے۔ سوال صرف کرنے کے سچے اور پکے ارادے کا ہے۔ ہمیں تو اگر یہ نظر آ جائے کہ بھارت میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو انسانی اقدار گاندھی جی کی طرح عزیز ہیں تو ہمارے اطمینان کے لیے یہ بس ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کی جان بازیوں کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔

کشمیر کے مسئلہ میں بھی پنڈت جی کی روش ہمارے لیے نہایت حیران کن رہی۔ اس مسئلہ میں انہوں نے حیرت انگیز پریشان خیالی بلکہ نہایت مایوس کن ضد کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے ان کے اور ان کے ملک کے وقار کو بڑا نقصان پہنچا۔ لیکن اب زندگی کے آخری ایام میں غالباً ان پر خاص اس معاملے میں جذباتیت کی جگہ حقیقت پسندی غالب آ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے انہوں نے شیخ عبداللہ کو رہا کر کے اس کے طے کرنے کی راہ کھولی۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اب وہ اس دنیا پر نہیں رہے لیکن ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اس سے اس معاملے کے طے ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی بلکہ شاید اس کے لیے زیادہ سازگار فضا پیدا ہو گئی ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ اندازہ صحیح نکلے اور بھارت اور پاکستان کے لیڈر اور شیخ عبداللہ اس قضیے کو طے کرنے میں کامیاب ہو جائیں! اسی قضیہ کے طے ہونے پر پاکستان اور بھارت کی دوستی کا انحصار ہے اور اسی دوستی پر دونوں کی ترقی کا دارومدار ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ صدر ایوب اور بھارت کے وزیراعظم لال بہادر شاستری دونوں اس دوستی کی قدر و قیمت سمجھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان دونوں لیڈروں کے ذریعہ سے پاکستان اور بھارت کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا اور شیخ عبداللہ اس دور کے فاتح باب قرار پائیں گے!

(ماہنامہ میثاق لاہور۔ جولائی ۱۹۶۴ء)